زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... اُردو مرثیے میں حمد، نعت، منقبت ......

قیصر نجفی نے مرثیے کو ایک ادبی توانائی کی حرارت سے اپنے نشو ونما کے سفر پر دیکھا ہے۔ وہ محض دینی ضرورتوں کو پیش نظر نہیں رکھتے اور نہ ہی انہوں نے ایک مقیّد، محدود اور غیر مربوط مذہبی ذہن کے ساتھ اس صنف سخن کا مطالعہ کیا۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ مرثیے کے وسیع دامن خیال میں حمد، نعت اور منقبت کیسے سمائی ہوئی ہے تو پھر ان کا تنقیدی اظہار بھی ایک تخلیقی نثر کی طرح فقروں کے زندہ مرقعے بناتا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ قیصر نجفی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، ان کی باتیں سنی ہیں، ان سے کلام کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے یہاں رثائی اصناف سے لگاؤ محض تحقیقی ہی نہیں بلکہ تخلیقی ارتباط و اختلاط کا آئینہ دار ہے۔ وہ خود بھی اردو اور سرائیکی زبان میں مرثیے کے بہت اچھے شاعر ہیں وہ جانتے ہیں کہ شعر کی تخلیق میں کس کرب سے گزرنا ہوتا ہے اور یوں وہ فن پارے کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں کم ہی چوکتے ہیں۔ ہمیں ان کے اس کام اور اس کتاب کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ......ڈاکٹر ہلال نقوی

ایک سو بائیس صفحات پر مشتمل یہ عمدہ کتاب دوصد روپے کے عوض قصویٰ آرٹ،، کراچی سے دستیاب ہے۔

...... مصوّر تذکرے ......

محققین کے مطابق اردو کا پہلا تذکرہ مرزا لطف علی کا ''گلشنِ ہند'' مانا جاتا ہے۔ دراصل تذکرہ اور بیاض یادداشت قسم کی چیز رہی ہیں اور ان میں زیادہ تر توجہ شعرا کی شاعری، ان کے نجی اور خاندانی حالات پر دی گئی ہے۔ گذشتہ دو ڈھائی سو سال میں متعدد تذکرے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ تاہم اس طویل مدت میں جن اہم تذکروں کا ذکر نمایاں ہے ان میں اٹھارویں صدی میں میر تقی میرؔ ''نکات الشعراء'' قائم چاند پوری کا ''مخزنِ نکات''، فتح علی حسینی کا ''تذکرہ ریختہ گویاں'' لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا ''چمنستانِ شعراء'' وجیہہ الدین عشق کا ''تذکرہ عشق'' غلام حسین شورش کا ''تذکرہ شورش'' ابوالحسن امر اللہ الہ آبادی کا ''تذکرہ مسرت افزا'' قدرت اللہ شوق رامپوری کا ''طبقات الشعرا'' مردان علی خان مبتلا کا ''گلشنِ سخن''، نواب علی ابراہیم خان خلیلؔ کا ''گلزار ابراہیم'' قابل ذکر ہیں۔ ''مصوّر تذکرے'' برسوں کی محنت، لگن قومی کونسل برائے فروغ اردو کا مالی تعاون اور برادرِ محترم فاروق ارگلی کے مخلصانہ مشوروں اور مدد کا آئینہ دار ہے جس میں ترانوے اہل قلم کے کوائف، کلام اور حالاتِ زندگی کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ ''مصوّر تذکرے'' دیکھ اور پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ بقول غلام ربّانی تاباںؔ:

زندگی درد سہی، درد میں لذت تو ملی　　　　سر کو سودا تو ملا، دل کو جراحت تو ملی

...... نند کشور وکرم

عمدہ کاغذ، صفحات ۴۰۷، مجلد، قیمت تین سو ستاسٹھ روپے ہندوستانی، F-14/21-D، کرشن نگر، دہلی سے دستیاب ہے۔

...... موسم بدل رہا ہے ......

ماہرؔ اجمیری کی شاعری روایت پسندی کی پابند ہونے کے باوجود عصری جھروکوں سے باہر دیکھتی ہوئی لگتی ہے۔ اُن کے یہاں مٹتی ہوئی وضع داری اور بکھرتی ہوئی قدروں کا نوحہ بھی ہے اور گرتی ہوئی دیواروں اور اُجڑتی ہوئی بستیوں کا المیہ بھی۔ مگر وہ اس کے ساتھ نسلِ نو کے قابلِ قدر آئینِ نو کی ان دفعات کی پاس داری بھی کرتے ہیں جو قدیم وجدید کی خلیجوں کے درمیان پُل بنا رہی ہیں۔ آگے بڑھنا سکھا رہی ہیں، گویا:

پیار کی شکل تو ہر شکل میں پیاری ہوگی　　　　چاہے یہ شکل کسی شکل میں ڈھالی جائے

...... انوار احمد زئی

دوسو اٹھاسی صفحات کا یہ خوبصورت شعری مجموعہ مبلغ تین صد روپے کے عوض محمد پبلی کیشنز، میر پور خاص پر دستیاب ہے۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۱،شمارہ:نومبر،دسمبر ۲۰۱۲ء

رابطہ: 1-537/D، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔
فون: 5462495,5490181-51-(92+)
فیکس: 5512172-(92+)
موبائل: 0558618-336-(92+)
ای۔میل: chaharsu@gmail.com
۔ ویب سائٹ ۔
http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدرزیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

☆

○

اپنی زباں کا قرض اداکر رہا ہوں میں
خاموش وادیوں میں ندا کر رہا ہوں میں

مجھ کو سزائے عفو عطا کر مرے خدا
پھر ارتکابِ جرمِ دعا کر رہا ہوں میں
(باقرؔ)

○○

قرطاسِ اعزاز

○

باقرنقوی

○

کے نام

○○○

’’عاشقی کا پیراہن‘‘

عروب شاہد ...... (اسلام آباد)

سید محمد باقر نقوی عالمی شناخت کے حامل شاعر، ادیب اور مترجم کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ نہ صرف غزل اور نظم کے صاحبِ اسلوب شاعر ہیں بلکہ اردو نثر بالخصوص افسانہ اور سائنسی مضامین کے حوالے سے بھی اختصاصی مقام کے حامل تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کا ایک اختصاص الفرڈ نوبل انعام یافتہ اہلِ قلم کے تعارف، تراجم اور تخلیقات پر مشتمل تین جلدوں میں دو ہزار پانچ سو صفحات کی کتاب اردو ادب میں پہلا اور منفرد کارنامہ ہے۔

باقر نقوی صاحب Chartered Insurance Institute Associateship سے گریجویٹ ہیں اب تک آپ بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر آپریشن CCL Assurance, لندن، ایگزیکٹو ڈائریکٹر EFU, Life Assurance کراچی اور چیف ایگزیکٹو ALLIANZ-EFU Health Insurance کے طور پر خدمات انجام دے چکے ہیں۔

باقر صاحب بنیادی طور پر برطانوی شہریت کے حامل ہیں اور ۱۹۷۵ء سے برطانیہ کے شہر ہیسٹن میں قیام رکھتے ہیں۔ آج کل آپ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد چند انشورنس کمپنیز کے ایڈوائزر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں اور بقیہ وقت میں علمی و ادبی کام پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔

تخلیقات

- ☆ آٹھواں رنگ (افسانے) ۲۰۱۲ء
- ☆ نوبل امن انعام کے سو سال (نثر) ۲۰۱۱ء
- ☆ نوبل ادبیات (بیسوی صدی کا نوبل ادب) ۲۰۰۹ء
- ☆ ای۔ ایف۔ یو۔ ساگا (اردو میں ادارے کی تاریخ کا ترجمہ) ۲۰۰۷ء
- ☆ مصنوعی ذہانت (نثر) ۲۰۰۵ء
- ☆ برقیات (معہ ایجادات کی تاریخ) ۲۰۰۵ء
- ☆ دامن (شعری کلیات) ۲۰۰۵ء
- ☆ بہتے پانی کی آواز (شعری مجموعہ) ۲۰۰۴ء
- ☆ گنگا، جمنا، سرسوتی (منتخب ہندی نظمیں) ۲۰۰۲ء (ہندی)
- ☆ خلیے کی دنیا (جنیٹک سائنس کی روشنی میں۔ نثر) ۲۰۰۱ء
- ☆ الفریڈ نوبل (حالاتِ زندگی اور خدمات۔ نثر) ۱۹۹۹ء
- ☆ موتی موتی رنگ (شعری مجموعہ) ۱۹۹۴ء
- ☆ مٹھی بھر تارے (شعری مجموعہ) ۱۹۸۹ء
- ☆ تازہ ہوا (شعری مجموعہ) ۱۹۸۶ء

اعترافِ ہنر

- ☆ یو بی ایل۔ جنگ، لٹریری ایکسیلینس ایوارڈ ۲۰۱۲ء (نوبل امن انعام سو سالہ خدمات)
- ☆ قیصر تمکین خدمات برائے اردو ایوارڈ ۲۰۱۲ء (اردو سوسائٹی آف اسکارٹ لینڈ۔ ایڈن برگ یو۔ کے)
- ☆ یو بی ایل۔ جنگ، لٹریری ایکسیلینس ایوارڈ ۲۰۱۰ء (نوبل ادبیات برائے بیسوی صدی)
- ☆ ٹرانسلیشن ایکسیلینس ایوارڈ۔ ۲۰۱۰ء (سہ ماہی ’’اجراء‘‘ کراچی)
- ☆ بیسٹ اردو بک آف دی ویسٹ۔ ۱۹۹۰ء (برائے تازہ ہوا، از اردو مرکز انٹرنیشنل لاس اینجلس، یو۔ ایس۔ اے)
- ☆ ماہنامہ ’’طلوعِ افکار‘‘ کراچی، خاص نمبر
- ☆ ماہنامہ ’’پرواز‘‘ لندن، خاص نمبر
- ☆ قرطاسِ اعزاز (ماہنامہ چہارسو، راولپنڈی)

تحقیق

- ☆ مقالہ (باقر نقوی شخصیت اور فن) ایم۔ اے اردو از عارفہ ریاض کراچی یونیورسٹی ۲۰۰۸ء
- ☆ مقالہ (باقر نقوی شخصیت اور فن) ایم۔ اے اردو از صائمہ اکرم لاہور ایجوکیشنل یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء

انٹرنیٹ

(احباب باقر نے ترتیب دیا)

- ☆ http://en.wikipedia.org/wiki/Baqar Naqvi
- ☆ http://sbaqarnaqvi.blogspot.co.uk/

''انا کا قصور''

(باقر صاحب کے پہلے اور دوسرے شعری مجموعوں کا آئینہ)

صاعقہ مقبول (اسلام آباد)

○

ترا نور میری نگاہ ہے، ترا علم میرا شعور ہے
میں گناہ گار کبھی ہوا تو مری انا کا قصور ہے

کوئی اہلِ علم ونگاہ ہو تو کتابِ کون ومکاں پڑھے
ترا لفظ لفظ میں عکس ہے، ترا ذکر بینِ السطور ہے

ترا عزم ہو، ترا حسن ہو، ترا اعتبارِ کلام ہو
کبھی دشت جوئے فرات ہے، کبھی چاہ ہے، کبھی طور ہے

ترا شہر اور مرے قدم یہ شرف نہیں ہے تو اور کیا
یہ گناہ گار، یہ بے نوا، یہ حقیر تیرے حضور ہے

...... ☆ ......

(نذرِ غالب)

ہوں رہ نوردِ شوق مگر پا بُریدہ ہوں
میں ہجوِ کائنات بہ طرزِ قصیدہ ہوں

شرمندۂ سلوکِ مسیحا نہ کر مجھے
زخمیِ تیغِ دوست ہوں، مردم گزیدہ ہوں

مٹ کر ہوا جو اور تماشائے روزگار
میں وہ نوشتۂ ورقِ آب دیدہ ہوں

تن سے جدا ہے پھر بھی قلم ہے گرفت میں
گویا کسی شہید کا دستِ بریدہ ہوں

کلماتِ حق رہے ہیں رہینِ زباں مرے
گویا مزاجِ وقت کا وصفِ حمیدہ ہوں

تو عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ تھا
میں عندلیبِ گلشنِ آتش گزیدہ ہوں

○

پھول ہم نے کبھی مانگے، نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

تو خدا ہے تو ہماری بھی انا ہے کوئی
حق سمجھتے ہیں جو ہم تجھ سے دعا مانگتے ہیں

ہم نے کب گوہر و مرجاں کے خزانے چاہے
ہم تو بس ایک محبت کی فضا مانگتے ہیں

کوئی حاجت نہیں رکھتے ہیں بجز تابِ کلام
مسندِ طور، نہ جلوہ نہ عصا مانگتے ہیں

کوئی پوچھے جو کبھی گھر تو اسے گھر کہہ لیں
اور ہم ان در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں

کتنے بھولے ہیں ترے شہر کے زخمی پیکر
جو مسیحاؤں کے قاتل سے دوا مانگتے ہیں

○

''چہارسُو''

○

زمانہ ہو گیا، موسم بدل گئے ہوں گے ۔۔۔ مرے لگائے ہوئے پیڑ پھل گئے ہوں گے
سنا ہے اب کے برس برف گر رہی ہے بہت ۔۔۔ تو میرے باغ کے سب پھول جل گئے ہوں گے
چڑھی تھی اب کے ندی گرمیوں کے موسم میں ۔۔۔ ضرور برف کے تودے پگھل گئے ہوں گے
وہی ہے کھیل، اداکار بھی وہی سارے ۔۔۔ سماں ہے اور تو پردے بدل گئے ہوں گے
بجھے گی پیاس تو کیا آبِ گرم سے باقرؔ ۔۔۔ پرندے پیٹ کے موتی اُگل گئے ہوں گے

...... ☆ ......

تمام شہر تو شامل نئی سپاہ میں ہے
یہ کس بدن کی مہک ہے جو گردِ راہ میں ہے
بنے ہیں جس کے لیے سارے آہنی زیور
ابھی وہ مرحلہ حسرتِ گناہ میں ہے
خدا سے شام و سحر بھیک مانگنے والے
یہ کیسا مارِ تکبر تری کلاہ میں ہے
گزرتے رہتے ہیں ہر روز آفتاب مگر
وہ اک ستارہ ابھی تک مری نگاہ میں ہے
پہنچ گیا ہے ستاروں میں دوزخی کافر
ہمارا شیخ ابھی اپنی خانقاہ میں ہے
نکل پڑے ہیں سفر پر برادرانِ عزیز
ضرور پھر کوئی یوسف نصیب چاہ میں ہے

○

نہ کوئی حرف، نہ خواہش، نہ حوصلہ ہے مجھے
میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ کیا ہوا ہے مجھے
نہ اب اُداس ہیں صبحیں نہ کاٹتی شامیں
نہ کوئی خواب میں آ کر جھنجھوڑتا ہے مجھے
کچھ اور کیجیے تسکینِ خواب کی صورت
فریب کار اُجالوں سے واسطہ ہے مجھے
مرے لہو سے جو کرتا تھا آرزوئے حنا
نہ جانے کیوں وہ بری طرح چاہتا ہے مجھے
یہ اب کے بار جو رُک رُک کے آ رہی ہے بہار
ٹھہر ٹھہر کے کوئی زہر دے رہا ہے مجھے
صدا تو ہے کوئی مانوس سی مگر پُر ہول
یہ کون شام کو اکثر پکارتا ہے مجھے

○

تازہ ہوا (۱۹۸۸ء)

○

شہرت نہیں نصیب کہ رتبہ نہیں ملا — اس بے بضاعتی پہ بھی کیا کیا نہیں ملا
آئے اگر نہ دھوپ تو اُگتا نہیں ہے کچھ — کیجیے خدا کا شکر کہ سایہ نہیں ملا
اُس وقت شہرِ قلب کا منظر تھا دیدنی — جس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں ملا
اے ریگِ تشنہ کام وہ قطرہ ہیں ہم جسے — بادل کی گود چھوڑ کے دریا نہیں ملا
گھر میں بھرے ہوں لاکھ جواہر تو کیا، اگر — مٹھی بھر اِک فقیر کو آٹا نہیں ملا

...... ☆ ......

یوں بھی کچھ خوب نہ تھا زینتِ صحرا ہونا
فخر کی بات ہے اب شہر میں رُسوا ہونا
وہ مناظر ہیں کہ ہو جاتی ہیں آنکھیں زخمی
اتنا آساں تو نہیں صرفِ تماشا ہونا
بجلیاں کوندتی پھرتی ہوں دماغوں میں تو پھر
سانحہ ہے کہ نہیں خون کا ٹھنڈا ہونا
جو بھی مخلوق ہوئی ہاتھ کے فن سے غافل
اس کا مقسوم ہوا ہاتھ کا چھوٹا ہونا
روح بیمار ہو، جینے کی تمنا بھی نہ ہو
کون اس کرب میں چاہے گا مسیحا ہونا
پھول کم ہوتے ہیں، آتے ہیں زیادہ پتھر
کتنا مخدوش ہے اِس دور میں اونچا ہونا
اہلِ تہذیب کو زیبا نہیں ہرگز باقرؔ
دھوپ کو دیکھ کے ساحل پر برہنہ ہونا

○

پھول کو رنگ کی، خوش بو کی، دعا دی جائے
آؤ اِک بار زمیں پھر سے سجا دی جائے
ابنِ آدم نے محبت کا ہنر سیکھ لیا
یہ خبر سارے فرشتوں کا سنا دی جائے
چاہنے والوں کو خانوں میں جو تقسیم کرے
ایسی شیشے کی بھی دیوار گرا دی جائے
جس کی گرمی سے پگھلنے لگے تنہائی کی برف
ایسی چنگاری کو تائیدِ ہوا دی جائے
جس کے پڑھنے سے کسی طرح قلم ہو بدنام
ایسی تحریر جہاں بھی ہو مٹا دی جائے
نفرتیں ایسے محبت میں بدل دی جائیں
جیسے بدرَو کوئی دریا میں ملا دی جائے
قہر ہو جس کے لیے اُس کے کینوں کا نفاق
ایسی بستی کو بھلا کیسی دعا دی جائے

○

''چہارسُو''

○

سچ کسی روز کوئی خواب ہمارا نکلے جیب سے چاند تو مٹھی سے ستارا نکلے
لوگ ظلمت ہی پہ ایمان نہ لے آئیں کہیں کوئی خورشید سے کہہ دو کہ خدارا نکلے
ہم دفینے کو زمیں کھودیں تو نکلے پانی وہ جو پانی کا کنواں کھودے تو پارہ نکلے
چاند کے بعد وہ چہرہ نظر آیا جیسے ایک ہی رات میں مہتاب دوبارہ نکلے
آ، چمن میں بھی اُسے ڈھونڈنے چلتے ہیں صبا کسی غنچے ہی سے شاید وہ دل آرا نکلے
یاد یوں آتے ہو، گردابِ غمِ دنیا میں جس طرح بیچ سمندر میں کنارہ نکلے
منحصر آپ کی ہمت پہ ہے سب کچھ باقرؔ سنگ کیا چیز ہے پانی سے شرارہ نکلے

...... ☆ ......

گل برسنے لگے دامن میں دعا سے پہلے
مہرباں ہوگا بھلا کون خدا سے پہلے
آڑی ترچھی سی مقدر کی لکیریں دو چار
کیا تھا ہاتھوں میں ترے رنگِ حنا سے پہلے
رنگ برسانے کو آتے ہو مرے آنگن میں
بادلو! پوچھ تو لو بادِ صبا سے پہلے
چھینتے ہو جو مری عمر، اُسے دے دینا
بس یہی آخری خواہش ہے سزا سے پہلے
ہر گزرتے ہوئے موسم کے نشاں ہیں تن پر
اور بھی ظلم ہوئے ہم پہ ہوا سے پہلے
تیسری آنکھ نے دریافت کیا آٹھواں رنگ
آگے دیکھا ہی نہ تھا رنگِ قبا سے پہلے

○

کھڑکیاں ویران، دروازہ کھلا رہ جائے گا
ہم نہ ہوں گے تو بھلا اس گھر میں کیا رہ جائے گا
گاؤں کے باسی اگر شہروں کو ہجرت کر گئے
کیا اکیلا مور بن میں ناچتا رہ جائے گا
سب ہوا پیما ہوئے تو کیا کریں گی کشتیاں
ڈوبنے کو کیا اکیلا ناخدا رہ جائے گا
پتھروں پر نام جو لکھتے ہیں، اے آتش فشاں
کیا سمجھتے ہیں کہ پتھر کا لکھا رہ جائے گا
سارے ماہی گیر اپنے جال بھر لے جائیں گے
اور زور آور سمندر دیکھتا رہ جائے گا
اِک مسافر ہے، چلا جائے گا وہ جادوسخن
ہاں زباں پر اس سے باتوں کا مزہ رہ جائے گا

○

''زینتِ صحرا''

سِلما اوٹیلیا لوویسا لاگیرلوف

باقر نقوی

اعترافِ کمال:

بلند و بالا مثالیت، روشن تصورات اور روحانی قوتِ مدرکہ کی توصیف میں جواس کی تحریروں کی پہچان ہیں۔

سلما لاگیرلوف کے فن سے نارویائی روایات اور تاریخ کی بھینی بھینی خوشبوآتی ہے۔اس نے اپنے زمانے کی سکہ رائج الوقت حقیقت پسندی کی تحریک سے رُوگردانی کی اور بہت محبت بھرے انداز میں اپنے مؤقلم سے شمالی سوئیڈن کے کسانوں کی زندگی اور وہاں کے قدرتی مناظر کی کامیاب نقاشی کی ہے۔اس میدان میں اس کا سب سے بڑا حریف ہائیڈن اشٹام تھا جس کو 1916 میں ادب کا نوبیل انعام دیا گیا۔

سِلما 1858 میں جنوبی سوئیڈن کے شہر Marbacka میں پیدا ہوئی۔اس کا باپ ایک فارغ شدہ فوجی افسر تھا۔سِلما کو ابتدائی تعلیم اس کے گھر پر ہی دی گئی۔وہ اپنے چھوٹے سے خاندانی گھر میں دوسرے بچوں سے الگ پلی بڑھی۔سِلما نے، جوزیادہ تر اپنی دادی کے پاس رہتی تھی، جنوبی سوئیڈن کے جنگجو لوگوں کے ماحول، برف پر پھسلنے کے مقابلوں اور توہم پرستی کے قصے کہانیاں، روایات، اور سنہرے ماضی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔

سِلما نے 1882 میں اسٹاک ہوم کی Royal Superior Training Academy سے تدریس میں گریجویشن کیا اور اس کے بعد دس برس تک Landskrona میں لڑکیوں کے ایک اسکول میں استاد کی حیثیت سے تعلیم دی۔اسی دوران اس نے ایک ناول The Story of Gosta Berling لکھنا شروع کیا تھا جس کے ابتدائی ابواب کو ایک ادبی مقابلے میں بھیج دیا۔اس مقابلے کا انتظام Idun رسالے کی طرف سے کیا گیا تھا۔خوش قسمتی سے سِلما کو نہ صرف انعام دیا گیا بلکہ مکمل ہو جانے پر پورے ناول کی اشاعت کے لیے پیش کش بھی کی گئی۔

اپنی دوست Baroness Sophie Aldesparre کی مالی معاونت سے سِلما نے اپنا ناول Gosta Berlinds Saga (The Story of Gosta Berling) مکمل کیا جو 1891 میں شائع ہوا۔ابتدا میں تو ناول کی مانگ کم رہی تھی مگر جب ادبی مبصر جارج برینڈس برگ نے ڈینش زبان میں ناول کے ترجمے کو اپنے مثبت تبصرے میں سراہا تو یہ تصنیف انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سویڈش زبان کے رومانی ناولوں کے احیا کا حصہ بن گئی۔اس ناول پر مبنی ایک فلم بھی بنائی گئی تھی جس میں مشہور اداکارہ گریٹا گاربو نے بھی کام کیا تھا۔

سِلما کی مختصر کہانیوں کے مجموعے Osylinga Lankar (Invisible Links) 1894 کو راتوں رات کامیابی نصیب ہوئی۔King Oscar کی طرف سے فیلوشپ اور سوئیڈش اکیڈمی کی جانب سے مالی امداد ملنے کے بعد سے اس نے اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف کی طرف موڑ دی۔سِلما نے اپنے ایک ہم عصر مصنف سوفی ایلکان Sophie Elkan سے شادی کر لی اور وہ دونوں فالون Falun نامی بستی میں منتقل ہو گئے جہاں دونوں نے اپنی بقیہ ساری زندگی بسر کی۔سِلما نے اپنے شوہر کے ساتھ اٹلی اور سسلی کا سفر کیا جس کے بعد اس نے سسلی کے بارے میں ایک اشترا کی ناول Antikrists Mirakler 1897 - (The Miracles of Antichrists) تصنیف کیا۔اپنے مصر اور فلسطین کے سفر سے متاثر ہو کر سِلما نے دو ناول I Det Jarusalem: I Dalarne (1901) اور Heliga Landet (1902) لکھے جن کی بنا پر اس کو سوئیڈش زبان کے سر برآوردہ ناول نویسوں میں مقام ملا۔

بچوں کے لیے لکھی گئی سِلما کی سب سے مقبول کتاب The Wonderful Adventures of Nils تھی جس کا خیال جزوی طور پر رڈیارڈ کپلنگ کی جانوروں کی کہانیوں سے لیا گیا تھا۔اس کتاب کو سوئیڈن کے پرائمری اسکول بورڈ کی فرمائش پر لکھا گیا تھا تا کہ بچوں کو سوئیڈن کا جغرافیہ پڑھانے میں استعمال کیا جائے۔یہ دو جلدوں پر مشتمل تصنیف ایک چودہ سالہ لڑکے نِلس Nils کی کہانی ہے جو اپنی خود غرض شرارتوں کی وجہ سے بالشتیا (Elf-sized) بن جاتا ہے اور اپنے ہلکے وزن اور چھوٹے قد کے باعث ایک ہنس کی پشت پر سوار ہو کر ہنسوں کے جھنڈ کے ساتھ ساتھ سارے سوئیڈن میں اڑا پھرتا ہے۔بلندی پر اڑنے کے دوران نِلس کی زبان سے سِلما اپنے ملک، اس کے باسیوں، ان کے رہن سہن، اس کی جغرافیہ، تاریخ اور روایات کے بارے میں بچوں کے لیے نہایت مفید دلچسپ معلومات فراہم کر دیتی ہے۔جب نوبیل انعام یافتہ جاپانی ادیب اوئے (Oe) اپنا انعام وصول کرنے اسٹاک ہوم گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ سِلما کی یہ کتاب وہ اپنے بچپن میں بار ہا پڑھ چکا ہے۔

سِلما اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سرابِ خیال کے فن کارانہ استعمال سے خواب اور حقیقت کے درمیان کی سرحدوں کو دھندلا دیتی ہے۔اس کے ناول Korkarlen (1912) میں اسی تکنیک کے استعمال سے ایک فنتاسی جیسی خواب آگیں کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔اس ناول پر مبنی 1921 میں ایک فلم The CarriagePhantom بنائی گئی تھی جس کو اس زمانے تک ڈرامائی مناظر کی

بہترین مثال ہونے کہ وجہ سے سویڈن کی فلموں میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

جنگِ عظیم دوم کے شروع میں سِلما نے بہت سے جرمن دانش وروں کو نازیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے فرار میں مدد دی تھی۔ اس نے شاعرہ نے لی ساش Nelli Sach کو سویڈن کا ویزا دلوا کر اس کو نازی ڈیتھ کیمپ سے بچا لیا تھا۔ جب جنگِ عظیم کے دوران فن لینڈ روس کی جارحیت کے خلاف لڑ رہا تھا سِلما لاگیرلوف نے اپنے نوبیل انعام میں ملنے والا سونے کا تمغہ امدادی فنڈ میں دے دیا تھا۔

سِلما لاگیرلوف کی اپنی اور اس کے بارے میں اب تک اکتیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سِلما نے 1940 میں انتقال کیا۔

ضیافت سے خطاب

چند دن قبل میں اسٹاک ہوم جانے والی ریل گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ میرے ڈبے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جب کہ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ میرے ساتھ سفر کرنے والے اپنے اپنے کونوں میں اونگھ رہے تھے۔ میں بالکل خاموش تھی۔ ریل گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز میرے کانوں کے پردے سے ٹکرا رہی تھی۔

اور پھر میں اُن دنوں کو یاد کرنے لگی جب اکثر اسٹاک ہوم آیا کرتی تھی۔ یوں ہی نہیں، کسی کام سے، کسی مشکل کام کے لیے، امتحان دینے کے لیے، یا اپنے تازہ مسودے کے لیے کسی ناشر کی تلاش میں۔ اور آج پھر میں اسٹاک ہوم آ رہی تھی مگر اس بار ادب کا انعام حاصل کرنے کے لیے۔ یہ بھی، میں نے سوچا، میرے لیے ایک مشکل مرحلہ ہو گا۔

اس سال خزاں کا پورا موسم میں نے Varmland میں اپنے پرانے گھر میں مکمل تنہائی میں گزارا تھا، میں نے سوچا، مگر اب مجھے اتنے سارے لوگوں کے مجمعے کے سامنے آنا پڑے گا۔ تنہائی کی عیاشی کے ان دنوں نے مجھ کو زندگی کی گہما گہمی کے معاملے میں ڈرپوک بنا دیا تھا یہی وجہ ہے کہ میں دنیا سے آنکھ ملانے کے خیال ہی سے سراسیمہ ہو رہی تھی۔

تاہم، اپنے اندرون کی گہرائیوں میں اس انعام کو حاصل کرنے پر مجھے عجیب قسم کی مسرت کا احساس ہو رہا تھا، اور میں نے اپنے اندر پیدا ہونے والی بے سکونی کو دور کرنے کے لیے ان احباب کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا جن کو میری خوش قسمتی اور اس انعام کے ملنے پر خوشی کا احساس ہو گا۔ ان میں میرے پیارے دوست، میرے بھائی بہن، اور سب سے بڑھ کر میری ضعیف والدہ ہوں گی جو اپنے گھر میں خوش بیٹھی یہ دن دیکھنے کو زندہ ہیں۔

مگر پھر اسی آن مجھے اپنے والد بھی یاد آئے اس دکھ کے ساتھ کہ وہ یہ مسرتوں بھرا دن دیکھنے کو اس دنیا میں موجود نہیں، اور پھر اس بات پر اور بھی افسردہ ہو گئی کہ میں ان کے پاس جا کر بتا بھی نہیں سکتی کہ مجھ کو نوبیل انعام سے نوازا جا رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس خبر کو سن کر ان سے زیادہ خوش ہونے والا کوئی نہ ہوتا۔ میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملی جس کے دل میں تحریر شدہ حرف اور اس کے خالق کے بارے احترام کے ایسے جذبات ہوں گے جتنے کہ میرے والد میں، اور کاش ان کو معلوم ہوتا کہ سویڈش اکادمی نے مجھے اس عظیم اعزاز کے لیے چنا ہے۔ سچ مچ، میں بہت افسردہ تھی کہ میں ان کو یہ خبر نہیں پہنچا سکتی تھی۔

کوئی بھی شخص جس نے کبھی ریل گاڑی میں سفر کیا ہو، اس نے بھی محسوس کیا ہو گا کہ اس وقت جب کہ گاڑی رات کے گہرے اندھیرے میں دوڑ رہی ہو، کبھی کبھی ایسے طویل لمحات بھی آتے ہیں جب گاڑی کے ڈبے نسبتاً کم تھرتھراہٹ کے ساتھ ایک بہاؤ کی صورت میں چلتے چلے جاتے ہیں۔ اچانک ساری سرسراہٹ اور ہلچل غائب ہو جاتی ہے اور پہیوں کی پٹریوں سے رگڑ کی آوازیں ایک سکون بخش اور بے اضطراب موسیقی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا گاڑی کے ڈبے ریل کی پٹری پر نہیں بلکہ خلا میں تیر رہے ہوں۔ بس ریل گاڑی میں بیٹھی میں بھی کچھ ایسا ہی میں محسوس کر رہی تھی۔ ساتھ ہی دل میں یہ خواہش بھی ابھر رہی تھی ''اے کاش میں کسی بھی طرح اپنے والد سے پھر مل سکتی اور ان کے گلے لگ سکتی۔'' ایسی لطیف اور بے آواز تھی اس وقت ریل گاڑی کی حرکت کہ میں خود کو روئے زمین پر موجود تصور کرنے میں مشکل محسوس کر رہی تھی۔ اور پھر میں نے عالمِ ہوش ہی میں خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ تصور شرط ہے! گویا میں اپنے والد سے ملنے جنت میں جا رہی ہوں۔ میں نے لوگوں سے اس قسم کے تجربات سنے ہیں تو میں خود کیوں ایسا تجربہ نہیں کر سکتی۔ ریل گاڑی خلا میں تیرتی رہی، اس کو بہت دور تک جانا تھا مگر اس کے باوجود میرے خیالات کی رَو اس سے آگے آگے دوڑ رہی تھی۔ میری چشمِ تصور نے دیکھنا شروع کیا۔ ابّو یقیناً جھولنے والی کرسی پر دراز برآمدے میں بیٹھے ہوں گے اور ان کے سامنے چھٹکی ہوئی نرم نرم سنہری دھوپ، چہچہاتے ہوئے پرندوں اور ہوا میں لہراتے خوش نما پھولوں سے بھرا باغیچہ ہو گا۔

ابو کی نظریں بلاشبہ Fritjofs Saga پر مرکوز ہوں گی مگر مجھ کو دیکھتے ہی وہ کتاب کو پرے رکھ کر عینک کو ماتھے پر ٹکا کر والہانہ انداز میں کرسی سے اُٹھیں گے اور میری طرف بڑھیں گے۔ اور کہیں گے ''صبح بخیر میری پیاری بیٹی، تجھے اچانک دیکھ کر میں بے انتہا خوش ہوں'' یا ''ارے سِلما! تم یہاں کیسے؟ کیسی ہے میری پیاری بیٹی!'' بالکل اُسی طرح جیسے وہ مجھ سے ملتے وقت کہا کرتے تھے۔

پھر وہ آرام کرسی پر بیٹھ جائیں گے اور غور سے سوچیں گے کہ بھلا ان سے ملنے میں یہاں کیوں آ گئی۔ پھر ایک دم وہ مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھیں گے، ''کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا؟'' میں جواب میں کہوں گی، ''نہیں ابّو، سب کچھ ٹھیک ہے۔'' پھر جوں ہی میں ان کو اچھی خبر سنانا چاہوں گی تو اچانک رُک کر کچھ دیر کے لیے تامّل کروں گی اور ان کو براہِ راست خبر سنانے کی بجائے

کچھ اس طرح کہوں گی، ''ابّو میں آپ سے ایک مشورہ کرنے آئی ہوں، اس لیے کہ اس وقت میں بہت بڑے قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں۔'' اگرچہ، مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں آپ میری کچھ مدد نہیں کرسکیں گے۔'' ابّو جواب دیں گے ''بھئی! کوئی اِس جگہ کے بارے میں کچھ بھی کہے مگر اپنے گاؤں Varmland ہی کی طرح یہاں سب کچھ ہے سوائے دولت کے۔''

''اوہ! مگر ابّو! مجھ پر دولت کے قرض کا بوجھ نہیں، یہ قرض تو اس سے بھی بُرا ہے۔'' ابّو کہیں گے، ''بیٹی! ذرا پھر سے تو کہو۔''

''آپ سے مدد مانگنا کچھ ایسی زیادتی بھی نہیں ابّو اس لیے کہ ابتدا ہی سے یہ سب بالکل آپ ہی کی غلطی ہے، آپ کو یاد ہے کہ نہیں؟ کس طرح آپ پیانو بجا بجا کر بچوں کو Bellman کے گیت سنایا کرتے تھے، اور کس طرح، جاڑے کے ہر موسم میں کم از کم دو بار، آپ ہم لوگوں کو Tegner, Runeberg اور Anderson پڑھنے پر اُکسایا کرتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب سب سے پہلے میں نے اپنے آپ کو مقروض محسوس کیا تھا۔ بھلا کس طرح میں اتنی محبت بھری کہانیوں، جیالوں کی داستانوں، اپنے وطن کی اور ساری انسانی زندگی کی بے چارگی کی، اور وقار کے قصے سنانے کا اجرادا کرسکوں گی؟ کیا میں کبھی یہ قرض اُتار بھی سکوں گی؟''

ابّو اپنی جھولنے والی کرسی میں سیدھے ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجائے گی اور وہ کہیں گے ''میں خوش ہوں کہ تم پر یہ قرض چڑھا ہوا ہے۔'' میں کہوں گی، ''جی ہاں ابّو ! آپ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر یاد کیجیے بس اتنا ہی نہیں ہے، ابّو ! ذرا سوچیے تو، میرے کتنے قرض خواہ ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آپ کے شباب کے دور میں کتنے غریب، خانہ بدوش لوگ Varmland آتے جاتے رہتے تھے، وہ طرح طرح کے گیت سنا کر، ہنسا ہنسا کر دل بہلایا کرتے تھے۔ ہاں مگر، میں ان کی شرارتوں اور بدمعاشیوں کے لیے ان کی ان کی قرض دار نہیں۔ اور وہ بزرگ مرد اور عورتیں جو اپنے چھوٹے چھوٹے خاکستری مکانوں کے سائبانوں میں بیٹھے ہوتے، اور کوئی جنگل سے واپس آکر مجھے گنگناتے جھرنوں، کھنکتی ہوئی آواز میں گانے اور ریجھا کر پہاڑوں میں بلائی جانے والی کنواریوں کے حیرت بھرے قصے سناتا۔ یہ تھے وہ لوگ جنھوں نے مجھے سکھایا کہ سیاہ جنگلوں میں، سنگلاخ چٹانوں میں بھی شاعری ہوتی ہے۔ اور ذرا یاد کیجیے ابّو جان! ان زرد، سُتے ہوئے چہروں، دھنسے ہوئے گالوں والے راہبوں کو، سیاہ قباؤں میں ملبوس اندھیری خانقاہوں کی کنواری راہباؤں کو، ان نظاروں اور آوازوں کو جو انھوں نے سنی ہوں گی۔ میں نے ان سب سے ان کی روایات ادھار لے لی ہیں۔ اور ہمارے اپنے کسان جنھوں نے یروشلم کے سفر کیے، کیا میں ان کی ان ایسی شان دار کارگزاریوں کی مقروض نہیں جنھوں نے مجھے لکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں فراہم کیا۔ اور میں صرف ان لوگوں ہی کی مقروض نہیں، سارے جہانِ فطرت کی بھی مقروض ہوں۔ وہ تمام جانور جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں، وہ تمام پرندے جو فضاؤں میں تیرتے نظر آتے ہیں، وہ تمام ہرے بھرے پیڑ، وہ پودے اور رنگ برنگے پھول، ان سب نے مجھے اپنے راز سے آشنا کیا ہے۔''

والد مسکرائیں گے، اور بغیر کسی تردّد کے اپنے سر کو اثبات میں ہلائیں گے۔ اور میں ذرا زیادہ سنجیدہ نظر آتے ہوئے کہوں گی، ''مگر ابّو ! کیا آپ کو احساس نہیں کہ میں کتنے بڑے قرض کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں؟ کم از کم اس روئے زمین پر تو کسی کو پتا نہیں کہ یہ قرض کس طرح اُترے گا، میرا خیال تھا کہ شاید جنّت میں تو آپ کو اس بات کا کچھ علم ہوگا۔'' ابّو کہیں گے، ''ہم جانتے ہیں'' اور پھر اسی طرح بے پروا اور پُرسکون ہو جائیں گے جس طرح وہ عموماً ہو جایا کرتے تھے اور کہیں گے، ''نہیں بیٹی، تمھاری مشکلوں کا ایک علاج ہے۔''

میں کہوں گی، ''جی ہاں ابّو جان! بس مشکل صرف اتنی ہی نہیں، میں ان لوگوں کی بھی مقروض ہوں جنھوں نے ہماری زبان ترتیب دی ہے، اس کو حسین وسیلہ بنایا ہے اور مجھ کو اسے استعمال کرنے کا گُر بھی سکھایا ہے۔ اور کیا میں ان لوگوں کی مقروض نہیں جنھوں نے میرے عہد سے پہلے بھی نثر اور نظم لکھی، جنھوں نے تحریر کو فن کا درجہ دیا ہے؟ کیا میں ان تمام مشعل برداروں، ان راہیں ڈھونڈنے والوں کی، اور ان عظیم نارویائیوں، ان عظیم روسیوں کی بھی میں مقروض نہیں جو اُس وقت لکھ رہے تھے جب میں پالنے میں اپنا انگوٹھا چوس رہی ہوتی تھی؟ کیا مجھ کو ایسے دور میں زندہ رہنے کی نعمت عطا نہیں ہوئی جب میرے اپنے وطن کا ادب ایسے بلند ترین مقام پر پہنچ چکا ہے کہ میں Rybberg کے بنائے ہوئے مرمریں سلطانوں سے عشق کرسکتی ہوں؟ Snoilsky کی شاعری، Strindberg کی چوٹیوں، Geijerstam کی لوک کہانیوں، Anne-Charlotte Edgren کے جدید آدمیوں، اور ErnstAhlgren, Heidenstam'sOrient وغیرہ اور بہت کچھ جس میں جوانیاں تھیں، نیا پن تھا، وہ سب کچھ تھا جس نے میرے سرابِ خیال کو سیراب کیا، مجھ کو مقابلے پر اُکسایا اور میرے خوابوں کو تعبیریں دیں، کیا میں ان کی قرض دار نہیں؟''

ابّو کہیں گے، ''ہاں، ہاں، بیٹا، تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو میری جان، تم پر، بہت بڑا قرض ہے مگر ڈرنا نہیں، ہم کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔''

میں کہوں گی، ''میں نہیں سمجھتی ابّو ! کہ آپ کو حالات کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہے، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں اپنے تمام پڑھنے والوں کی بھی مقروض ہوں۔ بوڑھے بادشاہ اور اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کی بھی جس نے مجھ کو تربیت کے لیے جنوب کے سفر پر بھیج دیا تھا، ان چھوٹے چھوٹے اسکول کے بچوں میں جنھوں نے Nils Holgersson کو شکریے کا خط لکھا تھا۔ اور میرا کیا بنتا اگر کوئی بھی میری کتابیں نہ پڑھنا چاہتا۔ اور ان سب کو کیسے بھلا دوں جنھوں نے میرے بارے میں کچھ بھی لکھا ہے۔ آپ کو وہ مشہور ڈینش مبصر یاد ہے نا، جس کے صرف چند لفظوں نے پورے ڈنمارک میں میرے چاہنے

والے پیدا کر دیے تھے۔ اور وہ بھی جو اُمرِت اور تلخی کو ایسی فن کاری سے متھ کر یک جان کرنے کا فن جانتا تھا، جیسا پورے سویڈن میں آج تک کوئی نہیں کر سکا، افسوس کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان سب کے بارے میں جو غیر ممالک میں رہتے ہیں اور جنھوں نے میرے لیے کام کیا ہے، ان کے لیے تشکّر بھی مجھ پر واجب ہے ابّو! میری تعریف کے لیے بھی اور تادیب کے لیے بھی۔"

"ہاں، ہاں!" کہتے ہوئے میں ابّو کے چہرے پر تذبذب کی پرچھائیاں دیکھوں گی۔ یقیناً وہ سمجھ جائیں گے کہ میری مدد کرنا کچھ اتنا آسان نہیں۔

میں کہوں گی، "یاد ہیں نا آپ کو ابّو! وہ سب جنھوں نے میری مدد کی تھی۔" میں کہوں گی، "یاد آیا آپ کو میرا مخلص دوست Esselde جس نے میرے لیے اس وقت کامیابی کے دروازے کھولنے چاہے تھے جب کسی کو مجھ پر یقین کرنے کی بھی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ ان سب کو یاد کیجیے جنھوں نے میرا بہت خیال رکھا اور میرے کام کی، میری تحریر کی حفاظت کی تھی۔ یاد کیجیے میرے اس ہم سفر دوست کو جس نے نہ صرف مجھے جنوب کی سیر کرائی، مجھے فن کی عظمتوں سے روشناس کرایا بلکہ میری زندگی کو لطیف اور مسرت انگیز بنایا تھا۔ ساری محبتیں جو مجھ کو ملیں، سارے اعزازات، سارے امتیازات، کیا آپ اب سمجھ گئے کہ میں آپ سے یہ کیوں پوچھنے آئی ہوں کہ اتنے سارے قرض کس طرح ادا ہوں؟"

میں دیکھ رہی ہوں کہ ابّو نے اپنا سر جھکا لیا ہے اور وہ کچھ زیادہ مطمئن نہیں دکھائی دیتے۔

ابّو کہیں گے، "میں تم سے اتفاق کرتا ہوں بیٹی، تمھاری مدد کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا، مگر یقیناً اس کے علاوہ تم اور کسی کی قرض دار نہیں ہوگی۔"

میں کہوں گی، "جی ابّو! میرے لیے اتنا قرض ہی بہت مشکل تھا مگر میرے لیے سب سے بڑا قرض تو زیرِ بحث ابھی آیا ہی نہیں۔ اسی وجہ سے تو میں آپ کے پاس مشورے کے لیے آئی ہوں۔" ابّو کہیں گے، "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ قرض اور کیا ہوگا۔" میں جواب میں کہوں گی، "ہاں!" اور اس کے بعد میں انھیں اس انعام کے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔

ابّو کہیں گے، "مجھے اکادمی کے بارے میں یقین نہیں آ رہا ہے۔" اس کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے میرے چہرے پر نگاہ ڈالیں گے، اور پھر ان کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب کچھ بالکل سچ ہے۔ اور پھر ان کے چہرے کی ہر سلوٹ تھرتھرائے گی اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگیں گے۔

میں کہوں گی، "ابّو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان لوگوں سے کیا کہوں جنھوں نے انعام کے لیے میرا نام تجویز کیا، اور ان لوگوں سے جنھوں نے فیصلہ کیا، ابّو جان! یہ سب صرف اعزاز اور دولت ہی نہیں جو مجھ کو عطا کر رہے ہیں، یہ فیصلہ کرتے ہوئے انھوں نے واضح کر دیا ہے کہ انھیں مجھ پر اتنا ہی اعتماد ہے کہ وہ ساری دنیا میں سے مجھ ہی کو چن رہے ہیں۔ میں بھلا یہ قرض کس طرح چکا سکوں گی؟"

ابّو گم سم کچھ دقیقے بیٹھے رہیں گے۔ ان کے لبوں پر کوئی لفظ بھی آ نہ پائے گا۔ پھر اپنی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی کرسی کے ہتھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہیں گے، "میں ایسے مسائل پر اپنا دماغ کیوں کھپاؤں جن کے حل نہ اہلِ جنت کے نہ اہلِ دنیا کے پاس ہوں۔ میں بے انتہا خوش ہوں کہ تم کو نوبیل انعام دیا گیا ہے، بس!"

صاحبانِ جاہ و جلال، عزت مآب، خواتین و حضرات! اپنے سارے سوالات کا اس سے بہتر جواب نہ پا کر، میرے پاس سوائے اس اعزاز کے اور کیا رہ گیا ہے کہ آپ سب سے سویڈش اکادمی کے لیے ایک جام تجویز کرنے کی استدعا کروں۔

(تاریخ نے تو سلما اوٹیلیا لوویسا لاگیرلوف کی اِس تقریر کے باب میں اس کے بعد اور کچھ نہیں لکھا مگر راقم اپنے چشمِ تصور سے تالیوں کی گونج اور تبسم کے درمیان حاضرین کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو ضرور دیکھ رہا ہے۔ ب۔ن)

"منفرد کتاب"

اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب برطانیہ میں مقیم اردو کے نامور شاعر جناب باقر نقوی نے تصنیف فرمائی ہے۔ اب تک اُن کے چار شعری مجموعے قارئین ادب کی داد و تحسین سمیٹ چکے ہیں۔ یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ شاعری کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے سائنس کی تفہیم سے بھی گہرا قلبی لگاؤ برقرار رکھا ہے۔ اُن کی کتاب "الفریڈ نوبیل" اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اب انھوں نے ہمیں الیکٹرانکس (برقیات) کی دُنیاؤں کی سیر کرانے کی ٹھانی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی تیاری کے دوران انھوں نے شعوری طور پر اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے کہ عام قارئین بھی اس کتاب سے آسانی کے ساتھ استفادہ کر سکیں۔

میری رائے میں باقر نقوی صاحب اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ ہم اُن کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے اپنی اس گراں قدر تصنیف کی اشاعت کی سعادت مقتدرہ قومی زبان کو بخشی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ منفرد کتاب ہمارے ہاں سائنسی علوم کے ساتھ سرسری سے شغف کو گہرا اور تخلیقی شغف بنانے میں مؤثر اور فعال کردار سرانجام دے گی۔

پروفیسر فتح محمد ملک

براہِ راست

چندنا پختہ اذہان میں خدا جانے یہ تاثر کب اور کس طور گھر کر گیا کہ اردو شعروادب فارغ البال اور غیر سنجیدہ افراد کے وقت گزاری یا دل بہلاوے کا شغل ہے۔ہم اس نابالغانہ رائے پر تبصرہ مناسب خیال نہیں کرتے البتہ! یہ یاددہانی کرانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ شاعری نہ صرف پیغمبروں بلکہ اولیاء اللہ کا وصفِ خاص رہا ہے۔دنیا کے بیشتر علوم وفنون اسی صنفِ لطیف کی اہم شاخیں گردانی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر اشاعت سائنسی نکتہ نگاہ کے حامل ایک ایسے شاعر، ادیب اور مترجم سے منسوب ہے جن کی مساعی قرآنِ حکیم کی روشنی میں اپنی کھوئی ہوئی میراث کی تلاش ہے۔اس تلاش میں **باقر نقوی** صاحب کس حد تک کامیاب و کامران ٹھہرے ہیں اور اُن کی تخلیقات کس معیار کو چھو رہی ہیں، فیصلہ آپ کیجیے اور مستقبل سے خوش اُمیدی وابستہ رکھیئے کہ اس خاکستر میں ابھی ایسی بے شمار چنگاریاں موجود ہیں جو ذرا سی محنت اور توجہ سے تابناک شعلوں کا روپ دھار سکتی ہیں!!!

گلزار جاوید

☆ اگر آپ ماضی کے اوراق پلٹنا چاہیں تو کون سے ابواب اوّلیت چاہیں گے؟

☆☆ میں ماضی پر نہیں، مستقبل پر نگاہیں جمانے کا قائل ہوں۔اگر حال کے مقابلے میں ماضی شاندار رہا ہو تو دُکھ ہوتا ہے۔اگر حال بہتر ہو تو ماضی پر صرف نظر ڈال کر شکر کرتے رہنا چاہیے۔

☆ مولوی احسان کے سامنے پڑھتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ مرحوم کا لاحقہ کس جذبے کے تحت لگایا کرتے تھے؟

☆☆ وہ محض بچپنا تھا۔اس قت میری عمر چھ سات برس کی رہی ہوگی۔ چوں کہ یہ لفظ بزرگوں کے نام کے سامنے لگا نظر آیا کرتا تھا،تو شاید اس خیال سے کہ ہم بھی جلد بزرگ ہو جائیں گے، میں نے ایک دن تختی لکھتے وقت یوں ہی اپنے نام میں مرحوم کا اضافہ کر لیا تھا۔ مجھے اس وقت اس لفظ کے معنیٰ بھی معلوم نہیں تھے۔

☆ حیدر حسین صاحب سے کلام انیس و دبیر کس جذبے اور سوچ کے تحت سنا کرتے تھے اور اُس کے بعد آپ پر گزرتی کیا تھی؟

☆☆ حیدر حسین صاحب بہت خوش الحان سوز خواں تھے۔مجالس میں سوز خوانی کے دوران ان کی آواز، اور انیس کے کلام کی شعری کیفیت مجھے مسحور کر دیا کرتی تھی۔آج بھی، کبھی کبھی، ان کی آواز اور ان کا لحن میرے کانوں میں گونج جاتا ہے۔انیس کے انتخابِ کلام سے بحور، الفاظ کی نشست و برخاست کا علم ہوتا تھا۔کیفیت میں ڈوبے ہوئے اشعار غم زدہ کر دیا کرتے تھے۔ایک بیت کی اصل کیفیت۔

''گھر سے جب، بحر سفر، سیدِ عالم نکلے
سر جھکائے ہوئے با دیدۂ پُرنم نکلے''

کا اس وقت پورا احساس ہوا تھا جب ہمارا خاندان خود ہجرت کے لیے گھر سے نکل پڑا تھا اور کئی دن، کئی ریلوے اسٹیشنوں پر بنجاروں کی طرح پڑا رہا تھا۔عجیب کیفیت کے دن تھے، وہ بھی!

☆ کچھ تفصیل ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی بتلایئے خاص کر اپنے احساسات وجذبات کے حوالے سے؟

☆☆ چوں کہ ابتدائی دنوں سے ہی پاکستان کے لفظ سے یک گونہ محبّت سی ہوگئی تھی، اور ہم یہ سوچا کرتے تھے کہ شاید یہ دل کی تمنّا دل ہی میں رہ جائے گی؛ کہ پاکستان بنے گا بھی یا نہیں۔مگر ایک دن جب اسکول میں مٹھائی تقسیم ہوئی کہ ''بھارت ورش سوتنتر'' ہوگیا ہے، تو ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ پاکستان بھی بن گیا ہے۔مگر شام کو گھر پر بڑوں کو بات کرتے سنا کہ ایک دن قبل پاکستان بن گیا ہے۔یہ سن کر جو مسرت ہوئی تھی اس کو بیان نہیں کرسکتا۔میں خوش تھا کہ پاکستان بن گیا ہے۔اور ہوسکتا ہے کہ ہمارے والدین وہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیں۔

الہ آباد شہر میں پاکستانی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے سکھ مسلمانوں کے خلاف جذبات بھڑکانے کے لیے گرونانک کی گدّی کا جلوس اٹھاتے اور مار کاٹ کرتے تھے۔ہمارے کئی جاننے والے مارے گئے تھے۔تین برس اس اذیّت میں گزرے۔پھر ہمارے والدین نے ہجرت کا ارادہ کرلیا۔ ہماری نظریں جان بچانے اور ایک بہتر مستقبل کی متلاشی تھیں۔بالخصوص اس لیے اور بھی کہ اس وقت ہندوستان میں خوف محسوس ہونے لگا تھا۔زمیں داری پر رعایا کی نظریں بدلی بدلی سی تھیں۔ گاؤں کی پنچائت نے ہماری رعایا (چماروں) کو ہماری خواتین کی ڈولی اٹھانے کی ممانعت کردی تھی۔ہماری زمیں داری شہر سے صرف چھ میل دور گنگا کے اس پار تھی جہاں مرد گھوڑے پر اور خواتین ڈولی میں جاتی تھیں اس لیے کہ راستے میں تین میل تک کچھار پڑتا تھا، اور وہاں سواری کا کوئی دوسرا انتظام نہیں تھا۔ہم لوگ شہر میں رہتے تھے مگر اسکول کی تعطیل کے دوران گاؤں چلے جاتے تھے۔اور اب گاؤں جانا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ہم کیسے بچے اور کیسے پاکستان پہنچے اس کے لیے پوری کتاب درکار ہوگی۔ ہاں اتنا

ضرور کہوں گا کہ جب ہم بحر سفر نکلے تب مجھے میر انیس کے مصرعوں کی کیفیت کا بہتر اندازہ ہوا تھا۔

☆ تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں ہوئی مہاجرین کی آمد کا سلسلہ ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔بعض حضرات تاخیر سے آنے والوں پر طرح طرح کے الزامات لگایا کرتے ہیں جن میں مالی منفعت نمایاں ہے؟

☆☆ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہر زمانے میں ہر طرح کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ کیا ہمارے ملک کے لوگ سب بہت ایمان دار ہیں؟ بالخصوص اشرافیہ سے متعلق لوگ تو اس سے کئی ہزار گُنا زیادہ بدعنوان ہیں۔ایسے بدعنوان اور بدکردار لوگوں کے منہ سے اس قسم کی باتیں کرنا مضحکہ خیز ہے کہ نہیں؟ کم از کم میرے جاننے والوں میں تو مجھے ایسا کوئی نہیں ملا جس نے جھوٹا کلیم کیا ہو۔

☆ نویں جماعت کے طالب علم کو ستر روپے ماہوار نوکری ملنے کے بعد پہلی تنخواہ کے موقع پر خطیر رقم (اُس زمانے کے لحاظ سے) ہاتھ میں آنے کے بعد کیا احساسات تھے؟

☆☆ پاکستان ہجرت کرنے کے دو برس کے اندر ہی ہندوستان سے، ساتھ لایا ہوا سرمایہ ختم ہو گیا تھا اور کسی آمدنی کی توقع نہیں رہی تھی تو، سب سے بڑے بیٹے ہونے کے باعث مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔روایتی تعلیم جاری رکھنے کے لیے بھی سرمایہ نہیں تھا۔والد کو گلے کا سرطان ہو گیا تھا۔ان کا علاج بھی لشٹم پشٹم چل رہا تھا۔اس زمانے میں سرکاری ملازمت میں لوئر ڈویژن کلرک کو ایک سو دس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔اور آپ جانتے ہیں کہ نجی شعبے کے مقابلے میں سرکاری ملازمت میں تنخواہ بس واجبی ہی ہوا کرتی تھی۔رشوت حرام اور اس کا لینے والا جہنمی تھا۔ہمیں احساس ہوا تھا کہ چلو کچھ تو ذریعۂ آمدنی پیدا ہوا۔اور جستجو تھی کہ اس کو اور کس طرح بہتر بنایا جائے۔لہٰذا میں نے کل وقتی ملازمت کے ساتھ دو عدد جز وقتی ملازمتیں بھی کی تھیں۔پنجاب یونی ورسٹی سے پرائیویٹ میٹرک کے بعد ایک بہتر ملازمت مل گئی جس میں تنخواہ ایک سو دس روپے تھی۔پھر پانچ برس بعد جو ملازمت ملی اس میں تنخواہ ایک سو پچھتّر روپے ہو گئی تھی۔ساتھ ہی جز وقتی ملازمت جاری تھی۔اس طرح حالات میں بہتری آتی گئی۔بس یہ افسوس تھا کہ اس جدوجہد کے دوران والد کا انتقال ہو گیا تھا۔

میری والدہ نے ہمیں صحیح راستے پر لگائے رکھا، بھٹکنے نہیں دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہندوستان میں ہی وہ میرے والد سے بحث کیا کرتی تھیں کہ میں اپنی اولاد کو تعلیم حاصل کرنے ولایت (انگلستان) بھیجوں گی۔اور خدا کے فضل سے، باوجود ہجرت، عسرت اور مشکلات کے وہی ہوا جو وہ چاہتی تھیں۔وہ خود بھی بیس برس انگلستان میں میرے ساتھ رہیں، اور انھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنی پہلی نسل کو سوئٹزر لینڈ میں اور دوسری نسل کو بھی کیمبرج میں پڑھتے دیکھ لیا تھا۔اسی وجہ سے میں نے ایک شعر لکھا تھا؛

مشعلِ جاں لے کے مجھ کو راہ دکھلاتی رہی
اور مائیں ہوں گی سایہ، میری ماں ہے روشنی

میں نے ان کے انتقال پر ایک نوحہ بھی لکھا تھا جو شاید میری کتاب ''موتی موتی رنگ'' میں ''بیٹے کا نوحہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

☆ A.E.C.L کس چیز کا مخفف ہے نیز یہ کہ آپ نے یہ ڈپلومہ اپنی مرضی سے کیا یا حالات کے زیرِ اثر آپ کو ایسا کرنا پڑا۔

☆☆ یہ مخفف دراصل ACII ہے۔لندن میں قائم چارٹرڈ انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے Chartered Insurance Institute , Associateship کا، جو انشورنس کی اعلیٰ تعلیم میں عام زبان میں گریجویشن کا مرحلہ تھا۔اسکی تعلیم میں پرائیویٹ طلبا کی طرح کتابیں پڑھ کر امتحان دیا جاتا تھا جس کے پرچے مہر شدہ ڈاک سے لندن سے آتے تھے، اور ان کے حل بھی لندن ہی بھیجے جاتے تھے۔اس زمانے میں نقل اور جعل سازی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔میں نے تعلیم کا یہ راستہ اس لیے اپنایا تھا کہ ملازمت بھی ضروری تھی، اور تعلیم بھی۔کالج یا یونی ورسٹی کی تعلیم کے مقابلے میں اس میں فائدہ یہ تھا کہ جوں جوں پرچے ہوتے جاتے تھے، ہر پرچے میں کامیابی سے تنخواہ فوری طور پر بڑھ جایا کرتی تھی۔تین تین پرچوں کے حصے ہوتے تھے، اور سال میں ایک بار اپریل کے مہینے میں امتحان ہوا کرتے تھے۔میں نے، پہلی ہی کوشش میں پہلا مرحلہ عبور کر لیا تو سالانہ اضافے کے علاوہ امتحان میں کامیابی کا بھی ماہانہ اضافہ ہو گیا۔جس سے آمدنی معقول ہو گئی تھی۔ای ایف یو لائف میں آنے کے بعد بھی، جب میں جنرل منیجر تھا، میں نے ISO-9000 کے قوانین کو اپنی کمپنی میں رائج کیا، اور اسی دوران میں نے ایک فرانسیسی ادارے سے ISO-9000 کے Lead Auditor کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔

☆ یہی سوال انشورنس کے شعبہ کی مناسبت سے کیا جائے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ : انگریزی کا محارہ ہے beggers can't be choosers۔ جو ملازمت پہلے مل گئی اسی کو ثابت قدمی سے اختیار کیا، اور اقبال کی نصیحت

پیوستہ رہ شجر سے امید، بہار رکھ

پر عمل کیا۔خدا کا شکر ہے کہ اسی پیشے میں، جس میں ایک جونیر کلرک بھرتی ہوا تھا، Chief Executive کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوا۔شکریہ علامہ صاحب آپ کی نصیحت کا!

☆ کچھ تفصیل ڈھاکہ کے روز و شب بلخصوص محمد پور میں گذرے تین روز کی بتلایئے؟

☆☆ ڈھاکہ جانے سے قبل نومبر ۱۹۶۴ء سے مارچ ۱۹۶۵ء تک میں سوئٹزر لینڈ کے شہر زیورخ میں انشورنس کی تعلیم وتربیت کے لیے مقیم رہا تھا۔یہ میرا

یورپ کا پہلا سفر تھا۔سوئٹزر لینڈ نہایت خوب صورت ملک اور زیورخ نہایت خوب صورت شہر تھا۔ وہاں سے واپسی کے تین ماہ بعد ہی مجھے ڈھاکہ کا سفر درپیش تھا، جو۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کہ وجہ سے ہوا تھا۔ ڈھاکہ کا زیورخ سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا تھا مگر ڈھاکہ کا پانچ ماہ کا قیام میرے لیے واقعی بہت لُطف انگیز تھا۔ بعد میں ایک بار پھر (۱۹۷۰ء میں) ملازمت کے سلسلے میں میرا ڈھاکہ تبادلہ ہوا تھا۔مگر اس بار حالات بہت خراب تھے۔محمد پور میں،نور جہاں اسٹریٹ پر ہم نے کرائے پر مکان لیا تھا۔شادی ہو چکی تھی۔جس جہاز سے بھٹو صاحب مجیب الرحمان صاحب سے مذاکرات کے لیے ڈھاکہ گئے تھے،اس پر میری بیوی بھی سوار تھیں۔ابھی مشکل سے مہینہ ہی گزرا تھا کہ وہ واقعہ ہوا جس میں بھٹو نے ڈھاکہ جانے والے ممبرانِ اسمبلی کی ٹانگیں تڑوادینے کی دھمکی دی تھی،جس کے ردِّعمل میں ڈھاکہ میں فسادات پھوٹ پڑے تھے۔اتفاق سے میں اسی جگہ پر موجود تھا جہاں سے فساد کی ابتدا ہوئی تھی۔اس دن ڈھاکہ اسٹیڈیم میں کرکٹ ٹیسٹ میچ ہورہا تھا، اور میں وہاں گیا ہوا تھا۔فساد شروع ہوا تو میں جان بچا کر گھر بھاگا۔اس وقت کے بعد سے شہر میں قتلِ عام جاری تھا،جس میں مغربی پاکستانی مارے جارہے تھے۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن محمد پور میں فوج داخل ہوئی تو جان میں جان آئی تھی۔حالات بہت خراب تھے،اس لیے ہم نے کراچی واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ بڑی مشکل سے جان بچاتے ڈھاکہ ایئر پورٹ پہنچے۔ وہاں، شہر سے بھاگ بھاگ کر لوگ جمع ہو گئے تھے۔بس ایک پرواز آتی تھی،اور جتنے اس میں سما سکتے تھے، چلے جاتے تھے۔تین دن بعد ہم میاں بیوی کی باری آئی۔ان تین دنوں ہم ایر پورٹ پر ہی زمین پر سوتے تھے۔شہر میں مارکاٹ جاری تھی۔ہمارے کئی جاننے والے بہاری مارے گئے تھے۔خدا کا شکر ہے کہ ہماری جان بچ گئی تھی۔یہ بھی اتفاق ہے کہ ہمیں جس جہاز میں کراچی جانے کی جگہ ملی اس پر کراچی سے جنرل ٹِکا خان حالات سدھارنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

☆ بھٹو صاحب کے زمانے میں انشورنس اور دیگر مالیاتی شعبے قومیانے کے اثرات کی بابت آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ یہ فیصلہ سیاسی مقاصد کے لیے کیا گیا،ملکی مفاد کے لیے نہیں۔وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ فیصلہ غلط تھا۔ بعد میں خود پیپلز پارٹی ہی نے نجی شعبے میں انشورنس اور بینکوں کی اجازت دی اور یہ ادارے پھل پھول رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس میں شامل تھا، کہ قومی ملکیت میں لیے جانے کے دوران مرکزی حکومت نے مجھے اس وقت تک کے لیے ایک کمپنی کا ٹرسٹی بنا دیا تھا، جب تک اسٹیٹ لائف کی تشکیل نہیں ہو گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بھٹو کا یہ عمل قومی مفادات کے خلاف تھا۔ملکی مفادات کو ذاتی یا سیاسی مفادات پر ہمیشہ فوقیت ہونی چاہیے۔

☆ روشن علی بھیم جی سے تعارف اور تعلق کا احوال جاننا بھی لازمی ہے؟

☆☆ : روشن علی بھیم جی سے میرا تعارف اس وقت ہوا تھا جب ۱۹۷۵ء میں ہندوستان میں انشورنس کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا، اور انھیں پاکستان میں کام کرنے والی ہندوستانی انشورنس کمپنیوں کی شاخوں کو لائف انشورنس آف انڈیا میں ضم کرنے کے فرائض سونپے گئے۔میں اس زمانے میں ہندوستان کی سب سے بڑی لائف انشورنس کمپنی کی کراچی شاخ میں ملازمت کرتا تھا اور وہیں میرا بھیم جی صاحب سے تعارف ہوا تھا۔بھیم جی صاحب مجھے پسند کرتے تھے، بالخصوص میری لائف انڈر رائٹر کی ہنرمندی کی وجہ سے۔اسی وجہ سے جب ای ایف یو لائف کی نجی شعبے میں دوبارہ تشکیل ہوئی تو انھوں نے مجھے ای ایف یو میں شامل ہونے پر راضی کیا تھا۔

☆ E.F.U بقول آپ کے صرف تین کروڑ روپے سے شروع ہو کر ملک کی بہترین بیمہ کمپنی کیسے بن گئی اور آج اس کمپنی کے کُل اساسوں کی مالیت کیا ہے اور اس کامیابی میں آپ کا کس قدر حصہ ہے؟

☆☆ قرینے سے چلائی جائیں تو لائف انشورنس کمپنیاں تیزی سے ترقی کرتی ہیں۔ہم (یعنی میں اور طاہر ساچک) دونوں انگلستان میں ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ساچک صاحب ای ایف یو لائف کے منیجنگ ڈائریکٹر بن کر آئے تو زبردستی مجھے بھی گھسیٹ لائے تھے۔قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد سے یہ شعبہ جدید خطوط پر ترقی نہیں کر پا رہا تھا، اس لیے کہ اس کی انتظامیہ پر سرکاری افسران قابض ہو گئے تھے۔ظاہر ہے کہ سرکاری افسران کی کارکردگی کا انداز نجی شعبے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔اس لئے ہم دونوں نے سوچا کہ ہمیں نجی شعبے میں نہ صرف جدید انتظامی طریقے متعارف کرانے چاہئیں بلکہ جدید قسم کی پالیسیاں بھی پیش کرنی چاہئیں، جن کا پہلے اس ملک میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ہم نے ای ایف یو لائف کو جدید خطوط پر استوار کیا، جدید پالیسیاں شروع کیں۔ہم لوگوں نے تکنیکی، مالیاتی، سیلز اور خدمات کے جو طریقے متعارف کرائے تھے ان سے پالیسی لینے والوں کا اعتماد بڑھا، ان کو بہتر فوائد اور معیاری خدمات ملیں اس لیے کمپنی نے تیزی سے ترقی کی اور ای ایف یو لائف نجی شعبے میں اوّل درجے کی کمپنی بن گئی۔اس سے زیادہ ہماری کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہمارے متعارف کرائے گئے طریقے ہی اب انشورنس کے سرکاری قوانین بنا دیے گئے ہیں۔

ای ایف یو لائف کے اثاثے بیس ارب روپے سے تجاوز کر گئے ہیں۔میں اس کی انتظامیہ کے تکنیکی شعبے کا ڈائرکٹر تھا۔ہم نے ایک سادہ کاغذ سے کمپنی کی ابتدا کی تھی۔مجھے انشورنس کمپنی قائم کرنے اور کمپیوٹر سسٹم بنانے کا برطانیہ کا طویل تجربہ تھا۔سو، ہم نے برطانیہ سے بہتر سسٹم بنایا، ۲۴ گھنٹے میں پالیسی جاری کرنی شروع، اور بے شمار نئے طریقے ایجاد کیے۔ان ہی وجوہ کی بنا پر کمپنی نے تیزی سے ترقی کی، اور اب اس مقام پر پہنچ گئی ہے۔ہماری دیکھا دیکھی اسٹیٹ لائف نے بھی اپنے اندازِ کار میں خاصی تبدیلیاں کی ہیں۔دوسری کمپنیوں نے بھی وہی طریقے اختیار کیے ہیں جو ہم نے اس ملک میں رائج کیے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان میں انشورنس ایجنٹ کا پیشہ کمتر درجے کا سمجھا

جاتا تھا۔ہم نے اس پیشے کوعزّت دی ہے۔ہم نے طے کیا تھا کہ گریجویٹ سے کم کسی کونہیں رکھیں گے،۔اور ہر ایک کوٹائی اور پتلون پہننی پڑے گی۔ پہلے تو لوگ منھ بناتے تھے مگراب تو ایم۔بی۔اے حتیٰ کہ ڈاکٹر لوگ بھی سیلز کے طور پر کام کر رہے ہیں۔تعلیم یافتہ اور بڑے گھرانے کی لڑکیاں بھی اعلیٰ درجے کے کام کررہی ہی۔اچھا کام کرنے والوں کوملکوں ملکوں تفریح کے لیے لے جایا جاتا ہے۔آج یہ پیشہ ایجنٹ نہیں مالیاتی مشیر کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ ہماری کمپنی میں اس وقت ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مالیاتی مشیر کام کرتے ہیں،جن میں کم سے کم ایک ہزار ایسے ہیں جن کی آمدنی دولاکھ روپے ماہانہ سے زیادہ ہے۔اس لیے اب اس پیشے میں جوق درجوق پڑھے لکھے لوگ شامل ہورہے ہیں۔

ای ایف یولائف کی کامیابی کے بعد ای ایف یوگروپ نے یورپ کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی Allianz کے تعاون سے بیمۂ صحت کی علاحدہ کمپنی Allianz-EFU Health Insurance بنائی، جو پاکستان میں پہلی بار ہوا ہے۔ مجھے پانچ برس تک اس کی سربراہی (CEO) کے فرائض انجام دینے پر مامور کیا گیا تھا۔اب ای ایف یوگروپ نجی شعبے میں پاکستان کا سب سے بڑا انشورنس کا ادارہ بن گیا ہے۔

☆ ''راوی'' اخبار کے تحت مشاعرے میں شرکت کا محرک کیا تھا اور آج مشاعروں کی نسبت آپ کی رائے کیا ہے؟

☆☆ میں عوامی مشاعروں کا کبھی قائل نہیں ہوا۔ مشاعروں میں پیش کیے جانے والے کلام میں جدّت یا تجربے نہیں کیے جاسکتے۔عوامی مذاق کا کلام پڑھنا مجبوری ہوتا ہے،اس لیے میں مشاعروں سے پرہیز کرتا ہوں۔نجی محفلیں شعر سننے اور سنانے کے لیے بہترین ہوتی ہیں، جہاں شعر کو سمجھ کر داد دی جاتی ہے۔آج کل تو مشاعرے خواتین، گلے بازی،اور مزاح کے بغیر ہو ہی نہیں سکتے۔ایسے مشاعروں میں اگر کوئی نئے انداز کا کلام پیش کرے گا تو اس کو مایوسی ہوگی۔''راوی'' کے مشاعرے میں میرے دوست احمد رشید کے اصرار پر میں نے شرکت کی تھی۔اس کے بعد برطانیہ کے کچھ مشاعروں میں مجبوراً جانا پڑتا تھا۔ایک بار 'ایلیٹ کالج' کے ایک مشاعرے میں کراچی بلایا گیا تھا، میں انکار نہ کر سکا۔ پوری رات گزر گئی۔ مجھے چھ بجے صبح غزل سنانے کا موقع ملا تھا۔اس کے بعد سے میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ کبھی کسی عوامی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا۔

☆ شعرگوئی کا آغاز آپ نے خاصی تاخیر یعنی ۱۹۶۸ء میں کیا یقیناً اس عمل کا سہرا بھی کسی نہ کسی کے سرتو جاتا ہوگا؟

☆☆ چوں کہ میری ابتدائی زندگی بڑی کشاکش اور مشکلات میں گھری ہوئی تھی اس لیے شعر کہنے یا سننے کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔لہٰذا، جب پیشہ ورانہ زندگی کسی نہج پر آگئی تب اس جانب سنجیدگی سے توجہ دے سکا تھا۔اس میں کسی شخصیت کے سر سہرا نہیں بندھتا۔

☆ ہمارے معاشرے بلخصوص پڑھی لکھی سوسائٹی میں لفظ ''شاعر'' باعث عزت نہیں گردانا جاتا۔آپ جب بطور شاعر نمایاں ہوئے تو آپ کے کولیگ،احباب اور اہلِ خانہ کا ردِعمل کیا تھا؟

☆☆ اس کی وجہ دراصل یہ تھی،اور شاید اب بھی ہے، کہ شاعر لوگ کسی نہ کسی بہانے، حتیٰ کہ زبردستی اپنے شعر سنانے پر اصرار کر کے لوگوں کو پریشان کر دیتے ہیں۔ ہر کوئی جو تُک بندی بھی کرنے لگتا ہے شاعر ہونے کا اعلان کر دیتا ہے۔میں کبھی کسی کو اصرار کے باوجود بھی شعر نہیں سناتا، جب تک کہ کوئی باقاعدہ نجی محفل نہ ہو۔ایک دفعہ میں کسی کے گھر گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مشہور شاعر آگئے۔انھوں نے مجھے اپنے اشعار سنانا شروع کر دیے،اور مجھے اناڑی جان کر ساتھ ہی اس کے رموز بھی بتاتے جارہے تھے۔بہت دیر بعد جب صاحبِ خانہ بھی فارغ ہو کر آبیٹھے اور یہ سب دیکھا تو میرے حالِ زار پر مسکرانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کچھ اشعار سنائے۔اور جب ان شاعر صاحب نے اشعار کی خوب تعریف کی تو انھوں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر یہ اشعار ان صاحب کے ہیں جو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، انھیں شرمندہ کر دیا تھا۔انھوں نے خجالت دور کرنے کی خاطر مجھ سے اشعار سنانے کی فرمائش کی مگر میں مسکرا کر بات ٹال گیا۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں تکنیکی طور پر آپ کی شاعری حال کی نسبت ماضی سے زیادہ قریب ہے؟

☆☆ : اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔لوگوں کا اپنا اپنا خیال ہوا کرتا ہے۔اتنا ضرور کہوں گا کہ شاعری تذکرۂ احوال ہو تو شاعری نہیں رہ جاتی۔

☆ ہاں! یہ بات لائق ستائش ہے کہ آپ کے ہاں ہجرت کے موضوع کو یاسیت کے بجائے اُمید کے ساتھ برتا گیا ہے مگر اس موضوع کے کثرت استعمال کے باعث بہت سے اہم موضوعات آپ کی توجہ سے محروم رہ گئے؟

☆☆ میں نے کبھی ارادتاً یا موضوعات پر شعر کہنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ کیفیت اور احساس ہی کی بنیاد پر اشعار ہوتے ہیں اور ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

☆ آپ کے ہاں پھول، پرندہ، ہوا، گرد، دریا، دھوپ اور برف کے تلازمے کی بہتات کس امر کی غماز ہے؟

☆☆ حسب ضرورت اور ترسیل خیال کے دوران جو لفظ، جو علامت، جو تلازمہ مناسب سمجھا ہے استعمال کیا ہے۔اس کے بارے میں لوگ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔

☆ پروفیسر علی فاطمی آپ کے شاعرانہ مزاج کو خالصتاً ''گنگا جمنی'' مزاج اور ماحول کا پروردہ بتاتے ہیں۔ پاکستان میں گذرے پینسٹھ برس کہاں گئے؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ ''گنگا جمنی'' سے ان کی مراد برصغیر اور یوپی علاقے کا امتزاج تھی، یا ہندی اور اردو زبانوں کا امتزاج تھا۔یہ تو وہی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے کن معنوں میں یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔آپ تو جانتے ہی

ہیں کہ جب کوئی زیور، کوئی برتن یا کوئی اور شے سونے اور چاندی دونوں کو یکجا کر کے بنائی جاتی ہے تو اس کو گنگا جمنی کہا جاتا ہے۔ شاید اس کہ وجہ یہ ہوتی ہے کہ گنگا کا پانی ہلکے مٹیالے رنگ کا اور جمنا کا دریا کی گہرائی کے باعث نیلے رنگ کا نظر آتا ہے۔ رہا پینسٹھ برس کا سوال تو یاد رہے کہ میں پچیس برس بعد پاکستان سے انگلستان چلا گیا تھا۔

☆ آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں جبکہ زیادہ پڑھے لکھے اہلِ قلم اردو غزل کو موجودہ زمانے کا مزاج شناس گرداننے سے گریزاں ہیں؟

☆☆ میرا خیال ہے کہ فارسی کے علاوہ کسی اور زبان میں غزل جیسی بو قلموں اور اتنی دل آویز صنف نہیں ملتی۔ میں عربی ادب سے زیادہ واقف نہیں۔ اس میں بھی غزل جیسی صنف پائی جاتی ہے مگر اسے تکنیک کے اعتبار ہی سے غزل کہا جا سکتا ہے مزاج کے اعتبار سے نہیں۔ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ اس موقع پر میر انیس کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

کیا کسی اور زبان میں اس قسم کے شعر کہے جا سکتے ہیں؟

☆ آپ جیسے جدت پسند اور جدت طراز شاعر پر رومان پسندی کا الزام کس حد تک مناسب ہے؟

☆☆ ہر انسان کسی نہ کسی وقت رومانوی ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شخص ہمیشہ رومان پسند ہی ہوتا ہے۔ شاید میرے کچھ رومانوی اشعار دیکھ کر یہ کہا گیا ہے۔ مجھ پر رومانوی شاعر کا لیبل لگانا مناسب نہیں۔

☆ اُستاد قمر جلالوی، یاور عباس، زیبا رودولوی، طالب جارچوی سے ملاقات اور صحبتوں کے احوال کے ساتھ اپنی شخصیت اور فن پر اُن کے اثرات بتلایئے؟

☆☆ ان میں کسی سے میری نہ ملاقاتیں رہی ہیں نہ مراسم۔ بس، ابتدائی دنوں میں ان کے اشعار اچھے لگتے تھے۔

☆ ناصر کاظمی، شکیب جلالی، منیر نیازی کے اثرات کا ذکر آپ کے لیے اعزاز ہے یا الزام؟

☆☆ ناصر کاظمی اور مصطفیٰ زیدی میرے ہم عصر پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ شکیب جلالی بھی اچھے شاعر تھے۔ منیر نیازی نے کبھی مجھے انسپائر نہیں کیا۔

☆ جمیل الدین عالی، ناصر شہزاد، ابنِ انشاء سے فیض کن معنوں میں؟

☆☆ یہ کہنا سہل انگاری کے زمرے میں آتا ہے۔ ہندی کے الفاظ کے استعمال کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں نے ان حضرات سے فیض حاصل کیا۔ ناصر شہزاد عام طور پر ہندی کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے دوہوں میں ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابنِ انشا نے بھی ہندی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میں نے بھی ہندی کے الفاظ بلکہ ہندی بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ اب کوئی اسے فیض کہے تو کہہ لے۔

☆ ناصر کاظمی، مصطفےٰ زیدی سے آپ کا ذہنی قرب کس قسم کا ہے اور آپ کے ہاں اُن کے اثرات کس شکل میں تلاش کیے جا سکتے ہیں؟

☆☆ اس کا جواب میں پہلے سوال میں دے چکا ہوں۔

☆ اردو شاعری کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے بعد غالب اور فیض کے اشعار اپنے نام سے سنانے والے رشید صاحب کی بابت آج آپ کس طرح کے احساسات رکھتے ہیں؟

☆☆ احمد رشید صاحب نہایت خوش طبع انسان ہیں، اور مزاح کے طور پر ایسا کیا کرتے تھے، سنجیدگی سے نہیں۔

☆ ۱۹۷۸ء میں آپ کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو پروفیسر عقیل رضوی نے فکر اور مشاہدہ کی گہرائی کی قلت کا ذکر کیا تھا۔ آج اس حوالے سے صورت حال کیا ہے؟

☆☆ عقیل صاحب نے قلّت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انھوں نے مستقبل کے لیے مشورے کے طور پر اور بزرگ کی حیثیت میں ایسا کہا تھا۔ عقیل صاحب میرے سگے ماموں ہیں۔

☆ پہلے مجموعے کی اشاعت انجمن ترقی ہند کے تعاون سے کس سبب ہوئی؟

☆☆ میرا پہلا شعری مجموعہ ''تازہ ہوا'' عاشور کاظمی صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے ادارے Third World Foundation کے زیرِ انتظام شائع کیا تھا۔ اس میں انجمن ترقی پسند مصنفینِ ہند کے کسی قسم کے تعاون کا کوئی دخل نہیں تھا۔

☆ لگے ہاتھوں کچھ تفصیل اپنی ترقی پسندی اور اس نظریے کی بابت آپ کی رائے کی بھی بیان ہونا چاہیے؟

☆☆ اس موضوع پر میں نے ایک مضمون ''چھوٹا منھ بڑی بات'' تحریر کیا تھا جو مقتدرہ قومی زبان کی شائع کردہ میری کتاب ''برقیات'' میں شامل ہے۔ میں ترقی پسندی کے اس انداز کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا جو ابتدا میں رائج ہو گیا تھا۔ اس تحریک میں ایسا ادب بھی لکھا جانے لگا تھا جو محض بیانیہ اور احتجاجی سطح کا ہوتا تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ ابتدائے آفرینش سے پوری کائنات ترقی پسندی کا مظہر رہی ہے۔ یہ ترقی نہیں تو اور کیا ہے کہ پتھر کے زمانے سے آج ہم انٹرنیٹ کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔ کائنات کی کوئی شئے تنزّلی پر مائل نہیں۔ ہر اچھا ادیب اور شاعر ترقی پسند ہوتا ہے۔ بس مجھے بنیادی طور پر ماسکو کو قبلہ بنانے پر اعتراض رہا ہے۔ اب تو وہ قبلہ بھی ڈھے گیا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تحریک نے اردو ادب کی ثروت مندی میں اضافہ کیا ہے۔ اسے معنویت دی ہے، اور خصوصاً

غزل کو نئے مزاج سے آشنا کیا ہے۔

☆ پاکستان رائٹرگلڈ کے جلسوں میں شرکت کس جذبے اور احساس کے تحت کیا کرتے تھے اور آج اس عمل بلکہ تنظیم کے حوالے سے آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ کسی خاص مقصد یا احساس سے نہیں، بس ادب سننے کی خاطر جایا کرتا تھا۔اب اس کا کیا حال ہے مجھے، اس کے بارے کچھ علم نہیں۔

☆ نثر کے میدان میں آپ نے عاشور کاظمی کی کتاب ''سخن گسترانہ بات'' کا مقدمہ لکھ کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔فوری بعد ''الفریڈ نوبیل'' پر کام شروع کردیا۔اس حوالے سے کچھ تفصیل بتانا پسند کیجیے گا؟

☆☆ نثر کے میدان میں آنا ''سخن گسترانہ بات'' کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان اور ''ارتقا'' کتابی سلسلے کے روح رواں راحت سعید صاحب نے فرمائش کی تھی کہ لندن میں رہ کر اور معلومات کی فروانی میں اردو قارئین کے لیے کچھ کیا جانا چاہیے۔مزید، یہ کہ خود مجھے بھی الفریڈ نوبیل انعامات میں دلچسپی تھی۔سو، میں نے سوچا کہ اردو والوں کو بھی اس سے متعلق اطلاعات پہنچانی چاہیے۔الفریڈ نوبیل کی زندگی اور کام پر جو کتاب میں نے لکھی تھی اس کو امجد اسلام امجد نے اردو سائنس بورڈ لاہور سے شائع کیا تھا، جب وہ اس کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔اس کتاب کی بڑے دھوم دھام سے اسلام آباد میں تقریب ہوئی تھی جس کی صدارت ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب نے کی تھی اور سویڈن کے سفیر اس تقریب کے مہمان، خصوصی تھے۔اس کے بعد رسا چغتائی کے مصرعے

پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

کی مصداق کتابوں پر کتابیں آتی گئیں۔

☆ انشورنس بظاہر حساب کتاب کا شعبہ ہے آپ کی دلچسپی سائنس تک محیط کیونکر ہوئی؟

☆☆ بچپن ہی سے مجھے مظاہر قدرت میں دلچسپی رہی ہے۔میں نے ہر شئے کو ہمیشہ تجزیاتی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے میرے ذہن میں تجسس کی عادت ہے۔ہر شے کی صناعی اور اس کہ وجہِ تخلیق پر غور کرنا میرا مشغلہ ہے۔لائف انشورنس میرے پیشے کا مرکزی شعبہ رہا ہے۔چوں کہ میرا کارِ منصبی مرضیات اور مرضیاتی تفتیش (pathology) اور پالیسی کی قیمت کے تعین سے متعلق رہا ہے اس لیے فعلیات و ادویہ جات (physiology & medicine) کا وسیع اور مسلسل مطالعہ میری ضرورت بھی تھی اور عادت بھی۔اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں سائنسی شعبے اہم ترین شعبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مسلسل سائنسی موضوعات کا مطالعہ میرا مشغلہ بن چکا ہے۔

☆ جنرل سائنس کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔جنیٹک سائنس تو خالصتاً تکنیک اور مہارت کا کام ہے اس جانب آپ کی توجہ اور انہماک قدرے حیران کُن ہے؟

☆☆ جی ہاں! جینیاتی سائنس میں میری دلچسپی اس وقت زیادہ ہوگئی تھی تھی جب ۲۰۰۰ء میں Human Genome کا غلغلہ بلند ہوا تھا، کہ انسان نے سائنس کے رموزِ حیات کا مطالعہ مکمل کرلیا ہے، اور اب جین کی پہچان اور اس کے ذریعے علاج سے نہ صرف بیماریوں کا صفایا ہو سکے گا بلکہ جین کی الٹ پھیر سے تخلیقات میں تبدیلیاں بھی ممکن ہو سکیں گی۔میں نے اس وقت سے بہت پہلے (۱۹۸۰ء) میں ایک پوری غزل لکھی تھی جو تازہ ہوا میں شامل ہے:

اُگے نہ موت زمین پر تو اور کیا ہوگا
کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں
سوادِ جہل کے زنداں میں قید ہو گا خدا
بنائے جائیں گے انسان کارخانوں میں

اور جب ۲۰۰۰ء میں کتابِ زیست (Human Genome) کا مطالعہ مکمل کرلیا گیا تھا تو میں ایک شعر لکھا تھا:

کتابِ زیست کے سب حرف پڑھ لیے اس نے
میں اپنے آپ کو اب ڈرتے ڈرتے دیکھتا ہوں

☆ اوّل کمپیوٹر سے آپ کی دلچسپی کے اسباب دوئم مصنوعی ذہانت کے حوالے سے فاروقی صاحب نے آپ کی زبان کو دشوار کیوں گردانا ہے جبکہ آپ کی شاعری سے اس طرح کا تاثر ہرگز نہیں ملتا؟

☆☆ مصنوعی ذہانت میں مجھے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔جب میں نے Alan Turing کے Turing Test کا مطالعہ کیا تھا جس میں ٹیورنگ نے ایک کمرے میں ایک کمپیوٹر اور دوسرے کمرے میں ایک انسان کو بٹھا کر سوالات کیے تھے اور ان کے جوابات کا تجزیہ کیا تھا کہ ان میں سے کون سا جواب انسان کا تھا اور کون سا کمپیوٹر کا تھا۔یہ واقعہ میری نظر سے اس وقت گزرا تھا جب میں زیورخ میں پڑھ رہا تھا۔اس وقت انٹرنیٹ نہیں تھا، اس لیے کتابیں تلاش کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا ہی واحد طریقہ تھا۔اسی طرح میں نے نوبیل کے حالاتِ زندگی وغیرہ پر کتاب لکھنے میں کتابوں کی تلاش اور مطالعے کیے تھے۔جب آپ کو ادق سائنسی موضوعات پر لکھنا ہو، اور اس زبان میں لکھنا ہو جس میں سائنسی اصطلاحات کے تراجم نہ موجود ہوں اور نہ رائج، تو لکھنے والا کیا کرسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ اوّل اوّل تو زبان مشکل ہی لگے گی۔

☆ آپ نے نوبل انعام یافتہ جن مصنفین کے خطبات جمع کئے اُن کے کوائف اُس وقت دستیاب نہ تھے ذرا اس واقعہ کی تفصیل سے قارئین کو آگاہ کیجیے؟

☆☆ جی ہاں! اس وقت انٹرنیٹ پر سب کچھ موجود نہیں تھا۔میں نوبیل فاؤنڈیشن کو خط لکھ کر تفصیلات حاصل کرتا، ان سے متعلق کتب کی تلاش کرتا، ان کا مطالعہ کرتا اور ان میں سے اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرتا اور ان کا خلاصہ کرتا

تھا۔ یہ واقعی بہت مشکل کام تھا۔ اب میں خود پلٹ کر دیکھتا ہوں تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا۔

☆ کچھ روداد اُس اجازت نامے کی بھی بتلایئے جو آپ کو ان تراجم کو شائع کرنے کی غرض سے حاصل کرنا پڑا؟

☆☆ اس سلسلے میں بھی میں نے نوبیل فاؤنڈیشن سے رابطہ کیا، ان کو اردو کی مفلسی کا احوال سنایا، اردو اشاعت کی مشکلات کا رونا رویا، اور یہ بھی واضح کیا کہ اس کام میں فائدے نہیں نقصانات ہی نقصانات ہیں۔ میری کوشش تھی کہ معاملہ مفت ہی میں طے ہو جائے مگر فاؤنڈیشن والوں نے بغیر فیس لیے اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ انھوں نے فیس کی رقم طے کرنے میں کچھ مروّت کی تھی۔ وہ لوگ الفریڈ نوبیل پر میرے کام اور اس کی شخصیت سے میرے لگاؤ کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

☆ افسانے کا انکوا آپ کے ہاں کب اور کس طور پھوٹا۔ اب تک کتنے افسانے ضبطِ تحریر میں آ چکے ہیں بلخصوص افسانوی سفر اور پہلے مجموعے کی اشاعت کی کہانی دلچسپ ہونا چاہیے؟

☆☆ میرا افسانوں کا مجموعہ ''آٹھواں رنگ'' تقریباً دو برس قبل ہی مکمل ہو گیا تھا، مگر اس کی اشاعت بہ وجوہ روک دی گئی تھی۔ جیسا کہ کسی مشہور بین الاقوامی ادیب نے لکھا تھا کہ ہر کہانی میں کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے، میری اس کتاب کی وجہِ تسمیہ بھی ایک دو واقعات ہی تھے جنھوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا، اور میں چاہتا تھا کہ ان کو دستاویزی صورت دی جائے۔ مگر دستاویز میں نہ فن کاری ہوتی ہے اور نہ عام مطالعے کی دلچسپی۔ اس لیے ان کے اطراف کہانی کی بُنت کی گئی۔ سو، میں نے دو افسانے لکھے۔ ان کے لکھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ یہ دونوں کہانیاں معقول ہو گئی تھیں، تو مزید آٹھ افسانے اور لکھے۔ اس طرح دوسو صفحات کا یہ مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

☆ اس وقت آپ کی شخصیت کا ایک اور نیا رُخ ہمارے سامنے ہے یعنی مصوری اور خطاطی؟

☆☆ مصوری کا واقعہ یہ ہے کہ تقریباً سات برس قبل میں الہ آباد گیا تھا اور حسبِ معمول میں فاروقی صاحب سے ملاقات کے لیے بھی گیا اور ان کی کچھ تصویریں بھی بنائی تھیں۔ ان تصویروں میں سے ایک میں سے فاروقی صاحب کا ایک پورٹریٹ تیار کیا اور میں نے ان کو روانہ کیا جس کی تشریح بھی کی تھی، جس میں ان کے چہرے پر ماضی کی کامیابیوں کے باعث اطمینان، اور عقب میں نظر آنے والے پھولوں کو ان کے کارہائے نمایاں کی علامت کے طور پر بیان کیا تھا۔ شاید انھیں میری یہ بات پسند آئی تھی، اسی پر انھوں نے کہیں اس کا تذکرہ کر دیا ہے۔ خطاطی سے مجھے پسندیدگی کی حد تک دلچسپی ہے۔ چند برس قبل میں نے فاروقی صاحب، اور ہندوستان کے سابقہ وزیرِاعظم اندر کمار گجرال کو غالب کے منتخب اشعار اور ان پر بنائی گئی تصویروں پر مشتمل نہایت نفیس کیلنڈر بھیجا تھا۔ اندر کمار گجرال صاحب سے میری پہلی اور دوسری ملاقات لندن میں ہوئی تھی، اور تیسری بار اس وقت ہوئی جب میں دلّی گیا تھا۔ وہاں غالب اکادمی میں مجھے مغربی ممالک میں اردو پر ایک مذاکرے میں مقالہ پڑھنا تھا، اس کی صدارت گجرال صاحب نے کی تھی۔

میرے رابطے اور ملاقاتیں ہندوستان کے ایک اور سابقہ وزیرِ اعظم، جناب وی پی سنگھ (وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ) سے تھیں جو یو پی کی ایک ریاست کے راجا تھے۔ جس زمانے میں راجا صاحب نابالغ تھے، اور ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، اس وقت میرے والد ان کی ریاست میں منیجر تھے، اور انھوں نے نابالغ راجا صاحب کو ان کے اعزّہ کی سازشوں سے بچایا تھا جو اُن کی نابالغی کی بنیاد پر ریاست پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ میں ۲۰۰۵ میں جب ہندوستان گیا تھا تو پہلے راجا صاحب کو خط لکھا، اور ان سے ملاقات کی خواہش کی تھی۔ ان کا جواب آیا اور میرے والد کے حوالے سے مجھ سے ملنے کی خواہش بھی کی تھی۔ میں ملنے گیا تو وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ بہت دیر تک ماضی کی اور حال کی سیاست پر باتیں کرتے رہے۔ چائے سے تواضع بھی کی تھی۔ انھوں اپنی شاعری کا اردو ترجمہ جس میں انھوں نے اپنی نظموں کی مصوری بھی پیش کی تھی، مجھے عنایت کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ پاکستان ضرور آئیں گے۔ مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور دو برس بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

☆ آپ کی خواہش اور بار بار کی درخواست کے باوجود آپ کا ادارہ ریٹائرمنٹ پر راضی کیوں نہیں ہوتا؟ آپ نہیں سمجھتے کہ اس طرح آپ کا تخلیقی کام متاثر ہو رہا ہے؟

☆☆ چونکہ میں روزِ اوّل سے اس ادارے کی تشکیل میں شامل تھا، اور میری صحت، جسمانی اور ذہنی، اب بھی برقرار ہے اس لیے ادارے والے چاہتے ہیں کہ میں ان سے منسلک رہوں۔ ساچک صاحب تو ۱۹۸۴ء سے میرے ساتھی رہے ہیں۔ ان ہی کے اصرار پر میں اس میں شامل ہوں۔ مگر، اب میں صرف چھ ماہ کام کرتا ہوں: یعنی، چھ ہفتے لندن میں اپنے خاندان کے ساتھ، اور چھ ہفتے کراچی میں ای ایف یو کے ساتھ۔ اس طرح، پچھلے چار برس سے سال میں چار بار پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں۔ ویسے بھی، جب سے میں ای ایف یو سے منسلک ہوا ہوں پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں۔ دراصل، اب اس طرح مجھے فرصت کا وقت زیادہ ملتا ہے، اس لیے کہ تقریباً چھ ماہ کراچی میں تنہا رہتا ہوں۔

☆ کچھ تفصیل مستقبل کے منصوبے، خوابوں اور خواہشوں کی بابت بتلایئے؟

☆☆ میں اپنے کام کے منصوبوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، جب تک کہ وہ مکمل نہ ہو جائے۔ کام جاری ہے اور وقت آنے پر سب کے سامنے ہوگا۔ اچھے اچھے خواب دیکھتا ہوں، اور خواہشوں کا وہی معاملہ ہے کہ

''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے''

''خوشبو تیرے بدن کی''

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی
(الہ آباد، بھارت)

فکر ونظر کی نئی آ گہی نے اِدھر انسان کو پھر سے اپنی بدلتی ہوئی قدروں کی تلاش کی طرف متوجہ کیا ہے۔ نئے سائنسی حقائق جس طرح روز، ایک نیا انکشاف کرتے جاتے ہیں اُسی طرح، ذہنِ انسانی اپنے غم ونشاط، اپنے احساسِ جمال اور اپنے محسوسات کے لیے اظہار کے نئے طریقے دریافت کرتا جاتا ہے۔ کمپیوٹر اور روبوٹ کی برق رفتاری نے نہ صرف اس کی مشینی دنیا کو متزلزل کر دیا ہے بلکہ اس کی سوچ کے ادب اور ادراکِ خیال میں بھی ایسا محشرستان برپا کر رکھا ہے کہ شعروادب کی دنیا میں یہ صورت پہلے کہاں تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ آج سے کچھ دنوں پہلے تک غزل، جسے حالی سے لے کر ترقی پسندوں تک نے اردو شاعری کے دورِ ازل کا سرمایہ سمجھ رکھا تھا، دیکھتے دیکھتے اردو ادب کی دنیا پر پھر سے حاوی ہوگئی۔ روز، نت نئے انداز کی غزلیں، نئی گلاسری اور نئے انداز سے سوچتی ہوئی، ایوانِ غزل میں داخل ہوتی جارہی ہیں۔ یہ غزل کی یک بارگی بازآفرینی کیوں اور کیسے ہورہی ہے اور غزل روز نئے موڑ، نئے مسائل اور نئی گلاسری کیوں بدل رہی ہے، اس کا تجزیہ ہونا چاہیے۔ ایک بہت واضح موڑ اردو غزل میں اردو کے شعرائے مہجر کا ہے۔ وہ شاعر جو ہندوستان اور پاکستان سے نکل کر اطرافِ عالم میں پھیل گئے ہیں۔ جن کے ساتھ ان کا قدیم کلچر بھی ہے اور جدید بھی۔ ان میں وہ بھٹک بھی ہے جو انھیں لیے پھرتی ہے اور تجربوں وتہذیبِ غم کی نئی دنیا بھی جو ایسے تمام لوگوں کی اپنی دنیا ہے۔

باقر نقوی کا مجموعہ ''تازہ ہوا'' مجھے ملا تو غزل کی ایسی ہی دنیا ان کے اشعار میں مجھے نظر آنے لگی اور چونکہ میں ان کی جڑوں، ان کے منتقل ہوتے ہوئے ماحول، ان پر پڑی ہوئی تمام بپتا سے واقف تھا، اس لیے ان کے اشعار میں مجھے وہ تمام صورتیں سر جھکائے، سر اٹھائے اور متوحش و بے چین نظر آنے لگیں۔ میں پہلے سمجھا تھا کہ وہ اپنے گھر کے پرانے لوگوں کی طرح محض تفننِ طبع کے لیے شعر کہتے ہوں گے کہ محفل سازی بھی شاعری کی ایک منزل رہ چکی ہے۔ یہ ایک جملۂ معترضہ ہے مگر آج بھی مغرب میں محض ''تفننِ طبع'' کے دل دادہ موجود ہیں۔ ایسے خاصے بھولے بھالے لوگ برطانیہ، امریکا اور کنیڈا میں ہیں جو اردو شاعری کی حشر سامانیوں سے بے خبر ہیں اور جس تہذیب اور رنگِ شاعری کے دور میں انھوں نے ہجرت کی تھی، وہ سمجھتے ہیں کہ وہی تہذیب اور رنگِ شاعری آج بھی اردو شاعری کا غالب رنگ ہے اور اسی رنگ میں شعر کی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ مگر باقر نے ایسے سن وسال میں ہجرت کی تھی کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ اس وقت محفل سازی کی شاعری کیا تھی۔ ہاں، اس زندگی کی یاد ضرور باقی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ تجربہ بھی جو انھیں کھوکھراپار سے کھینچتا ہوا کراچی اور پھر لندن لے گیا۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو یہ شعری تجربہ کہاں سے آتا۔

حرکت میں ہے دنیا لیکن پتھر ہے
پتھر کے اندر رقصندہ ہم ہی تو ہیں

پیڑ کاٹے گئے، پھول روندے گئے بہتے دریاؤں پر بند باندھے گئے
جانے کتنے بسیرے اُجاڑے گئے تب بسائی گئی ہیں نئی بستیاں

کنبہ چھوڑا بستی چھوٹی جنگل ہو گئے ہم
جانا تیرے پیار میں کیسے پاگل ہو گئے ہم

باقر نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ وہ اپنے تجربات کو نالہ وفریاد کی طرح بیان نہ کریں۔ جو کچھ ان پر بیت گئی، اس کا مداوا کیا ہوسکتا ہے؟ پھر ہائے واویلا مچانے سے کیا؟ جو گھر لٹ گیا، جو زمین چھوٹ گئی، جو آم کے باغ اور چنے کے کھیت ان سے بچھڑ گئے انھیں کون واپس لاسکتا ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں اس تہذیب کیے ہوئے غم کی بازگشت ہے جو برداشت کر لینے کے بعد ایک ایجابی احتجاج کے ساتھ اُبھرتی ہے، جسے سنانا مقصود نہیں ہوتا مگر ''ہم نے بھی یہ کچھ برداشت کیا ہے۔ لوگو! تم سن کر کیا کروگے تاہم یہ ہمارا تجربہ، ظرف اور غم کو حرزِ جاں بنانے کا طریقہ دیکھو۔'' جیسا آہنگ اور اشارہ ان غزلوں میں بولتا سنائی دیتا ہے۔ تمام ہجرت کرنے والوں کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں یہ کیفیت ابھرتی ہے مگر باقر نے اسے دبا کر، جو اپنے الفاظ اور مصرعوں کے چہروں سے عیاں کرنے کی فکر کی ہے، وہ ان کی اپنی منفرد کوشش ہے۔ وہ کہیں vocal نہیں ہوتے اور نہ ''ہائے سب لٹ گیا۔ ہم بے گھر ہوگئے'' والا expression ملتا ہے۔

گھر سے نکلے تو یہ غم تھا بے گھر ہو گئے ہم
تیری بستی میں پہنچے تو پتھر ہو گئے ہم

جن پہ لٹکے ہوئے اک عمر گزاری ہم نے
ان صلیبوں پہ ذرا کوئی مسیحا چمکے

لوگ کوئی تصویر لیے پھرتے ہیں گلی گلی
ہم کو بھی وہ چہرہ کبھی دیکھا سا لگتا ہے

سوادِ شام میں گم ہوگئے چراغِ اُمید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

پھول ہم نے کبھی مانگے نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

خود بخود جل اٹھے یادوں کے دریچوں میں چراغ
رات پھر جاگ اٹھا درد پرانا دل کا

مگر باقرؔ نے کلاسیکی پابندیوں کا لحاظ رکھا ہے۔ خیالات اور الفاظ کی حدیں یقیناً پرانے رکھ رکھاؤ کو توڑ دیتی ہیں مگر، الفاظ کا دروبست، بحروں کی پابندی، الفاظ کے اعراب وہ اس طرح نہیں توڑتے جس طرح جدید اور بہت سے نئے شعرا، کچھ تو تجربوں کے لیے اور زیادہ تر ناواقفیت کے سبب، زبان کی شکست و ریخت کے عمل میں سرگرم ہیں اور اسے سراہتے بھی ہیں۔ زبان کے دائرے، اعراب و اصوات اگر زبان کے اصولوں کے ساتھ تبدیلی اور شکست و ریخت کی منزل سے گزریں اور یہ تبدیلی فطری ہو تو شعری زبان کا ارتقا ہوتا ہے مگر لاعلمی اور من مانی کیفیت، شاعری اور زبان، یہاں تک کہ شاعر کے فکری عمل کو بھی بے مصرف کر دیتی ہے۔ یہی صورت استعارات کی بھی ہے۔ نئی زندگی اپنے نئے استعارات اور علامتیں بنا سکتی ہے اور بناتی بھی ہے مگر اس عمل میں کسی بھی زبان کی شعری روایت کو یک قلم پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا اور تمام تلازمے اور استعارے شخصی طور پر اور isolation میں پیش نہیں کیے جا سکتے۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر ان کے منطقے (Spheres) اور اشاریت کو بدل سکتا ہے اور بدلتا بھی ہے۔ اس سے نئی معنوی وسعتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور نئے تلازموں کا صَرف بھی شاعری کی دنیا میں داخل ہوتا ہے مگر اس میں زبان کے مزاج، اس کی assimilation کی طاقت اور تمام تر حدود و توسیع کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ باقرؔ نے ہوا، پرندہ، پھول، گرد، دریا، دھوپ اور برف کو جس طرح تلازمۂ خیال کے لیے استعمال کیا ہے اس میں ہر لحظہ ایک نئی معنویت اور ماضی و حال کی زندگی کے ممکنات ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی غزلیں زبان و بیاں دونوں کی نئی معنوی تہیں ابھارتی جاتی ہیں۔

ہر دور کا شاعر اپنے دور کے آہنگ، فیشن اور آگہی کو کہاں چھوڑ سکتا ہے؟ کیوں کہ تمام تحریریں ایک وقت اور تاریخ کے ساتھ وجود میں آتی ہیں جن میں فیشن ادیب اور شاعری کو ڈھکاتا ہے۔ اگرچہ یہ فیشن کبھی کبھی بڑے دھوکے باز (Illusive) بھی ہوتے ہیں اور ضروری بھی نہیں کہ تاریخ اور وقت کی سچی حقیقتیں بھی ہوں مگر شاعر اور ادیب اس کی طرف کھنچتے ضرور ہیں۔ پھر سچی حقیقتیں اور تجربے بھی اب طبیعیات، مابعدالطبیعیات، ایٹمی تجربوں اور اِکسرے کی گہرائی سے آتی ہوئی تجرباتی زندگی سے آتے ہیں کہ کہاں کہاں ادیب یا شاعر تسلیم شدہ قدروں کے ساتھ چلے اور پھر کن مسلمات کی قدروں کے ساتھ روایت سے الگ بھی ہو جائے۔ اردو کی نئی شاعری میں کچھ لوگ نئے مسلمات اپنا کر اپنے طور پر الگ ہو بھی گئے مگر کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ جنھیں وہ نئے شعری مسلمات سمجھتے تھے، وہ ایجادِ بندہ اور محض لمحاتی دلچسپیوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ کچھ تذبذب میں بھی رہے مگر میرا خیال ہے کہ جنھوں نے زبان اور بیان کے کینڈے کو بدلا اور اس بدلنے میں فیشن کے ساتھ ساتھ اردو کی شعری روایت اور اس کے مزاج اور حرمت کا خیال رکھا ہے، انھوں نے اردو شاعری کے شعری ارتقا میں مدد کی ہے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا ماڈل ایسے شعرا کو بنایا ہے جو اگرچہ نئے تھے مگر اردو غزل کی شعری تحریم کا لحاظ کرتے رہے ہیں۔ باقرؔ کی غزلوں پر اپنی آواز کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی، شکیب جلالی اور کہیں کہیں منیر نیازی کی گہری چھاپ بھی نظر آتی ہے اور فیشن ان کا غزل کا نیا فیشن ہے۔ زبان کے معاملے میں وہ کبھی کبھی جمیل الدین عالی، ناصر شہزاد اور ابنِ انشا کی طرف بھی دیکھ لیتے ہیں مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوتی کہ وہ کلاسیکی رکھ رکھاؤ چھوڑ نہیں پاتے ہیں۔ یہی سب صورتیں باقرؔ کی غزل گوئی کا واضح نشان مجھے معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں وہ نئی شعری روایت بھی ہے اور مسلماتِ شاعری کی تحریم بھی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ اب باقرؔ کے کچھ منتخب اشعار دیکھیے:

ہے گیسوؤں کا فیض جو نم ہے گھٹاؤں میں
خوشبو ترے بدن کی گھلی ہے ہواؤں میں

مٹ کر ہوا جو اور تماشائے روزگار
میں وہ نوشتۂ ورقِ آبدیدہ ہوں

میں بھی ترے سپاس کا امیدوار ہوں
میرا بھی ایک تار ترے پیرہن میں ہے

ہم اپنے لیے آپ ہی بن جائیں گے سایہ
دیوار کے سایے پہ بھروسا نہ کریں گے

خوشبو تری گلی میں پریشاں ملی ہمیں
کیا پھر اُلجھ پڑا ترا آنچل ہوا کے ساتھ

روشن ہے کوئی بام، نہ شمعیں ہیں دروں میں
کیوں لوگ چھپے بیٹھے ہیں کاغذ کے گھروں میں

کیسا یہ شہر ہے کہ جو آباد ہے مگر
دیکھو بلندیوں سے تو صحرا دکھائے دے

کس کو چاہوں، کس سے بولوں، خول سے کیسے نکلوں
گھر کے اندر چپ کا جادو، باہر تیز ہوا ہے

باقرؔ جی خوش قسمت ہو تم کوہِ نور پہ بیٹھے ہو
چپ کی کالی جھیل میں دیکھو کتنے سخنور ڈوب گئے

سنا ہے اب کے برس برف گر رہی ہے بہت
تمھارے باغ کے سب پھول جل گئے ہوں گے

سوادِ شام میں گم ہوگئے چراغِ اُمید
نگاہِ وقت نے کیا حادثے غضب دیکھے

یہ سب تو ہے مگر باقرؔ میاں فکر میں تھوڑی اور گہرائی پیدا کرو، دل کو کچھ اور جلاؤ، تب داستانِ دل، اپنے وقت کی آواز میں بیان کرو۔ پھر دیکھو کہ تم کہاں ہو۔ اچھی شاعری، خودنگری اور خود احتسابی سے وجود میں آتی ہے، مشاعرے کی واہ واہ سے نہیں۔ مشاعرہ لوٹ کامیابیاں ادب کے میدان میں شاعر کو اکثر پیدل کر دیتی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ تم مشاعرہ لوٹ شاعر ہو اور تمھارا یہی ایک مجموعہ تمھیں ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہو۔ میں یہ بد دعا تمھیں نہیں دے سکتا۔

بقیہ: سائنس اور کائنات

1994ء میں ترتیب دی ہوئی Sir. J.M Templeton کی کتاب Evidence of Purpose میں اس موضوع کا اچھا احاطہ کیا گیا ہے اور سائنس داں خالقِ حقیقی کی تلاش میں جن منزلوں سے گزر رہے ہیں یا گزرے ہیں اس کا اچھا احوال اس کتاب میں مل جاتا ہے۔

آج ایک جانب سائنس اور ٹیکنالوجی اپنی سرحدوں کی تنظیمِ نو یا تعریفِ نو (Redefine) کر رہی ہے اور غضب کی پیش رفت ہو رہی ہے تو دوسری جانب، ہم علم و آگہی سے بیگانگی کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں اور حصولِ دولت کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور بھلا بیٹھے ہیں کہ علم ہی تو انسان کی میراث ہے۔ پھر بحیثیت مسلمان ہماری عبادات کے بعد بزرگ ترین عبادت حصولِ علم ہی ہونا چاہیے۔ علم و حکمت سے دوری اور بے اعتنائی نے ہی ہمیں پستی میں دھکیل دیا ہے۔ قومی اور ملی تعمیرِ نو کے لیے تو ہمیں اپنا رشتہ ہر صورت میں علم و حکمت، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہی جوڑنا پڑے گا۔ اس منزل کی جانب جانے والے راستے سے کوئی مختصر اور آسان بغلی راہ نہیں نکلتی۔ یہ سفر راست مگر دشوار گزار ہے۔ باقر نقوی کی یہ کتاب ''خلیے کی دنیا'' اسی سفر کی جانب ایک اشارہ ہے۔ مثبت، خوبصورت اور بامعنیٰ۔

بیٹے کا نوحہ

بعد تیرے میرے جینے کی دعا مانگے گا کون
رات بھر میرے سرھانے بیٹھ کر جاگے گا کون

اتنے دن کے بعد بھی تیرے لیے بچہ تھا میں
لڑکھڑاتا دیکھ کر میری طرف بھاگے گا کون

کون دے گا آگ کو اِسپند میرے نام کی
بارِ منّت کے علَم کی چوب پر ٹانگے گا کون

جب ستائے گی بہت مجھ کر زمستانی ہوا
اپنے بالوں سے دُلائی کو مری تاگے گا کون

کون ستّی ہوگا اب میرے دُکھوں کی آگ پر
درد کی دہلیز اب میرے لیے لانگے گا کون

سوگئی باقرؔ تری ماں خود اندھیری قبر میں
تیری راتوں کے لیے اب چاندنی مانگے گا کون

O

(باقر نقوی)

''انا کا پندار''

جمیل الدین عالی

(کراچی)

اردو غزل ان الزامات سے تو کبھی کی بری ہوچکی کہ وہ محض کلاسیکی روایات کی اسیر ہے... کہ وہ جدید حسیات مثلاً زوالیت کے خلاف احتجاج اورانقلابی کش مکش کواپنے سانچے میں رکھتے ہوئے بھرپور جمالیات کے ساتھ ظاہر نہیں کرسکتی۔فیض صاحب تو کلاسیکی لفظیات سے استفادہ کرتے ہوئے بھی بڑے بڑے معترضین کے منہ بند کرگئے ہیں،آج ایک پوری اور بڑی طاقتور قطار ہے ایسے غزل گویوں کی جومستندشعری جمالیات کے راستے بھی تغیر کی طرف بڑھتے اور بڑھاتے ہیں،اُن میں ''تازہ ہوا''، جولندن سے آرہی ہے، ایک چونکادینے والے اضافے کا تحفہ لارہی ہے۔

مجھ جیسے پرانے چاول کے لیے جوسکہ بند نقادبھی نہ ہوکسی ''نئے'' شاعر کے شعری مجموعے پررائے زنی بڑامشکل کام ہے۔شعر کے معاملے میں میرا تقریباً ہروقت رواں نثری قلم اپنی بے بضاعتی کے دباؤ سے کانپنے لگتا ہے، میری تربیت اور عادت آہ اور واہ کی اظہاری حدود سے گھٹی ہوئی ہے جن سے میں بڑے داخلی اور خارجی تقاضوں کے باوجود نکل نہیں پاتا۔شایداس لیے بھی مجھےاس وقت تک شعر پر''نقدونظر'' کواپنا ذیلی پیشہ یا شیوہ بنانے کی فرصت نہیں مل سکی ہے۔

سچ کہ ''تازہ ہوا'' ایک ذمہ دارانہ تبصرہ مانگتی ہے خواہ وہ فلیپ کی صورت میں کیوں نہ ہو۔اس کے وہ شعر جونمونے کے طور پر میری نظر سے گزرے(اور نہ جانے پورے مجموعے میں کیا کچھ ہو)ایک بڑے جان دار لہجے کی نشان دہی کرتے ہیں،سانچہ وہی قافیہ ردیف کچھ پرانی لفظیات بھی،مگر بیشتر مصرعے گرج گرج کراپنی زبان بولتے ہیں:

زمیں کی جنگ چھڑے گی اب آسمانوں میں

میں باقر نقوی سے معمولی سی بھی واقفیت کا دعویٰ یا اعتراف نہیں کرسکتا۔انھیں لندن میں ایک آدھ مرتبہ سناہوگا وہ بھی رواروی میں۔لیکن اُن کی جوغزلیں مجھ تک پہنچی ہیں انھیں ایک اہم احتجاجی شاعر ہی نہیں ایک بڑا امکان تسلیم کرنے پرمجبور کررہی ہیں(معذرت کہ میں شعرائے اردومقیم مغرب کی پی آر مہمات یا تنازعات میں شریک نہیں ہوا کرتا...تا حال مجھے وہاں روٹی کپڑا مکان...اور ایک شام...اُن کی مہربانی کے بغیر دوسرے احباب کی قدردانی سے مل جاتے ہیں۔یوں بھی ایسے موقعے پرکوئی صیغۂ مبالغہ استعمال کرنا ایک اچھے قاری کوشاعر کی طرف سے شبہے میں ڈال سکتا ہے)۔

آیئے شعروں کے انتخاب سے شاعر کی...اور چاہیں تو میرے دعوؤں کی...رسوائی یا پذیرائی ہوجائے۔بعض غزلیں مسلسل نہ ہونے کے باوجود وحدتِ تاثر کے سبب مسلسل لگتی ہیں،ان سے ایک دوشعر کا انتخاب نامناسب ہوگا مگراس وقت میرے لیے ناگزیر ہے۔

شہر کا لفظ پچھلے بیس برس میں اتنا مجروح کردیا گیا ہے کہ اس کی معنویت اور حیثیت بگڑ چکی ہے مگر باقر نقوی نے ایک پوری غزل کی ردیف میں لاکربھی زندہ وتازہ رکھا ہے۔

ناراض ہو کے رات کی پریاں کدھر گئیں
کیوں اِس قدر اُداس سویرا ہے شہر میں
یہ کیا ہوا کہ رنگ سے عاری ہوئے ہیں پھول
بے رنگ تتلیوں کا بسیرا ہے شہر میں
ہر جزر و مد کے ساتھ بدلتا ہے اپنا رُخ
جیسی ہوا ہے ویسا ہی دریا ہے شہر میں

اور کیا یہ شعر کسی بے بسی کا مظہر ہے؟ اے اہلِ ذوق یہ سب کا امتحان ہے۔دیکھو یہ بات کتنی دُور تک جاتی ہے:

کوئی پوچھے جو کبھی گھر تو اسے گھر کہہ لیں
اور ہم اِن در و دیوار سے کیا مانگتے ہیں

اس غزل میں ایک شعر تمام پرانی علامتوں کے باوجود ایک آہنگ ہوکراُبھرتا ہے۔پرانی لفظیات مضبوط ہاتھوں میں آکرتوانا ہوجاتی ہیں۔

کتنے بھولے ہیں ترے شہر کے زخمی پیکر
جو مسیحاؤں کے قاتل سے دوا مانگتے ہیں

فرازِ دار کا ایک مرکب فیضؔ اور مجروحؔ سے منسوب ہے۔باقر نقوی ان سے متاثر ہوا ہوگا(اور خود یہ حضرات بھی اپنے پیش رووں سے متاثر ہوئے تھے...اورکون اپنے پیش رووں سے متاثرنہیں ہوتا)لیکن ایک اصطلاح اپنی بنائی اس کی معنیاتی وسعت میں طبقاتی کش مکش کی کہانی واضح تر ہے۔

فرازِ عدل پہ حکام بے ادب دیکھے
گناہگار عجب، فیصلے عجب دیکھے

اس غزل میں ایک اور کہانی... جب کش مکشوں اور قربانیوں کو عارضی سہی بڑی بڑی دل دوز غیرمتوقع ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے... یہ داغ داغ اُجالا... پرانی اور تازہ کہانی...لیکن اپنی زبانی...

اگر ہمیں اسی مرکز پہ لوٹ آنا تھا
تو سارے خواب بھی کیا ہم نے بے سبب دیکھے

نہیں... میں اپنی بے بضاعتی اور کم فرصتی میں ایسے دکھوں میں ڈوبے ہوئے

غضب ناک اور تہ دار غزل گو پر کوئی تسلی بخش گفتگو نہیں کر سکتا۔ مجھے دوسرے کے بارے میں ژولیدہ بیانی، مبہم بے معنی یا ہم معنی expression پسند نہیں۔ سیدھی سادی زبان میں یہ شاعر مجھے انقلاب کا تجزیہ نگار...اور پُر اعتماد پیشین گو لگتا ہے۔ آنے والے ناگزیر کی طرف ڈھکی چھپی ایمائیت کے ساتھ نہیں (گو وہ بھی ایک بڑا مقام ہے) پوری قوت کے ساتھ طاقتور لفظوں کے پرچم ہلا ہلا کر اشارے کرتا ہے۔

اب کے نظر آتے ہیں عجب پیاسوں کے تیور
پانی نہ ملے گا تو پیالہ نہ رہے گا
بے کار زمینوں کو نگل جاتے ہیں جنگل
روکو گے مسافر کو تو رستہ نہ رہے گا

ہاں ایک پرانا چاول سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہی رہے گا، اتنے خراجِ تحسین کے ساتھ ایک اور بات کہنے کو جی چاہ رہا ہے...اگر باقر نقوی کے جواہرِ بیان لفظیاتی تہذیب و ترتیب کی خراد پر کچھ اور چھل جائیں تو زیادہ اچھے لگیں گے اور زیادہ کاٹ بھی کریں گے۔

اکثر شعرا کے لیے انگلستان کے قیام میں کئی خوبیاں بھی ہیں مگر ایک کمی بھی، وہ کمی رفتہ رفتہ پوری ہوتی جاتی ہے لیکن تا حال موجود ضرور ہے...اور وہ ہے خوش نیت فاضل اہلِ نظر کا مسلسل inter-action نہ ہونا۔ ایسا inter-action بالآخر ایک غیر محسوس مگر دُور رس خود تنقیدی کے مواقع اور ماحول فراہم کرتا رہتا ہے اور classy شعرا تو پاک و ہند، آ آ کر ایسی صحبتوں میں ایک لازمے کے طور پر وقت گزارتے رہے ہیں، باقر نقوی ایک classy شاعر ہونے کے بڑے امکان رکھتا ہے، نہ جانے اس کی کیا عمر ہے، کیا پیشہ ہے، وہ اپنے وطن میں کیوں نہیں رہتا...انگلستان میں اردو شاعری کم زور نہیں لیکن اگر وہاں مستقل رہنے والے اردو شعرا چند برس اور پاک و ہند کے اردو ماحول کے دریاؤں میں غوطے کھاتے رہیں تو بہت خوب صورت تیریں گے۔

ایک بار پھر چند شعر سامنے آتے ہیں اور باقر نقوی کے امکانات ہی نہیں (مجھے تو اتر استعمالِ ''امکانات'' پر کوئی افسوس نہیں) بلکہ اس کے ''منفرد'' کمالات بھی دکھاتے ہیں، تلخیوں، تنبیہوں، عزائم کا ایک دھارا ہے جو تیز بہہ بہہ کر پھیل رہا ہے:

اُگے نہ موت زمین پر تو اور کیا ہوگا
کہ بیج زہر کے بانٹے گئے کسانوں میں
کچھ اور تازہ رنگ بھروں کائنات میں
اے جذبۂ خیال نئے پر لگا مجھے
جاری ہو نغمہ حیات تارِ رباب کچھ تو بول
کب سے ہے منتظر بہار، میرے گلاب کچھ تو بول

یہ آدمی غزل میں انسانی جدوجہد کی تاریخ کیسی دل میں اُتر جانے والی اور حوصلہ بڑھانے والی تبلیغ کے ساتھ بیان کرتا ہے:

کمال پانیوں کا تھا کہ راستے بنا لیے
ندی کی راہ میں مہیب کوہسار کب نہ تھا

یہ آدمی کس چیلنج کے ساتھ میدان مانگتا ہے:

یہ کیا کہ اک اُڑان ہی میں کٹ گئیں مسافتیں
عطا کیے ہیں بال و پر تو ہم کو آسماں بھی دے

یہ آدمی غزل کی مخصوص جمالیات میں انقلاب کے آداب کس اعتماد، کس دانش کے ساتھ بناتا ہے۔

سبک سری میں بھی اندیشۂ ہوا رکھنا
سنگ اُٹھے ہو تو چلنے کا حوصلہ رکھنا

اور اس غزل میں دوسرے عجیب عجیب رنگ بھی ہیں۔ ہماری پرانی زبان میں کس قادرالکلامی کے ساتھ...کس قدر تلخ...کتنی سچائی کے ساتھ تلخ ہو جاتا ہے:

یہ زینتیں بھی عجب ہیں یہ سادگی بھی عجیب
ریا کے سارے ہنر جسم پر سجا رکھنا
نہ جانے کون سا کس وقت کام آ جائے
سو ایک جیب میں بت ایک میں خدا رکھنا

اور اس گلشن میں اوّلیت کس مطالبے کو دیتا ہے:

پھول ہم نے کبھی مانگے نہ صبا مانگتے ہیں
ہم تو جینے کے لیے تازہ ہوا مانگتے ہیں

اور اس جبر و جور پر کیسے سوال کرتا ہے، ایسے سوال ازل سے اب تک ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے سو اس نے بھی کیے...مگر اپنی زبان میں...اپنے طنطنے کے ساتھ:

تو خدا ہے تو ہمیں بھی ہے اَنا کا پندار
حق سمجھتے ہیں جو ہم تجھ سے دعا مانگتے ہیں
جسم پہ لگ رہے ہیں زخم نیزۂ اعتبار کے
اے مرے ہوش کچھ تو کہہ، اے مرے خواب کچھ تو بول
نہ جانے کب سے ہم پہ قرض ہے جنوں کی داستاں
سلیقۂ بیاں دیا تو اب ہمیں زباں بھی دے
لگاؤ دوستو دلوں میں ایسے آ گہی کی آگ
جو گرم جسم کو رکھے کبھی کبھی دھواں بھی دے

کاش جب یہ پوری کتاب آئے تو میں اس پر کچھ لکھ سکوں۔ ایسے کاٹ دار لہجے کا شاعر جب پورے قد و قامت کے ساتھ سامنے آ کر آواز لگاتا ہے تو...تو بڑے بڑے پہاڑ ہل جاتے ہیں۔ فی الحال تو میں ممنون ہوں عاشور کاظمی کا کہ باقر نقوی سے اتنا ہی تعارف کرا دیا۔

☆

''شجر کے نشاں''

سید عاشور کاظمی

(●)

بیساکھیوں کے ذکر سے یہ مراد قطعی نہیں کہ کتابوں پر جو دیباچے یا پیش لفظ لکھے جاتے ہیں، وہ سارے کے سارے بیساکھیاں ہوتے ہیں۔ کتابوں پر دیباچے یا پیش لفظ لکھنے کا رواج قدیم بھی ہے اور مستحسن بھی لیکن حیرت وہاں ہوتی ہے کہ ایک صحیح اور genuine لکھنے والے پر تعارف، پیش لفظ یا دیباچہ لکھنے کی مخلصانہ درخواست تو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی ہے اور ادبی نابالغوں کو حقیقی لکھنے والوں پر فوقیت دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کتابوں پر دیباچوں کا رواج اس لیے مستحسن ہے کہ بالغ نظر ناقدین کتاب میں شامل تخلیقات پر نظر ڈال کر اس کے محاسن پر روشنی ڈالیں تو اس سے لکھنے والے کا حوصلہ اور کتاب کا وقار بڑھتا ہے اور کم زوریوں کی نشان دہی (دیانت دارانہ تنقید، تنقیص نہیں) سے لکھنے والے کی رہنمائی ہوتی ہے۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ تجارت کے اس دور میں کچھ تاجروں نے مخلص اور بے لاگ تبصرہ یا نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کی آبرو کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اب آدمی کس کس کو بتائے کہ تجارت کے اس دور میں بھی پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر عقیل رضوی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، شوکت صدیقی اور ایسے بہت سے دانشور ہیں جو حرف کی تجارت نہیں کرتے۔ مذکورہ بالا اور انہیں کی طرح کے دوسرے صاحب الرائے اہلِ قلم کی عظمت اور احترام کے نام پر تجارت پیشہ بیساکھی فروش بزرگوں سے فی الحال بڑے ادب سے گزارش کی جاتی ہے کہ کم از کم مغرب میں آباد اردو کے قارئین کو ناسمجھ اور کور ذوق نہ سمجھیں۔ مغرب میں اردو کے قاری کے سامنے ان کے چہرے بھی بے نقاب ہیں اور ان کی بیساکھیوں کے خریداروں کے بھی۔ لہٰذا یہاں یہ دھاندلی اب زیادہ دیر نہیں چلے گی۔

باقر نقوی ایسا قلندر اور بے باک شاعر ہے کہ جس نے کبھی بیساکھیوں کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ وہ معذور و محتاج نہیں اور باقر کو اس کا ادراک بھی ہے۔ انہیں راتوں رات شہرت کی تمنا بھی نہیں۔ حقیقی فن کار شہرت یا گم نامی کے دائروں سے باہر رہ کر تخلیق کرتا ہے۔ باقر کو تو اس کی فکر بھی نہیں ہوتی کہ ان کی کتاب کب چھپے گی، کیسے چھپے گی یا نہیں چھپے گی۔

''تازہ ہوا'' کے پیش لفظ میں لکھ چکا ہوں کہ پروفیسر عقیل رضوی ویٹو نہ کرتے تو نجانے اور کتنے دن مسودہ مجھے نہ ملتا۔ ''تازہ ہوا'' کے بعد بھی طے تھا کہ باقر جب کوئی غزل کہیں گے تو اس کی ایک نقل مجھے پہنچاتے رہیں گے۔ ''تازہ ہوا'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی لیکن اس میں ۱۹۸۵ء تک کا کلام شامل کیا تھا۔ باقر نقوی نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں؟ اب ''مٹھی بھر تارے'' میں جون ۱۹۹۱ء تک کا کلام شامل کر رہا ہوں تو باقر کو کوئی پریشانی نہیں۔ سچ پوچھیے تو اُنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی کون سی غزل کتاب میں آ رہی ہے اور کون سی نہیں۔ یہ بے نیازی اسی میں آتی ہے جو خود کو محفوظ سمجھتا ہو۔ میں باقر کی شاعری پر ''تازہ ہوا'' میں اپنی رائے پیش کر چکا ہوں۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ باقر کا نقشِ ثانی اوّل سے بہتر ہے کہ نہیں۔ باقر کی شاعری میں ابتدا ہی سے زمانے کی روز بہ روز بدلتی صورت حال کا ادراک ملتا ہے، البتہ اب یہ لے تیز ہو گئی ہے۔ غزل کی کلاسیکی روایات سے مسلسل مربوط رہنے کے باوجود باقر الفاظ کو کلاسیکی معنوں کے علاوہ جدید معنی میں بھی اس چابک دستی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی شاعری ایسا آئینہ بن جاتی ہے جس میں اس دور کے عالمی ماحول کی شکل نظر آ جاتی ہے جس دور میں شعر کہا گیا ہو۔۔۔ دیکھیے دائیں سے بائیں بازو کی نعرے بازی کا تجزیہ:

سبز قلم کے ہاتھوں سے جنگل تحریر ہوئے
سرخ ہواؤں کے ہاتھوں صحرا تعمیر ہوئے

۱۹۸۸ء کے وسط میں امریکا بہادر کی فوج ظفر موج نے ایران کا ایک مسافر بردار طیارہ مار گرایا تھا جس میں سیکڑوں بے قصور مرد، عورتیں اور بچے لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اب ملاحظہ کیجیے باقر نقوی کی غزل کا مطلع، جو جولائی ۱۹۸۸ء میں کہی گئی:

محفوظ اب رہے نہ پرندے ہوا میں بھی
ہونے لگے شکار مسافر فضا میں بھی

ظلم و جبر، سیاسی استحصال، طاقت کا بے جا استعمال یا عدم توازن ایسے موضوعات ہیں کہ ان پر قلم نہ اٹھانا بے حسی یا بے غیرتی کے زمرے میں آتا ہے اور ان موضوعات پر لکھنے بیٹھیے تو (خصوصاً شاعری کے حوالے سے) غزل کی روایت کا دامن ہاتھ سے نکلتا دکھائی دیتا ہے اور بات نعرے بازی تک پہنچ جاتی ہے یا پھر سیاسی تناظر کا احاطہ نہیں ہو پاتا۔ باقر نقوی ان شعرا میں شامل ہیں جنہیں غزل میں بات کہنے کا سلیقہ اور ہنر آتا ہے، مثلاً گزشتہ دو برسوں (۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء) کے واقعات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ حیران کن تبدیلیاں آئی ہیں۔ خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال نے تو سیاسی اقدار کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ دیکھیے باقر نقوی ان تلخ حقائق کو غزل کی زبان میں کیسے کہتے ہیں:

ہو رہے ہیں جمع میرے مہرباں اِک بار پھر
میری ہی بستی سے اٹھے گا دھواں اِک بار پھر

یہ مانا کچھ مکینوں کا چلن اچھا نہیں، لیکن

در و دیوار کو اس کی سزا اچھی نہیں لگتی

آزادی کی مانگ میں افشاں بن کے چمکے گی
خاکِ فلسطین و افریقا، آج نہیں تو کل

اِک ہاتھ، ایک پاؤں کا پھر ہے مطالبہ
اب تک دیے تھے ہم نے جو تاوان کیا ہوئے

عجیب چال چلے اب کی بار بردہ فروش
غریب بک بھی گئے اور دام بھی نہ ملے

آزادی پر پابندیاں، افراد پر ہوں یا اقوام پر، باقر اس کے خلاف ہیں، اور اگر آزادیِ فکر ونظر اور آزادیِ اظہار وگفتار کے پرچم برداروں کی طرف سے کوئی قدغن لگے تو باقر چیخ پڑتے ہیں:

قہر ہوتا ہے سکوں بھی گر زباں بندی سے ہو
ہم کو ہے منظور فتنہ بھی لبِ آزاد کا

اور سامراجی عزائم کے چہرے سے نقاب اٹھانے کا انداز دیکھئے:

کیوں نہ اِک شہر خلاؤں میں بسایا جائے
گل نیا جس کی زمینوں پہ کھلایا جائے

باقر نقوی کو استعاروں کے برتنے کا سلیقہ آتا ہے۔ جب کہ بہت سے اہلِ قلم اس بارہ دری میں رستہ بھول جاتے ہیں۔ زیادہ پرانی بات نہیں کہ ہندوستان کے ایک پیشہ ور نقاد نے اردو شاعری اور کربلا کے استعارے کے حوالے سے ایک ''جوابِ مضمون'' لکھا تھا جسے بعد میں کسی ضرورت مند کی درخواست پر کتابی شکل دے کر بیساکھی بنا دیا گیا۔ (لندن میں موصوف نے جب یہ مضمون پڑھا تو خاص طور پر اپنے میزبان کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا، دیکھئے میں نے اس مضمون میں ستائیس صفحات ان کے لیے لکھے ہیں)۔ اس اعلانِ مبارک سے میزبان کا پیسہ وصول ہوا کہ نہیں، یہ تو وہ جانے جس پر یہ براوقت آیا تھا، ہمیں تو صرف اتنا اندازہ ہوا کہ دانشور صاحب کربلا کے حوالہ جاتی استعمال اور استعاراتی استعمال کے مابین فرق سے واقف نہیں۔ اس لیے کہ جس کلامِ بلاغت نظام پر توصیف کا حقِ نمک ادا کیا گیا تھا اُس میں زیادہ تر کربلا کا حوالہ جاتی استعمال تھا، استعاراتی نہیں۔ میں اہلِ نظر کے توسل سے موصوف کی خدمت میں باقر نقوی کا صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں جس میں کربلا کا استعارہ ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ موصوف کی دکان پر کوئی نیا گاہک اسی قسم کا ''جوابِ مضمون'' لینے آئے تو نام کی تبدیلی کے ساتھ استعاراتی استعمال کی وضاحت بھی فرما دیں، انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ یوں بھی بڑے لوگوں کو کون کچھ کہہ سکتا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی کچھ نہ بگاڑ سکے تو ہم کیا۔ بہرحال باقر کے اشعار دیکھئے:

ویران پشت زین ہے باگیں کٹی ہوئی
جاتا کدھر ہے وقت کا رہوار دیکھنا

استعاروں کے برتنے کی ہنرمندی ملاحظہ کیجیے:

نہروں پر قبضہ کرنے والے بے نام رہے
پیاسے ہونٹوں سے ٹھنڈا پانی منسوب ہوا

اور ایک ایسا شعر ملاحظہ فرمایئے جو بادی النظر میں خوب صورت شعر ہے لیکن اگر اسے واقعات کا استعارہ سمجھیں تو اور بھی خوب صورت ہو جاتا ہے:

محلوں کے گن گانے والا ہی محبوب ہوا
جس نے اپنا راگ الاپا وہ مصلوب ہوا

اپنی مٹی سے وفا اور اپنے وطن سے لگاؤ باقر کی ذات کا حصہ ہے۔ اسی لیے وطن کے حالات پر باقر کبھی رنجیدہ ہوتے ہیں، کبھی شاکی، کبھی تلخ اور کبھی سہانے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ لیکن ہر کیفیت کا لب ولہجہ غزل کا ہوتا ہے:

اپنے طاق پہ ہم اوروں کے دیے جلائیں گے کب تک
دل کے لکھے گیت کسی کی تال پر گائیں گے کب تک

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ باقر کے ہاں گھر وطن بھی ہے اور دنیا بھی۔ مخلوقِ خدا سے محبت کرنے والا شاعر کائنات کو بھی اپنا گھر سمجھتا ہے اور جہاں بھی حق بات کہنے کی سزا ملتی ہے، اسے محسوس ہوتا ہے، یہ المیہ اُس کے گھر میں ہوا ہے۔ اسی لیے باقر ساری دنیا کے جبر پسندوں کے خلاف ہیں اور مصلحت پسندوں سے ناخوش۔

بجلیاں کوندتی پھرتی ہیں دماغوں میں تو پھر
سانحہ ہے کہ نہیں خون کا ٹھنڈا ہونا

کائنات کو اپنا گھر اور اپنے گھر کو کائنات سمجھنے والا شاعر ہی ایسا شعر کہہ سکتا ہے جو آپ بیتی بھی ہو اور جگ بیتی بھی:

عروسِ ماہ بھی سو جائے مہر بھی نہ اٹھے
خدا کرے کہ نہ ایسی سحر کسی کو ملے

وہ اپنے اس گھر کی بقا کے لیے مزید قربانیوں کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں:

ہم ہی ہمیشہ کام آئے ہیں، آج بھی حاضر ہیں
پھول اگر بچ جائیں کانٹوں کی قربانی سے

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مغرب میں آباد اہلِ قلم اپنے گرد وپیش کے مشاہدات کو نہیں لکھتے، اُن کی نذر باقر نقوی کے چند اشعار۔ ہماری نئی نسل کو درپیش مسائل کی جھلک دیکھیے:

لہجہ وتہذیب ماضی کے ورق رہ جائیں گے
صرف شجرے تک نشاں رہ جائے گا اجداد کا

عید پر کارڈ ملیں، موت پہ پھول آتے ہیں
بوڑھے ماں باپ سے رہ جاتا ہے ناتا کیسا

تمام عمر گزر جائے جس زمیں پہ وہیں
ہماری نسل کو اذنِ قیام بھی نہ ملے

جنوب اور مشرق یعنی جنوبی ایشیا اور مغرب میں اقتصادی تفاوت کی نشان دہی غزل کی زبان میں دیکھیے:

پورب دکھن، ناگ پھنی اور ریتیلا میدان
ہم جس بستی میں ہیں اس میں گھر گھر پھول کھلے

اور بنی نوع انسان کے دوست، انسانی دکھوں پر کڑھنے والے شاعر کو جب کسی جگہ سے متضاد خبریں ملتی ہیں تو غزل ایک نیا روپ دھار لیتی ہے:

پوچھ رہا ہے مجھ سے یہ میرے اندر کا وحشی
رام کی لیلا دیکھوں یا سجدے میں بابر دیکھوں

شام سویرے پاٹ اہنسا کے سنتا ہوں پھر بھی
کالی مائی کے ہاتھوں میں، روز نیا سر دیکھوں

میں نے ہمیشہ اردو کے قارئین کو صاحب الرائے سمجھا ہے اور اپنی رائے کا اظہار جب بھی کیا ہے تو اس احترام اور احساس کے ساتھ کیا ہے کہ ہمارے قاری ادب کی پرکھ رکھتے ہیں۔ میں نے ''مٹھی بھر تارے'' سے باقر کی رومانی شاعری کے اشعار یہاں نقل نہیں کیے ہیں، حالاں کہ ان کی رومانی شاعری میں بھی ان کے تیور الگ ہیں۔ مثلاً:

چاند کے بعد وہ چہرہ نظر آیا جیسے
ایک ہی رات میں مہتاب دوبارہ نکلے

تاہم جو اشعار بھی یہاں نقل کیے گئے ہیں، اگر ہمارے قارئین ان اشعار کو اچھے اور زندہ رہنے والے اشعار کی سند عطا کر دیتے ہیں تو بات تو ثابت ہو گئی نا کہ باقر کے ہاں شعور بھی ہے، اسلوب بھی اور ارتقا بھی۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شاعروں کے ایک مجموعے کے بعد جب دوسرا آتا ہے تو اس میں جگالی زیادہ ہوتی ہے اور نیا پن کم۔ خیالِ خاطر احباب ہے ورنہ کئی نام ایسے گنوا سکتا ہوں کہ پہلے دیوان سے لے کر تیسرے چوتھے یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے تک شعرائے کرام جگالی میں مصروف رہے ہیں۔ لیکن باقر کا ''تازہ ہوا'' سے ''مٹھی بھر تارے'' تک کا سفر ارتقا کا سفر ہے۔ میرے قارئین اگر میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے متفق ہیں تو آیئے مل کر کہیں:

دھن کی پجاری اس دنیا میں باقر ہی کی بات نہیں
جو بھی سچی باتیں لکھے، اس لیکھک کی جے

جلوس

خموش آنکھوں میں شہرِ بابل کے
سارے منظر اُبھر رہے ہیں
عَلَم سے ٹکرا کے ڈوبتے مہر کی شعاعیں
جھپکتی آنکھوں کے قرینوں پر
شفق کی سُرخی بکھیرتی ہیں
کشادہ رستوں پہ دونوں جانب
قطار اندر قطار
پتھر کے سر بریدہ مجسّے ہیں
عمارتوں کے اُداس روزن
تماشبینوں کی تالیوں کو ترس رہے ہیں
سڑک کی دورویہ کیاریوں کے
تمام پودوں تمام پھولوں کو
مست اونٹوں کے نرم پنجے کچل چکے ہیں
فضا میں رہوار کے پسینے کی بو بسی ہے
ہوا میں بارود کی ملاوٹ ہے
طبل کی دل ہلانے والی دھمک سے
سارا خموش منظر دہل رہا ہے
جلوسِ بختِ نصر رواں ہے

O

(باقر نقوی)

''جسم کی تہہ میں چھپے رنگ''

شمس الرحمٰن فاروقی

(الہ آباد، بھارت)

ہمارے دوست باقر نقوی بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، لیکن یہ بات تو ہم اپنے اکثر دوستوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ باقر نقوی کو جو چیز دوسروں میں ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ باقر صاحب متضاد خوبیوں والے آدمی ہیں۔ وہ عمدہ شاعر ہیں، انھیں مصوری اور خطاطی سے شغف ہے، وہ کسی بہت بڑی کمپنی میں کوئی بڑا اختصاصی قسم کا کام کرتے ہیں۔۔۔اور سائنسی موضوعات پر اردو میں لکھتے ہیں۔ اس وقت شہزاد احمد کا نام یاد آنا لازمی ہے، کہ وہ بھی بہت عمدہ، صاحبِ طرز شاعر تھے اور سائنسی موضوعات پر بھی لکھتے تھے۔ لیکن باقر نقوی کے سائنسی موضوعات ذرا متنوع ہیں۔ انھیں سائنس کی تاریخ سے بھی دلچسپی ہے، ان کی ایک کتاب حیاتیاتِ خلیہ، یعنی Cell Biology پر ہے، اور ایک کتاب برقیات (Electronics) پر حال ہی میں شائع ہوئی اور اب یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے، ایسے موضوع پر ہے جس پر اردو تو کیا، انگریزی میں بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔

مصنوعی ذہانت یعنی Artificial Intelligence کو عموماً اب صرف AI (اے آئی) کہا جاتا ہے۔ ''اے آئی'' اب یہ انگریزی کے مستقل لفظ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ ہم اردو والے بھی اسے اختیار کر لیں، کیوں کہ ''مصنوعی ذہانت'' میں ایک تکلف، تصنع یا نقلی پن کا شائبہ ہے، اور اے آئی والوں کا دعویٰ نہیں تو امید ضرور ہے کہ جب وہ اپنی منزلِ مقصود کو حاصل کر لیں گے تو ایک ایسی چیز وجود میں آئے گی جو ''حقیقی'' انسانی ذہانت سے ہرگز مختلف نہ ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ عام خیال یہی ہے کہ انسانی ذہانت سے مشابہ کوئی شے بنانا غیر ممکن ہے، چہ جائے کہ ایسی شے جو بالکل ہو بہو انسانی ذہانت جیسی ہو۔

باقر نقوی نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں اس مسئلے کو اٹھایا ہے کہ ''ذہانت'' کسے کہتے ہیں؟ وہ ذہانت کو ''اختیاری یا جبلی'' اور ''غیر اختیاری'' کی شقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ''اختیاری/جبلی'' ذہانت کی جو تعریف انھوں نے کی ہے اسے بڑی حد تک ''جبلتِ حیوانی'' (Animal Instinct) بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''غیر اختیاری'' ذہانت صرف انسان کو عطا ہوئی ہے اور ان کے بقول یہ وہ عمل ہے ''جو دماغ کے خلیوں میں جمع معلومات کے ذخیرے (Data) کو ہنر مندی سے برتتا (manipulate) یا استعمال کرتا ہے۔۔۔'' یہ تعریف بڑی حد تک درست ہے کہ لیکن اسے ذہانت کی پوری تعریف (اگر ایسی کوئی تعریف ممکن بھی ہو) نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ میں ابھی واضح کروں گا۔

پہلے زمانے میں ''ذہانت'' کا لفظ ہمارے یہاں مستعمل نہ تھا، کیوں کہ ہماری اصطلاح ''عقل'' ان تمام باتوں کو محیط تھی جنھیں ہم ''ذہانت'' کے تحت سمجھتے ہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مغرب میں بھی، جہاں ''عقل'' کا وہ تصور نہیں تھا جو ہمارا ہے۔ ''مصنوعی ذہانت'' یا اے آئی کا تصور ابھی چند ہی دہائیاں پہلے ممکن ہو سکا ہے۔ ذہن یا ادراک اور تفکر اور استنباط کی قوت کو دیکارت (Descartes) نے جسم سے الگ کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کے نتیجے میں ''عقل'' یا ''دماغ'' یا body-mind کا وجود بڑی حد تک مشتبہ ہو گیا تھا۔ گزشتہ ایک صدی میں حیاتیات (Biology) اور طبیعیاتی حیاتیات (Biophysics) اور کیمیائی حیاتیات (Biochemistry) میں جو نئی راہیں کھلی ہیں، ان کی بدولت اور پھر کمپیوٹر کی بدولت، انسانی عقل، ذہن اور دماغ کے بارے میں بہت سے سوال اٹھے ہیں۔ ان میں سے کچھ سوالات جن پر ہمارے مصنف نے گہری نظر ڈالی ہے حسبِ ذیل ہیں: کیا مصنوعی ذہانت یا عقلِ موضوعی یا اے آئی ممکن ہے؟ کیا یہ اپنی مکمل شکل میں انسانی ذہانت کے برابر یا اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟ اگر یہ ذہانت ممکن ہے تو کیا یہ مشینی شکل میں ہوگی یا حیاتیاتی یا نامیاتی (organic) شکل میں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات، اور اس طرح کے اور سوالات کا تعلق ہماری زندگی بلکہ اس کرۂ ارض پر ہماری آئندہ موجودگی سے بہت گہرا ہے۔ اگر اے آئی ممکن ہے اور اس طرح بھی ممکن ہے کہ وہ انسانی ذہن کے امکانات سے بھی بڑھ جائے، تو پھر ایسی قوت جن افراد یا اقوام کے پاس ہوگی وہ انسانیت اور بنی نوع انسان کے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ کلوننا (cloning) اور کلون کیے ہوئے دماغ کو بھی ایک طرح سے اے آئی کا عمل کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ ممکن ہے کہ کلون کیے ہوئے ذی روح کو ہماری طرح کے گوشت، پوست، ہڈیوں اور عضلات کی ضرورت نہ ہو۔ باقر نقوی نے لکھا ہے کہ کلون کیے ہوئے انسانی دماغ میں وہ صفات نہ ہوں گی جو اصل دماغ میں تھیں۔ یعنی ان کے خیال میں اگر ہم نے شیکسپیئر کے دماغ کو کلون کر لیا تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ دماغ شیکسپیئر کے ڈرامے دوبارہ لکھ دے یا شیکسپیئر جیسے ڈرامے مزید لکھ دے۔ لیکن یہ قیاس ہی ہے کیوں کہ اب تک کسی دماغ کو کلون نہیں کیا گیا ہے اور نہ کوئی مصنوعی دماغ اے آئی کے اصولوں پر بنایا گیا ہے۔ لیکن آپ یہ خیال فرمائیں کہ اگر کسی شخص میں ہٹلر، اسٹالن، نیوٹن، شیکسپیئر اور رومی کے دماغ یکجا ہوں تو وہ اس بچاری دنیا پر کیا کیا قہر ڈھا سکے گا!

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، اے آئی کی بحثیں ابھی صرف پچاس ساٹھ برس پرانی ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ داستانوں اور اساطیر میں جہاں ہر طرح کے ذی روح اور غیر ذی روح کثرت سے موجود ہیں، جہاں جانور کلام

کرتے ہیں اور انسان روپ بدل کر کچھ کا کچھ بن سکتا ہے، جہاں نئی سے نئی حیرت انگیز باتیں ہیں جو اس زمانے کے سائنس فکشن کو شرمندہ کرسکتی ہیں، وہاں یہ سب کچھ ہے لیکن اے آئی کا ذکر نہیں۔ ذکر کیا، شائبہ تک نہیں۔ اس کی وجہ تخیل کی ناکامی نہیں ہوسکتی۔ ایک داستان امیر حمزہ ہی میں آپ کو ٹیلی وژن، وائرلیس، ہوائی جہاز، آبدوز کشتی، طبی (یا سائنسی) طریقوں کے ذریعے بنائے ہوئے دیو قامت جانور (مثلاً ریچھ جو ہاتھی کے برابر ہے)، ایسے جانور جن کی فطرت بدل دی گئی ہے (مثلاً گوشت خور گھوڑے) اور ایسے مکان مل جائیں گے جن کی ہر منزل ایک ملک کے برابر ہے۔ جن لوگوں کا تخیل اس قدر تونگر اور قوی ہو ان کے لیے اے آئی کا تصور کچھ مشکل نہ رہا ہوگا، لہٰذا اگر داستان یا اسطور، میں اے آئی مذکور نہیں تو اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ قبل جدید انسان کا ذہن اس بات کو قبول کرنے کو تیار ہی نہ تھا کہ ''ذہانت'' یا ''عقل'' خدا کی طرف سے ودیعت ہونے کے علاوہ انسان کی صناعتوں میں سے ایک صناعت بھی ہوسکتی ہے۔ اور یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ہمارے افکار کی رُو سے خدا کے بغیر ''عقل'' کا تصور ممکن نہیں۔ ہمارے یہاں عقل بالقوۃ اس عمل کو کہتے ہیں جسے معقولات کا علم حاصل نہ ہو لیکن اس میں اس کے حصول کی صلاحیت ہو۔ ''عقل'' کی یہ نوع (category) باقر نقوی کی ''اختیاری/ غیر اختیاری'' ذہانتوں کی نوع سے الگ ہے۔ اس کے بعد ہمارے یہاں دوسری نوع ''عقل بالملکۃ'' ہے جو تمام بدیہی معقولات اور اوّلیات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ''عقلِ بسیط'' وہ ہے جو تمام معلومات کو متحد کرسکے۔ لیکن یہ سب عقلیں اپنی جگہ پر بے کار ہیں جب ہمارے پاس ''عقلِ مستفاد'' نہ ہو۔ یہ وہ حقیقی عقل ہے جو عالمِ بالا سے ملتی ہے اور صوفیوں کی اصطلاح میں یہ نفس کا وہ درجہ ہے جہاں نظری معقولات کا مشاہدہ ہمہ وقت ہوسکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اے آئی کے نظریات میں ''عالمِ بالا سے مستفاد عقل'' اور ''نظری معقولات کے ہمہ وقت مکاشفانہ مشاہدے'' کا تصور محال ہے، اور اس طرح ہمارے یہاں خدا کے بغیر، جسے عقلِ اوّلین پر بھی فوقیت حاصل ہے، عقل یا ''ذہانت'' کا تصور ناممکن ہے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ کمپیوٹر کا دھندلا سا تصور پرانے لوگوں کو ضرور رہا ہوگا۔ آج ہم جانتے ہیں کہ ایسے کمپیوٹر ممکن ہیں جو بیک وقت دو، چار، آٹھ، سولہ، نہیں بلکہ چونسٹھ اور اس سے بھی زیادہ عملیے (operations) بیک وقت انجام دے سکتے ہوں۔ اور اتنا ہی نہیں، ایسے کمپیوٹر بہت جلد وجود میں آجائیں گے جن کا سارا نظام چائے کی پیالی میں بھرے ہوئے کسی محلول (solution) سے زیادہ نہ ہوگا۔ یعنی وہ محلول دراصل اطلاعی اکائیاں ہوں گی جو ہمیں محلول کی شکل میں نظر آئیں گی۔ آپ کے پاس ایک جیبی کلیدی تختہ (key board) ہوگا جسے اس نامیاتی کمپیوٹر سے بذریعہ وائرلیس منسلک کردیا گیا ہوگا۔ پھر آپ اس تختے کی مدد سے اس کمپیوٹر سے وہ جب اطلاعات حاصل کرسکیں گے اور وہ سب کام لے سکیں گے جو کسی بڑے سے بڑے کمپیوٹر کے لیے ممکن ہوگا۔ اب غور کیجیے کہ جامِ جمشید اور کیا تھا اگر وہ کچھ اسی قسم کا کمپیوٹر نہ تھا؟ لیکن اہم بات یہ ہے کہ جامِ جمشید، یا داستانِ امیر حمزہ کے ساحروں کے پاس اس طرح کی جو دوسری اشیا تھیں، انھیں ''ذہانت'' یا ''عقل'' کا حامل کبھی نہیں قرار دیا گیا۔ لیکن ہمارے زمانے کے کمپیوٹر کی زبان میں اب ایک نئے لفظ wet ware کا اضافہ ہوگیا ہے جو دماغ کے مختلف حصوں، اور ان کے باریک ترین تاروں اور سائنیپوں (synaps) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کمپیوٹر کا پروگرام یا وہ شے جس پر وہ پروگرام درج کیا گیا ہو، سوفٹ ویر (soft ware) ہے، اور جو شے کہ اس سوفٹ ویر کو بروئے کار لاتی ہے وہ ہارڈ ویر (hard ware) ہے، اور حضرتِ انسان کا دماغ بھی ایک طرح کا کمپیوٹر ہے جس میں ہارڈ اور سوفٹ دونوں کو کیمیائی اور برقیاتی محلول کے ذریعے بروئے کار لایا گیا ہے لہٰذا ہم اسے ویٹ ویر wet ware کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپیوٹر والوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ اے آئی ممکن ہے۔ اور شاید یہ بھی طے کرلیا ہے کہ (۱) انسانی دماغ ایک طرح کا کمپیوٹر ہے، یا (۲) انسانی دماغ ایک طرح کا کمپیوٹر نہ ہو، لیکن ہم جو اے آئی بنائیں گے وہ کمپیوٹر کے نمونے پر ہوگی۔ اوپر میں چائے کی پیالی میں رکھے ہوئے ''محلولی'' کمپیوٹر کا ذکر کرچکا ہوں۔ لیکن کمپیوٹر والوں کے نکالے ہوئے دو نتائج جو میں نے اوپر پیش کیے، ان میں ایک گہرا تضاد ہے۔ یہ تضاد کمپیوٹر والوں کو کبھی نظر آتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا۔ اس کی ایک مثال باقر نقوی نے زیرِ نظر کتاب میں ''ٹیورنگ امتحان'' (Turing Test) کے حوالے سے پیش کی ہے۔ ایلن ٹیورنگ (Alan Turing) کو کمپیوٹر نظریے اور عملی تجربات کا موجد کہا جاسکتا ہے۔ جب اس کی بنائی ہوئی حاسب مشین (Calculating Machine) ترقی کرکے کمپیوٹر کی شکل اختیار کرنے لگی تو یہ سوال بہت شد و مد سے اٹھایا گیا کہ اب انسان اور کمپیوٹر میں کیا فرق رہ گیا یا رہ جائے گا؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے ٹیورنگ نے اپنا ''امتحان'' ایجاد کیا، جس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ کوئی شخص کچھ سوالات مرتب کرے۔ پھر ایک انسان اور ایک کمپیوٹر کو الگ الگ پردے میں بٹھا کر یہ سوالات ان کے سامنے رکھے جائیں۔ جج کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ جواب دینے والا وجود انسانی ہے یا مشینی؟ اگر کمپیوٹر کے جوابات کو دیکھ کر جج یہ فیصلہ کرے کہ یہ جوابات انسان نے دیے ہیں، تو ثابت ہوجائے گا کہ انسان اور کمپیوٹر مشین میں بااعتبار ''ذہانت'' کوئی فرق نہیں۔ جیسا کہ باقر نقوی نے لکھا ہے، ایک بار تو معاملہ بالکل الٹا ہوگیا کیوں کہ ایک خاتون نے ایسے تیز اور مفصل جواب دیے کہ جج کو دھوکا ہوگیا کہ جواب مشین نے دیے ہیں، انسان نے نہیں۔

دراصل ٹیورنگ امتحان اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب امتحان دہندگان میں کوئی انسان نہ ہو، صرف کمپیوٹر ہوں، اور وہ کمپیوٹر (سب یا کوئی ایک دو) جج کو باور کرادیں کہ وہ کمپیوٹر نہیں انسان ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آج تک ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ انسانی دماغ میں کچھ کمپیوٹری صفات ہیں، لیکن کچھ ایسی ہیں جو

''انسانی'' ہی کہی جا سکتی ہیں۔ان میں ایک بہت ہی معمولی صفت یہ ہے کہ کسی غبی اور کند ذہن ترین شخص کے بھی دماغ میں بے حد یا کم و بیش بے حد معلومات کا مخزن ہوتا ہے اور فی الحال کوئی نظام ایسا نہیں جو انھیں کسی ایسے سلسلے میں پرو دے جس کے ذریعے ان معلومات کو مشینی طور پر اخذ کیا جا سکے۔باقر نقوی کا کہنا ہے کہ انسانی دماغ بھی کمپیوٹر ہی کی طرح ایک/صفر کے انتخاب اور جمع تفریق کے اصول پر عمل کرتا ہے۔یہ معاملہ ابھی مشکوک ہے،لیکن اگر درست بھی ہو تو مندرجہ ذیل پر غور کیجیے:

زید ایک کند ذہن نوجوان ہے،اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہے۔آج جب وہ داڑھی بنانے کے لیے غسل خانے میں گیا تو اسے اپنا معمولی بلیڈ اور سیفٹی ریزر نظر نہ آیا۔ڈھونڈنے پر اسے ایک چیز ملی جو بلیڈ لگے ہوئے سیفٹی ریزر سے مشابہ تھی،اگرچہ اس میں الگ سے بلیڈ ڈالنے نکالنے کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔اس نے بہت غور کیا اور فیصلہ کیا کہ یہ چیز بھی داڑھی بنانے کے کام آ سکتی ہے۔اپنی داڑھی اس چیز سے بنا کر اس نے پھٹکری کی وہ ٹکیہ تلاش کی جسے وہ داڑھی بنانے کے بعد منہ پر پھیرتا تھا۔بہت تلاش کے باوجود وہ نا کام رہا۔مایوس ہو کر وہ سوچ ہی رہا تھا کہ آج چہرے کی خراشوں کو ٹھیک کرنے کا کچھ انتظام نہ ہو سکے گا کہ اس کی نظر ایک شیشی پر پڑی جس میں کوئی خوش بودار سی رقیق چیز بھری ہوئی تھی۔اس نے شیشی کھول کر سونگھی،اسے لگا کہ اس کی مہک میں کچھ ویسی تیزی ہے جیسی پھٹکری میں ہوتی ہے۔اس نے شیشی سے چند بوندیں نکال کر منہ پر ملیں،اسے چھرچھراہٹ محسوس ہوئی اور اچھی مہک بھی آئی۔اس نے سمجھ لیا کہ اس شیشی میں جو چیز ہے وہ پھٹکری کی ٹکیہ جیسا کام کرتی ہے۔

مندرجہ بالا بیان میں کئی طرح کے معاملات درج ہیں۔ان کا تعلق تجربے،حافظے،استنباطِ نتائج اور کئی طرح کے محسوسات سے ہے(چہرے کی خراشیں،خوش بو،پھٹکری کی تیزی،شیشی میں بھرے ہوئے محلول کی پیدا کردہ چھرچھراہٹ،بلیڈ کی چمک وغیرہ)۔میرا دعویٰ ہے کہ ایسا کمپیوٹر بنانا فی الحال غیر ممکن ہے جو غبی نوجوان زید کی تمام معلومات کو محیط ہو اور داڑھی بنانے اور آفٹر شیو لگانے کے ان تمام مسائل کو زید کی طرح حل کر سکے۔

اے آئی کے نظریہ سازوں نے متعین کیا ہے کہ اے آئی کے کسی کامیاب ماڈل کو حسبِ ذیل میدانوں میں مہارت(بالقوۃ یا بالفعل)ہونی چاہیے:

(۱)حلِ مسائل(problem solving):مثلاً وہ مشہور کہانی جس میں پیاسا کوا گھڑے کی نچلی سطح سے پانی اوپر لانے کے لیے گھڑے میں کنکریاں ڈالتا ہے۔

(۲)نظریۂ بازی(game theory):مثلاً کسی کھیل میں بہترین نتیجہ حاصل کرنے کے لیے اس کے قوانین کے بہترین استعمال کی راہیں دریافت کی جائیں۔

(۳)شناختِ اشکال(pattern recognition):مثلاً دو بظاہر مشابہ لیکن دراصل مختلف اشیا کو الگ الگ پہچاننا۔

(۴)فطری زبان(natural language):یہ بظاہر سب سے سادہ لیکن دراصل شاید سب سے مشکل کام ہے،کیوں کہ کوئی زبان فطری نہیں ہوتی،اور اس اصطلاح سے مراد ہے:زبان کو ہم جس طرح ''فطری'' طریقے سے استعمال کرتے ہیں کہ لیکن زبان کے ''فطری'' طریقِ استعمال میں استعارے بیش از بیش بروئے کار آتے ہیں اور استعارہ سازی کے کوئی قائدے نہیں ہیں۔لہٰذا ہر استعارے کا مطلب انفرادی طور پر سمجھنا پڑتا ہے،اس میں مجرد ''ذہانت'' سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ہمیں زبان کے ساتھ ''فطری'' مناسبت،اور زبان کے کثیر نمونوں سے واقفیت ہو۔کہتے ہیں کہ ایک بار ایک فرانسیسی شخص جسے انگریزی سے اچھی واقفیت تھی،انگلستان کی سیر کو گیا۔ریل گاڑی کے سفر کے دوران وہ منظر سے لطف اندوز ہونے کی خاطر کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا کہ اس کے انگریز ہم سفر نے زور سے پکارا:look out فرانسیسی سمجھا کہ کوئی اچھا منظر آنے والا ہوگا اسی لیے مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ باہر دیکھو،لہٰذا وہ گردن اور بھی باہر نکال کر جھانکنے لگا۔انگریز نے پھر کہا:اوہ look Out!۔فرانسیسی بچارے نے گردن اور آگے کی تھی کہ دفعتاً اس کی کھوپڑی پر زناٹے کی چوٹ لگی،کیوں کہ راستہ دونوں طرف درختوں سے گھرا ہوا تھا اور بعض شاخیں ریل کے ڈبوں کے بہت نزدیک آ گئی تھیں۔فرانسیسی نے بھنا کر انگریز سے کہا،جب باہر چوٹ لگنے کا خطرہ تھا تو آپ مجھے look out یعنی باہر جھانکنے کو کیوں کہہ رہے تھے؟انگریز نے کہا،میں وہی تو کہہ رہا تھا کہ look out یعنی دھیان رکھیے۔فرانسیسی بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اے آئی کے لیے یہ سب اتنا ضروری نہیں جتنا ضروری Cybernetics یعنی انضباطیات کا گہرا شعور ہے۔انضباطیات کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسانی بلکہ کسی بھی نامیاتی جسم(Bio-organism)کو مشین کے ماڈل پر تصور کیا جائے۔اس کی ایک مشہور مثال یہ قول ہے کہ ''درخت دراصل ایک پاور ہاؤس ہے'' اس طرح انسان کو بھی مختلف ٹربائن انجنوں(turbine engines)کا مجموعہ قرار دے سکتے ہیں۔دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر مشین کو نامیاتی جسم کے ماڈل پر تصور کیا جائے۔ان دونوں کو ملانے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ نامیاتی جسم اور مشینیاتی جسم میں آپسی تال میل اور تعامل ممکن ہو سکتا ہے۔انسانی دماغ ایک Bio-organism بھی ہے اور برقیاتی مشین بھی،لہٰذا اس وقت یہ تو ممکن ہو ہی گیا ہے کہ بہت سی ایسی خفی ترین مشینیں(nano-machines)بنا لی گئی ہیں جو بہم یکجا ہو کر عقل مندوں کی طرح اپنے منصوبوں کو عملیے(operation)کی شکل میں انجام دیتی ہیں۔

باقر نقوی کی کتاب میں خفی ترین ٹیکنالوجی(Nano-technology)اور اے آئی کے لیے اس کے امکانات کا ذکر ہے مثلاً یہ کہ اب کئی یونی ورسٹیوں اور کمپنیوں کے تحقیقاتی ادارے ایسے سالمے(molecules)بنانے پر قادر ہو گئے ہیں جن کے اندر بہت

سے الکٹران یعنی برقیرے ذخیرہ کیے جاسکتے ہیں اور وہ اپنے برقی بار کو مثبت سے منفی یا منفی سے مثبت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ بے حد چھوٹے، بلکہ خفی ترین سے بھی چھوٹے یہ سالمے آئی کی تخلیق میں کس قدر اہم کردار ادا کریں گے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی دماغ کے اندر کروڑوں سالمے اور سائنیپ ہیں جن کے عملیے کا سارا دارومدار مثبت اور منفی برقی لہروں پر ہے اور وہ برق کیمیائی (electro-chemical) اصولوں پر کام کرتے ہیں۔

باقر نقوی نے Fuzzy Logic پر بھی عمدہ کام کیا ہے۔ اسے وہ ''مبہم منطق'' کہتے ہیں لیکن میرے خیال میں ''دھندلی منطق'' کہنا شاید زیادہ درست ہو۔ منطق کی صفت یہی بیان کی گئی ہے کہ وہ کسی قضیے کے تمام پہلوؤں کو آئینہ کر دیتی ہے اور غیر یقینی یا غیر قطعی کلام کو چھانٹ دیتی ہے۔ اس کے برخلاف Fuzzy Logic کا اصول یہ ہے کہ کوئی چیز ''قطعی'' نہیں بلکہ ہر چیز ''قریب قریب قطعی'' ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی شے کی قطعی، بالکل سو فی صدی درست، پیائش ممکن نہیں۔ جیسا کہ کارل پاپر (Karl Popper) نے کہا ہے، ہم کسی شے کے بارے میں دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ (مثلاً) بارہ انچ لمبی ہے۔ ہمارے پیمانے ابھی اتنے درست نہیں ہو سکے ہیں کہ وہ ٹھیک بارہ انچ ناپ سکیں اور اگر ہم ٹھیک بارہ انچ کی پیائش حاصل بھی کر لیں تو یہ جان نہ سکیں گے کہ ہم وہاں پہنچ گئے ہیں کیوں ہمارے آلاتِ پیائش یا تو بارہ انچ سے کچھ خفی ترین کم ہوں گے یا کچھ خفی ترین زیادہ ہی ناپ سکتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں Fuzzy Logic ہمارے لیے کس قدر کارآمد ہے، اس کی آسان مثال دھلائی مشین ہے جسے عمومی طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ ''گرم پانی'' اور ''بہت گرم پانی''، ''صاف کپڑا'' اور ''گندہ کپڑا'' کن وجودوں (entities) کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی طرح کے کپڑے کے لیے وہی پانی ''گرم'' اور کسی اور طرح کے کپڑے کے لیے وہی پانی ''بہت گرم'' ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ''گندہ کپڑا'' اور ''صاف کپڑا'' مختلف حالات میں مشین کے لیے الگ الگ معنی رکھ سکتے ہیں۔ اس نکتے کی اہمیت اے آئی کے باب میں ظاہر ہے، کہ ہم بھی ''گرم''، ''بہت گرم''، ''خوش بودار''، ''بد بودار'' وغیرہ کے درمیان جبلی طور پر یا عقلِ حیوانی کی مدد سے فرق کرتے ہیں جو منطق سے بے بہرہ ہے۔ وٹگنسٹائن (Wittgenstein) کا قول تھا کہ انسانی زبان کی محدودیت اس سے ظاہر ہے کہ انسان ''قہوے کا ذائقہ'' بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن دراصل یہ بات ہر طرح کے حسی تجربے یا جذباتی تجربے کے لیے کہی جاسکتی ہے۔ جب ٹینی سن نے آنسوؤں کے لیے کہا تھا کہ وہ بوسوں کی طرح ''Sweet'' ہیں:

> ... Sweet as those by hapless facy
> feigned On lips that are for others;...

تو وہ Sweet کا ذائقہ بیان کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی کر رہا تھا اور جب فرانسیسی سیاست داں تالیراں (Charles Maurice de Talleyrand) نے کافی کا ذائقہ حسبِ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا:

> **Black as the devil,**
> **Hot as hell,**
> **Pure as an angel,**
> **Sweet as love.**

تو وہ قہوے کے ذائقے سے زیادہ اپنا ذوق بیان کر رہا تھا جس میں (اس کے خیال میں) قہوے کے متضاد خواص کا بھی بیان تھا۔ یہ سب Fuzzy Logic کی مثالیں ہیں اور انسانی دماغ اس طرح کی دھندلی منطق کو بہت پسند کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ دھلائی مشین کے لیے ''گرم/ بہت گرم''، ''گندہ/ صاف'' کے درمیان فرق کرنا آسان ہے مگر کسی انتہائی ترقی یافتہ مشین کے لیے یہ ''سمجھنا'' غیر ممکن ہے کہ کوئی شے بیک وقت ''ابلیس کی طرح سیاہ'' اور ''عشق کی طرح شیریں'' بھی ہو سکتی ہے اور نمکین آنسو ان بوسوں کی طرح شیریں ہو سکتے ہیں جو ہم نے اپنے تخیل میں ان ہونٹوں پر ثبت کیے ہیں جو ہمارے لیے نہیں ہیں۔

آخر میں ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہزار کوشش کے باوجود باقر نقوی کی زبان بعض جگہ زیادہ دشوار محسوس ہوتی ہے۔ امید ہے کہ ان کی آئندہ تحریریں اور زیادہ سریع الفہم ہوں گی۔ تاہم باقر نقوی نے یہ کتاب لکھ کر ہماری زبان اور ادب اور معاشرے کے لیے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے لیے وہ مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں۔

''دولگن کا شاعر''

باقر نقوی اندرونی لگن کا شاعر ہے، اس کے لیے شاعری کرنا ایک باطنی مجبوری ہے۔ بقول ژونگ کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیقی اُپج سے زیادہ طاقتور نہیں ہوتا۔ وہ غزل کی کلاسیکی اور جدید روایت سے پوری طرح آشنا ہے مگر اپنی روز افزوں مصروفیتوں کے باوجود وہ شاعری کی گرفت سے کسی پہلو سے بھی آزاد نہیں ہو پاتا۔ زندگی کا ہر تجربہ اس کے لیے شاعری کا موضوع ہے۔ وہ زندگی کو کھُلا سمجھتا ہے اور بھرپور زندگی گزارتا ہے، شب و روز کے دُکھوں اور سُکھوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے۔

شہزاد احمد

سائنس اور کائنات

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم
(کراچی)

کرہ ارض کے ٹھوس شکل میں موجودگی کا تخمینہ کوئی 4.5 بلین سال کا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے زمانہ قبل از حیات (Pre Biological) عرصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ زندگی کے آثار پیدا ہونے سے بہت پہلے تقریباً ایک بلین سال کی مدت کا زمانہ بھی ہے جو بھرپور اور نہایت اہم کیمیائی تعملات پر مشتمل دور جانا جاتا ہے۔ جب یک سالمی نامیات حیات (Bio monomers) سے کثیر سالمی نامیات حیات (Bio Polymers) بنے اور پھر ان میں خود ترتیبی (Sell Assembly) کا عمل شروع ہوا جس کی انتہا بنیادی خلیہ (Proto Cell) سے لے کر زندگی سے پر فعال خلیے (Living Cell) پر ہوئی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پہلا خلیہ کوئی 3.5 بلین سال پرانا ہو سکتا ہے جبکہ قدیم ترین فوسل (3.2 بلین سال پرانا) کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ یک خلوی (Single Cell) حیات سے کثیر خلوی حیات (Multi Cellular) اور پھر انسان تک ارتقا کی ایک شاندار اور دلکش کہانی ہے۔ ان تمام تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے آج ہم نہایت سادگی سے خلیے کو زندگی کی اکائی کہتے ہیں اور اسی میں حیات کے جملہ راز اور تمام مظاہر نہاں اور عیاں ہیں۔ حیات انسانی کا بلیو پرنٹ (Blueprint) جس کی جانب ماہر حیاتیات جیمس واٹسن نے 1953ء میں مرکزی ترشے (DNA) کی بناوٹ اور ساخت کو بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا، اب جون 2000ء میں طویل جدوجہد کے بعد صرف ایک سادہ ڈرافٹ کی شکل میں پیش کیا جا سکا ہے اور سپر کمپیوٹر کی مدد سے سائنس داں انسانی جینوم کا مطالعہ اور زندگی کی تشکیل اور بقا کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ انسانی خلیے میں موجود جینز (Genes) کی تعداد ایک اندازے کے مطابق اڑتیس ہزار سے ایک لاکھ بیس ہزار کے درمیان ہے۔ جب تمام جینز دریافت ہو جائیں گی تب شاید حیات انسانی کا بلیو پرنٹ ایک مربوط اور مکمل نقشے کی شکل میں سامنے آ سکے گا۔ اس وقت شاید ہم بہتر طور پر انسانی فلاح اور حیات کی حرمت کا مفہوم سمجھ سکیں گے۔

اس موضوع یا قریب کے موضوعات پر دنیا کی بہت سی زبانوں میں بالخصوص انگریزی میں بہت سی کتابیں پیشہ وارانہ بھی اور عام فہم بھی دستیاب ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں لیکن اردو میں سائنس کے موضوعات پر کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ خالص سائنسی انداز سے ہٹ کر عام فہم اور دلچسپ انداز میں حیات انسانی کی اکائی یعنی خلیے کی ساخت، کارکردگی اور امکانات پر اردو میں بھی کوئی بنیادی اور تازہ ترین معلومات پر مشتمل کتاب ہو۔ یہ کام حیاتیاتی سائنس دانوں کے کرنے کا تھا مگر اس سلسلے میں جناب باقر نقوی نے پیش رفت کی۔ باقر نقوی ذہن رسا رکھتے ہیں۔ تخلیقی سوچ کے جوہر سے فیض یاب ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور نثر نگار بھی رواں اور پختہ کار ہیں۔ دلچسپ اور افادیت کے حامل موضوعات کی تلاش ان کا خاصہ رہی ہے۔ پیش نظر کتاب جس کا عنوان باقر نقوی نے خلیے کی دنیا (جینیات کے موضوعات) رکھا ہے، اپنے پرکشش، دلچسپ اور معلومات افزا طرز اظہار کے سبب اردو میں ایک نہایت اہم اور منفرد کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ جدید معلومات پر مشتمل باتصویر کتاب ہے جو عام قارئین کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگی۔ سادہ زندہ خلیے سے لے کر انسانی کلوننگ اور جین کاری جیسے تمام اہم موضوعات پر تازہ معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ باقر نقوی اپنی اس پیش کش پر بجا طور پر قابل ستائش اور مبارکباد کے حقدار ہیں۔

کتاب کی ابتداء جس مقدمے سے ہوئی ہے اسے باقر نقوی نے ''حمد'' کا عنوان دیا ہے جو اپنی معنویت میں منفرد ہو گیا اور میں خصوصی طور پر اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ خدا، کائنات، حیات اور اس کی تشریح و ابلاغ کے لیے اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مذہبی اسکالرز، فلاسفر، شعراء، صوفیا اور سائنس دانوں نے اپنے اپنے منصب و مسلک کے تحت اس موضوع کو بیان کیا ہے اور اس کی غایت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ تمام کاوشیں درحقیقت خدا یا اسی حقیقت اولیٰ کے پالینے اور سمجھ لینے کے لیے ہیں۔ صدیوں کے اس فکری اور تشریحی سفر میں مذہبی اور روحانی اسکالرز تو خدا سے قریب ترین رہے لیکن فلاسفر اور شعراء اپنی علمی موشگافیوں میں کبھی بہت قریب اور کبھی بہت دور نظر آئے البتہ سائنس دانوں کی نمایاں مذہبی سوچ تسلسل کے ساتھ یہی رہی کہ سائنس بلا شرکت غیر یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ کائنات اور انسان دونوں کی تخلیق و تشکیل کو فیصلہ کن طور پر بیان کر سکے۔ اسے خدا، مذہب یا روحانیت کی ضرورت نہیں۔ مگر دلچسپ امر یہ ہے کہ اب صورت حال بدل رہی ہے اور اب دنیا کے کئی اہم سائنس داں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی تحقیقات انہیں یہ سمجھنے پر مجبور کر رہی ہیں کہ سائنس جواب تک خود کو ہی خدا سمجھے ہوئی تھی دراصل خدا کی جانب سفر یا سمت کا ایک نام یا حوالہ ہے۔ آج دنیا میں مختلف موضوعات پر کام کرنے والے اہم سائنس دانوں کی آراء ہم آواز ہو رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اس کائنات اور انسان کے بارے میں اتفاقیت (Randomness) کا نظریہ درست نہیں بلکہ یہ سب کچھ ایک اعلیٰ اور منظم صورت حال یا Design کا متقاضی ہے۔ ان سائنس دانوں کے تجربات و نتائج نے نشاندہی کی ہے کہ ایک اعلیٰ اور نمایاں مقصدیت کائنات اور انسان کی تخلیق و تعمیر میں موجود ہے۔ اس موضوع پر بہت سی تحریریں ملتی ہیں تاہم

باقی صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجیے

''ایک جیب میں بُت ایک میں خدا''

پروفیسر سحر انصاری
(کراچی)

میرا خیال ہے دُنیا میں ہر تعلیم یافتہ فرد الفریڈ نوبیل کے نام سے واقف ہے۔ نوبیل کا پورا نام الفریڈ برنہارڈ نوبیل (۱۸۹۶ء۔۱۸۳۳ء) تھا۔ ان کا تعلق سویڈن سے تھا اور انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی سے اپنی دلچسپی کے نتیجے میں ڈائنامائٹ اور دیگر آتش گیر آلات ایجاد کیے۔ ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کوہ کنی اور ارض شکنی میں سخت جاں فشانی کرنے والوں کے لیے سہولت مہیا کی جائے لیکن قابیل کی اولاد جس نے پتھر کو بھی مہلک ہتھیار بنالیا تھا، کہاں باز آتی ہے؟ ڈائنامائٹ کو تخریب کاری اور جنگ آزمائی میں استعمال کیا جانے لگا۔ نوبیل کو اپنی ایجاد کی بے وقعتی اور غلط استعمال پر شدید ملال ہوا۔ چنانچہ انھوں نے یہ وصیت کی کہ ان کے مالی اثاثوں کا فائدہ اُن اہلِ دانش کو پہنچے جنھوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے کسی شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔

۱۰ردسمبر ۱۸۹۶ء کو نوبیل کا انتقال ہوا۔ اُن کے مرنے کے بعد یہ طے پایا کہ چھ شعبوں (۱) فعلیات یا طب، (۲) طبعیات، (۳) ادب، (۴) کیمیا، (۵) امن اور (۶) معاشیات میں کوئی اہم کارنامہ سرانجام دینے والی شخصیت کو ایک خطیر رقم کے ساتھ طلائی تمغا دیا جائے۔ یہ انعام نوبیل کے نام سے موسوم ہے۔ نوبیل انعامات کا اجراء ۱۹۰۱ء میں ہوا۔

سویڈش اکیڈمی آف سائنس (اسٹاک ہوم) ہر سال ۱۰ردسمبر کو نوبیل کی برسی کے موقعے پر انعامات کا اعلان کرتی ہے۔ نوبیل انعام کی بڑی وقعت ہے۔ نوبیل انعام یافتگان کو انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دیگر شعبوں کے مقابلے میں ادب کے ضمن میں دیے جانے والے نوبیل انعام کا چرچا کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے کئی بار یہ شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو نوبیل انعام سیاسی وجوہ کے تحت دیا گیا ہے۔ بعض نوبیل انعام یافتگان نے تو انعام واپس بھی کیے ہیں۔ ان میں بورس پاسترنک اور ژاں پال سارتر جیسے ادیب بھی شامل ہیں۔

نوبیل انعام کی تقریب شان دار طریقے سے منعقد کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر انعام یافتہ شخصیت کو ایک خطبہ بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ خطبہ عموماً خیالات، اسلوب اور لفظ و بیان کا شاہکار ہوتا ہے۔

اردو کے معروف شاعر اور ادیب باقر نقوی جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں، نے یہ سوچا کہ ان خطبات کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ باقر نقوی صاحب اس سے قبل ''مصنوعی ذہانت'' اور ''ای ایف یو ایک تحریک'' جیسی کتابیں اردو دُنیا کو پیش کر چکے تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ بھی جدا ہے۔ اُن کا یہ شعر تو عہدِ نو کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے:

نہ جانے کون سا کس وقت کام آ جائے
سو ایک جیب میں بُت ایک میں خدا رکھنا

باقر نقوی مہذب، شائستہ، ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ ایسے گوشے تلاش کرتے رہتے ہیں جو انسانی معاشرے میں روشنی اور آگہی کے فروغ کا سبب بنیں۔ ان کی شاعری اور تخلیقی مصروفیت تو ان کے لیے لازمۂ حیات ہے ہی لیکن ترجمے سے بھی انھیں خاص شغف ہے۔ ہمارے یہاں ترجمے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، حالانکہ بسا اوقات ترجمہ تخلیق سے زیادہ مشکل اور محنت طلب ہوتا ہے۔ ادبیاتِ عالم کی تاریخ میں تراجم کے بعض ایسے ادوار گزرے ہیں جن کے بغیر ادب اور زبان، علوم و فنون کی ترقی شاید اس معیار کی نہ ہوتی جو تراجم کے بعد ممکن ہوئی۔

ترجمے کی اہمیت کے پیشِ نظر بعض بین الاقوامی ادارے ترجمے پر کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ ان میں یونیسکو ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ چونکہ اس وقت تذکرہ نوبیل ادبیات کا ہے اس لیے یہ امر باعثِ دل چسپی ہوگا کہ خود نوبیل فاؤنڈیشن اپنے نوبیل سمپوزیم فنڈ کے ذریعے تراجم کے باب میں سمپوزیم منعقد کرتی اور اس کی روداد، کارروائی کی تفصیل کے ساتھ ان میں پیش کیے جانے والے مقالات بھی کتابی شکل میں شائع کرتی ہے۔ اس ضمن میں سویڈش اکیڈمی بھرپور تعاون کرتی ہے۔ ان اجتماعات میں علومِ انسانی، فنونِ لطیفہ اور سائنس کے موضوعات بہ طورِ خاص زیرِ بحث آتے ہیں۔ ترجمے کی زبان، اصطلاحات اور زبان و ذہن کے تعلق پر عالمانہ افکار و خیالات اجاگر کیے جاتے ہیں۔

باقر نقوی کا یہ سارا شغف Labour of Love کے سوا اور کچھ نہیں۔ انھوں نے کئی علمی، سائنسی اور ادبی متون کے کامیاب ترجمے کیے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ کمرشل نوعیت کا نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ ادب کا نوبیل انعام پانے والوں کے نوبیل خطبات کا ترجمہ کیا جائے۔ یہ خیال بجائے خود نہایت اہم لیکن جاں کاہ تھا۔ مجھ سمیت کئی دوستوں نے باقر نقوی کے اس خیال کو نہ صرف سراہا بلکہ مسلسل اصرار کرتے رہے کہ اس منصوبے کو مکمل کر کے ہی دم لیں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

کے مصداق باقر نقوی نے گویا میر تقی میر کی زبان میں مسئلہ حل کر دیا:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

باقر نقوی اپنے جثّے میں ناتواں دکھائی دیتے ہوں گے لیکن عزم و ارادہ اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ ہرگز ناتواں نہیں۔ میں باقر نقوی کی اس کاوش کو صمیمِ قلب سے کیوں سراہ رہا ہوں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ خطبات بہت غور و فکر کے بعد دنیا کے بڑے ذہنوں نے عطا کیے ہیں۔ ان

کا اسلوب، ان کی فکر اور موضوعات کو ادبی لوازم کے ساتھ اردو زبان میں منتقل کر دینا آسان کام نہیں۔ اس سے قبل اس نوعیت کے بعض تراجم میری نظر سے گزرے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ مترجمین نے صحافیانہ انداز میں جیسے خبروں کا ترجمہ کرتے ہیں، ان کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کیا۔ باقر نقوی نے اردو زبان کے کلچر کو برتتے ہوئے ان خطبات کی ادبی شان کو برقرار رکھا ہے۔ یہی ان کا کارنامہ ہے۔

باقر نقوی نے نثر کے ساتھ ساتھ نوبیل خطبات میں شامل شاعری کے بھی منظوم تراجم کیے ہیں جو بلاشبہ قابلِ ستائش ہیں۔ میں نے اس رُخ پر توجہ دینے کے بعد باقر صاحب سے گزارش کی ہے کہ عالمی سطح کے شعراء کا ایک انتخاب اپنے منظوم تراجم کے ساتھ شائع کریں گویا:

پھر ''انھیں'' دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا

نوبیل ادبی خطبات کا ایک اور زاویہ اس طرح بھی اجاگر ہوتا ہے کہ انعام پانے والے ادیب اور شاعر کسی ایک زبان یا ایک ملک اور ثقافت سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان میں اگر ایک طرف اناتول فرانس اور جارج برنرڈ شا ہیں تو دوسری طرف رابندر ناتھ ٹیگور اور ٹونی موریسن ہیں۔ گویا پورا گلوب اپنے دانش ور کی گواہی کے لیے موجود ہے۔ جرمنی کے گنتر گراس نے داستان گوئی اور قصّہ نگاری کو تاریخ کے تناظر میں دیکھا اور پیش کیا ہے۔ داریوفو کا خطبہ کیسے ڈرامائی انداز میں شروع ہوتا ہے:

اگرچہ میرے ہاتھ میں کوئی جام نہیں پھر بھی میں عالی مرتبت ملکہ کرسٹینا کی یاد میں، جو ماضی میں آپ کی ملکہ تھیں، جام نوش کرنا چاہتا ہوں۔

البیئر کامیو، ونسٹن چرچل، ٹامس مان، ہنری برگساں، ٹی ایس ایلیٹ، ڈیرک والکاٹ، رڈیارڈ کپلنگ کے خطبات اپنا ایک جداگانہ فکری اور ادبی رُخ رکھتے ہیں۔ ناڈین گوڈیمر نے اپنے ہم وطن شاعر کے چند مصرعے اپنے خطبے میں درج کیے تھے ان کا خوب صورت ترجمہ باقر نقوی نے یوں کیا ہے:

ہم ادب کے متوالے/ زندگی کی وادی سے سر نکال کر گویا/ سامنے کے چہروں کو دیکھتی نگاہوں کو/ صفحہ صفحہ پڑھتے ہیں، جھانک جھانک پڑھتے ہیں/ اور یہ ہنر ہم نے/ بار بار جی کر زندگی سے سیکھا ہے

سلواتورے کازمیدو نے اپنے خطبے میں بعض نہایت بلیغ نکات بیان کیے ہیں جن پر غور و فکر اور مکالمے کی گنجائش ہے۔ وہ کہتے ہیں:

آفاقیت کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے نہ تھا، ایک انسان دوسرے انسان کے لیے اس کا اضافہ کرتا ہے۔

بودلیئر نے ''بدی کے پھول'' کو علامت بنایا۔ وان گو نے مصوری میں تصورِ حسن کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ کازمیدو بھی شاعری کے باب میں انوکھا نقطۂ نظر رکھتے ہیں:

میرے نزدیک حسن صرف مطابقت یا ہم آہنگی میں ہی نہیں بلکہ ناہمواری اور بے ڈھنگے پن میں بھی ہوتا ہے اس لیے کہ کبھی کبھی ناہمواری بھی درست شعری پیکر کا روپ بھر لیتی ہے۔

تمام نوبیل خطبات یہ اور اس طرح کے متعدد فکر انگیز مسائل سے معمور ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہماری نئی نسل خصوصیت کے ساتھ نقد و نظر کے نئے زاویے تلاش کر سکتی ہے۔ یہ چراغ اس قدر روشن ہیں کہ ان سے متعدد ذہنوں میں اُجالے کی بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔

نوبیل ادبیات کی نسبت سے ایک اور پہلو پر بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اور وہ ہے نوبیل ادیبوں کے کوائف کی فراہمی۔ باقر نقوی نے جس کتاب یا کتابوں سے یہ خطبات منتخب کیے ہیں ان میں یہ کوائف شامل نہیں تھے۔ یہ ایک مکمل ریسرچ کا کام تھا جو باقر نقوی نے بڑی محنت توجہ اور دیدہ ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ گویا معلومات کو ریزہ ریزہ جمع کر کے ایک شکل دینے کا مرحلہ تھا جس سے باقر نقوی بہ حسن و خوبی گزرے ہیں۔

باقر نقوی کی شخصیت کا ایک رُخ ان کی ادبی دیانت داری ہے۔ عزیز حامد مدنی کے بعد یہ دوسری مثال میرے سامنے ہے جنھوں نے متعلقہ ادارے سے اجازت حاصل کر کے ان تراجم کی اشاعت ممکن بنائی۔ اس ضمن میں باقر صاحب کو بھی مدنی صاحب کی طرح بے شمار مسائل اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک صحت مند روایت کو اپنانے کی خاطر وہ اس منزل سے بھی سلامت روی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

روایات کا باغی

باقر نقوی ایک دھیمے، خوش رُو، خوش خُو، دل آویز، مخلص اور پُرکشش انسان ہیں۔ بعض اوقات اُن کی شاعری پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایسے مرنجاں مرنج نظر آنے والے انسان کے احساسات، فکر اور لہجے میں ایسی شدت، کاٹ اور چیزوں کے باطن میں اُتر کر اُنھیں سمجھنے کی ایسی زبردست بصیرت کہاں سے در آئی ہے! اُن کے اندر کا شاعر باقر نقوی ایک ایسا دلیر، پُرجوش اور روایات کا باغی انسان ہے جو معاشرتی ناہمواریوں، دولت اور مراتب کی غیر منصفانہ تقسیم اور انسان کے انسان پر ظلم اور استحصال کے خلاف صرف سوچتا ہی نہیں بلکہ اپنی اس سوچ کو زمانے بھر میں پھیلانا اور پھر اس کا مثبت نتیجہ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے معاشرے سے اسی گہری کمٹ منٹ کا نتیجہ ہے کہ اتنے برس وطن سے دور رہنے کے باوجود بھی باقر نقوی کی شاعری میں کہیں بھی کسی بھی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ بلاشبہ شاعروں کی اُس نمائندہ اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں جس کے حوالے سے کسی دور کو پہچانا اور پرکھا جاتا ہے۔

امجد اسلام امجد

''شب کے خزانے''

(باقرؔ صاحب کے تیسرے اور چوتھے شعری نسخوں کی شبیہہ)

اقبال بھٹی (برمنگھم، یو۔کے)

○

جز اندھیرے کے نہ کچھ شب کے خزانے سے ملا　　کتنا سکھ تجھ کو چراغوں کے بجھانے سے ملا
زرنگاری نہ بزرگوں کی پسند آئی مگر　　کتنا زر اُن کی قباؤں کے جلانے سے ملا
دوستی کے نہیں قابل تو عداوت ہی سہی　　سلسلہ کوئی تو شاہی کے گھرانے سے ملا
کس کو پہچانیے کس کس کے لیے غم کیجیے　　ایک انبار درندوں کے ٹھکانے سے ملا
پائے بازار نہ گلزار نہ سونا سی زمیں　　جتنا احساس ملا صرف ترانے سے ملا
سر اُٹھانا تو کبھی راس نہ آیا باقرؔ　　جو بھی اعزاز ملا سر کو جھکانے سے ملا

...... ☆ ......

کھڑکیوں سے بھی اگر دھوپ نہ آئی ہوتی
ہم نے دن ہوتے ہوئے شمع جلائی ہوتی
اپنی آنکھوں کو اگر ہم بھی بچا لے جاتے
سانس لیتے ہوئے منظر سے برائی ہوتی
لوگ مرعوب بہت ہیں تری محرابوں سے
بیل ہی کوئی ستونوں پہ چڑھائی ہوتی
میری آنکھوں کے دریچوں میں سبھی رنگ اس کے
دل کی دیوار بھی کاش اُس نے سجائی ہوتی
ہم کو منظور نہ تھی قیدِ وفاداریِ شہ
ورنہ پیروں میں بھی زنجیرِ طلائی ہوتی
سارے تہوار گزر جاتے ہیں سُونے سُونے
یہ عمارت بھی کبھی تو نے سجائی ہوتی

○

یہ بھی کیا ہجر کے ماروں کی پذیرائی ہے
عطرِ مہتاب لگائے ہوئے رات آئی ہے
رُوئے ہر گل میں مجھے اُس کی شباہت آئے
پھول جھوٹے ہیں کہ جھوٹی مری بینائی ہے
جزر و مد رنگوں کے دیکھو تو پریشان نہ ہو
اُس کی آنکھوں کی سمندر سے شناسائی ہے
کم سے کم اُس سے ترا وصل اُجاگر ہوتا
وہی تصویر جو میرے لیے بنوائی ہے
یوں بھی کیا ہوتا ہے اعلان شکستِ دل کا
تجھ سے بڑھ کر تو ستم گر تری شہنائی ہے
ہے حسیں اتنا ترا شہرا کہ اس میں رہنا
ہم غریبوں کے لیے باعثِ رُسوائی ہے

○

''چہارسُو''

○

دو دن سکھ سے جینا ہو تو مانو میرا کہنا — کچے ساحل پر مت بسنا کشتی میں مت رہنا
دیکھ ہمارے ہاتھ ہیں خالی پاؤں بھی خالی خالی — خود پہنے ہے سونا چاندی ہم کو بھی کچھ پہنا
تم بھی دیکھو ہم بھی ڈھونڈیں ملنے کے کچھ رستے — ہم دونوں کو جانے کب تک ہے اس شہر میں رہنا
تیرا آنا جانا موسم، چھونا جیسے شبنم — رنگ ہوں جیسے پیر کے دھووَن خوشبو جیسے گہنا
پاؤں تلے کی سوکھی مٹی نعمت سمجھو باقرؔ — اونچی نیچی لہروں پر آسان نہیں ہے بہنا

...... ☆ ......

کیسا کیسا آدمی دنیا کے مے خانے میں ہے
کوئی پیمانے کے باہر کوئی پیمانے میں ہے
ٹوٹ کر گل دان میں سجنے سے مرجاتا ہے پھول
زندگی تو شاخ پر کھلنے بکھر جانے میں ہے
کیسے کیسے رُوپ بھر لیتا ہے پانی کا بدن
کیا مزہ اے برف گرمی سے پگھل جانے میں ہے
چل گیا ہے دیکھ کیسی چال شاطر آسماں
تیرے خانے کا ستارہ اب مرے خانے میں ہے
کوئی طائر لوٹ کر پھر اپنے گھر جاتا نہیں
جانے کیسی خاصیت اس کھیت کے دانے میں ہے
راس اُسی کو آئے گی باقرؔ ہوا کی دوستی
جس کا سارا حسن خوشبو بن کے لہرانے میں ہے

○

کہاں کی لفظ گری، کیسے شاعرانہ رہے
وہ جس کو شام وسحر فکرِ آب و دانہ رہے
ڈرے گا کیا ستمِ برقِ آسمانی سے
وہ جس کا تار پہ بجلی کے آشیانہ رہے
ہے ڈھلتی عمر میں یہ غسلِ آفتابی کیا
تمام عمر تو تم زیرِ شامیانہ رہے
اُنھیں کے ہاتھ لگی شہر کی نگہبانی
جو اپنے گھر میں رہے بھی تو مجرمانہ رہے
کوئی تو زخم شکایت کے واسطے رکھوں
کوئی تو ان سے ملاقات کا بہانہ رہے
رہے گی کیا یہی اک میل جول کی صورت
مری جبیں رہے اور تیرا آستانہ رہے

○

موتی موتی رنگ (۱۹۹۷ء)

○

ہم مجبور کسانوں کو مالک آسانی دے　　نہروں سے چھٹکارا ہو، نعمت بارانی دے
ہم نے منزل منزل بوئے نئے، انوکھے بیج　　اب یہ کام مسافر کا ان سب کو پانی دے
دل میں بہتی نہریں اک اک کر کے بند ہوئیں　　کوئی ستم گر بھیج، کوئی نشتر امکانی دے
کب تک چاند کا سایہ اس کو گہن لگائے گا　　میری زمیں کو بھی سورج جیسی تابانی دے
مالک میرے شہر میں بسنے والی اک مخلوق　　صورت تو انسان کی ہے، عادت انسانی دے

...... ☆ ......

جو اہلِ شہر کے ایمان کا سبب ہوں گے
وہ معجزے مرے پروردگار کب ہوں گے
چھلکتے جام کو دیکھوں تو دل یہ سوچتا ہے
جو سیر ہوں گے وہ کیا خوش نصیب لب ہوں گے
کسے خبر تھی کہ سورج کے گھر کے چشم و چراغ
سفیرِ شام بنیں گے نقیبِ شب ہوں گے
اسی طرح سے جو ٹھہرا رہا غبار تو پھر
جو حادثے نہ ابھی تک ہوئے تھے اب ہوں گے
شکستِ شہرِ تمنا، سقوطِ وادیِ لب
یہ ظلم پہلے ہوئے تھے نہ ہم سے اب ہوں گے
تم ایسے گلشنِ ناآشنا میں ہو باقرؔ
کہ جس میں گل بھی کھلیں گے تو کم نسب ہوں گے

○

اُنھیں سے بام سجیں گے وہی سقف ہوں گے
جو سارے قریے کے اشراف کے شغف ہوں گے
نہیں ہے کل کا کوئی خوف سنگریزوں کو
اُنہیں ہو فکر جو پروردۂ صدف ہوں گے
نہ اس قدر قدِ بالا پہ اپنے ناز کرو
بلند ہوں جو زیادہ وہی ہدف ہوں گے
وہ دن بھی آئے کہ جب لڑکیوں کے ہاتھوں میں
حنا کے رنگ سجے ہوں گے اور دف ہوں گے
وہ یومِ صدق جب آئے گا، اپنے ہاتھوں میں
ہمارے اپنے ہی اعمال کے حلف ہوں گے
علیؑ کے عشق میں ہم کو یقین ہے باقرؔ
ہماری خاک کے ذرے دُرِ نجف ہوں گے

○

○

کیا کھیل ہے، ماتھا بھی وہی، در بھی وہی تھا — اندر بھی وہی شخص ہے، باہر بھی وہی تھا
مے خوار بہت خوش تھے کہ ساقی ہے کوئی اور — افسوس کہ مے بھی وہی، ساغر بھی وہی تھا
یوں ہی تو نہیں بنتے ہیں صحرا و بیاباں — قطرہ بھی وہ، دریا بھی، سمندر بھی وہی تھا
بتلاؤ تو پھر کس کے طرف دار تھے ہاتھی — پورس بھی وہی شخص سکندر بھی وہی تھا
امیّد بہت جس سے رکھی بت شکنی کی — افسوس کہ بت بھی وہی آذر بھی وہی تھا

...... ☆ ......

چشمِ تاجر کی ضرورت ہو نہ بازار چنے
جنس وہ ہے کہ جو خود اپنا خریدار چنے
اپنا احوال بھی کچھ کوفہ و بغداد سا ہے
کیسی ساعت میں گئے شہر کے آثار چنے
کوئی کیوں وجہِ ملامت ہو کہ ہم نے خود ہی
گل، گہر چھوڑ دیے، سنگ چنے، خار چنے
کھیل یہ اپنے عمل کا ہے مقدر کا نہیں
کوئی سولی پہ چڑھے اور کوئی دربار چنے
اب نہ آ پائے گا وہ دَور کہ باؔقر جس میں
خونِ سیّد سے کوئی شہر کی دیوار چنے

○

بغیر اِذن کوئی لفظ بولتا نہیں وہ
مگر وہ کون ہے یہ راز کھولتا نہیں وہ
تمام رات تو کرتا رہا شکایتِ شب
سحر ہوئی ہے تو کیوں آنکھ کھولتا نہیں وہ
مہک وہی ہے وہی رنگ روپ ہے پھر بھی
مرے مزاج میں اب رنگ گھولتا نہیں وہ
ہوئے ہیں منکشف اُس پر زر و جواہر یوں
اب اپنے آپ کو پھولوں میں تولتا نہیں وہ
تمہارے سامنے کیا نغمہ ریز ہو باؔقر
کہ گرم ریت پہ شبنم تو رولتا نہیں وہ

○

ذہانت کیا ہے

باقر نقوی

راقم کے اپنے علم اور خیال کے مطابق دنیا کی ہر ذی روح ، نباتات، حیوانات، اجنہّ اور انسان سب کی تکمیل، بقا اور نشو ونما کے لیے ان کا خالق ان کو اتنی ذہانت ضرور عطا کرتا ہے جس کے بغیر ان کی حیات کے تسلسل کا تصور نا ممکن ہو۔

ذہانت کی دو سطحیں ہوتی ہیں:

(۱) غیر اختیاری یا جبلّی ذہانت

غیر اختیار ذہانت وہ جبلّت ہوتی ہے جس کے ذریعے مخلوق اپنے متعینہ دائرہ حیات میں پیدائش سے فنا کے مراحل تک لاشعوری طور پر عمل کرتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر نباتات کا اپنی نشو ونما کے لیے روشنی کی جانب رُخ کرنا اور روشنی کے حصول کے لیے جدو جہد کرنا، چھوئی موئی کی پتوں کا کسی لمس کے احساس سے خود بخود سمٹ جانا، جانوروں کا خوف ناک آواز سن کر ٹھٹھک جانا یا پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور ان نباتات کو کھانے سے پرہیز کرنا جو ان کی صحت کے لیے مضر ہوں، جسمانی بھوک کو مٹانے کے لیے شکار کرنا، نسل کی افزائش کے لیے اختلاط پر راضی ہونا، اپنی زندگی کی حفاظت کرنا وغیرہ۔

(۲) اختیاری ذہانت

خداوند کریم نے اختیاری ذہانت صرف اشرف المخلوقات کو عطا کی ہے جس کا دائرہ اثر غیر اختیاری ذہانت کی حدوں کے اختتام سے شروع ہوتا ہے۔ گویا خدا نے انسان کو دونوں طرح کی ذہانتوں سے نوازا ہے۔

ذہانت خلقت کے وقت قدرت کی طرف سے عطا کیا ہوا تحفہ ہوتی ہے۔ ذہانت اس عمل (Process) کو کہتے ہیں جو دماغ کے خلیوں میں جمع معلومات کے ذخیرہ data کو ہنر مندی سے برتتی (manipulate) یا استعمال کرتی ہے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے بعد عمل کے لیے جسم اور اس کے حواسِ خمسہ کو احکام صادر کرتی ہے۔ ان احکام کے نتیجے میں جسم دیکھتا ہے، سنتا ہے، حرکت کرتا ہے، بولتا ہے، سوچتا ہے، کسی عمل پر حالات کے مطابق ردِ عمل ظاہر کرتا ہے اور متعینہ ہدف حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ذہانت عطیۂ قدرت کی صورت میں ورثے میں ملتی ہے۔ ذہین ہونا یا غبی ہونا انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کسی غبی انسان کا بچہ انتہائی ذہین بھی ہوسکتا ہے اور ذہین ماں باپ کا بچہ غبی بھی ہوسکتا ہے۔ یہ کیوں اور کیسے ہوتا ہے اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں اس لیے کہ یہ جینیاتی مسائل ہیں اور ان کے لیے بہت کچھ بیان کرنا ہوگا سوائے اس کے کہ جینیات (Genetics) کے عمل کے ذریعے صرف والدین ہی سے نہیں پچھلی کسی نسل کی بھول بھٹکی گم گشتہ خصوصیت بھی اچانک کسی بچے میں نمودار ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر سیاہ آنکھوں والے ماں اور باپ کے ہاں نیلی آنکھوں والی اولاد کی پیدائش بھی ہو سکتی ہے۔ آنکھوں کا نیلا پن پچھلی کسی پیڑھی سے گھومتا پھرتا جینیات کی تحیر خیز محرکات کی وجہ سے نمودار ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں راقم کی کتاب "خلیے کی دنیا" میں جینیات اور اس کے عوامل کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

یہ ہرگز ضروری نہیں کہ کسی سائنس دان کی اولاد بھی سائنس دان ہو، کسی مہندس کی اولاد بھی انجینئر ہو یا کسی ادیب یا شاعر کی اولاد بھی ادیب یا شاعر ہو۔ اور یہ بھی قطعاً ضروری نہیں کہ کسی عام سطح کی ذہانت رکھنے والے ماں باپ کے ہاں کوئی نابغۂ روزگار پیدا نہیں ہوسکتا۔ نیلی آنکھوں والی مثال کے مطابق یہ قطعاً ممکن ہے کہ پچھلی کسی نسل میں گزرے ہوئے کسی ذہین شخص کے وراثتی اثرات نومولود میں اس طرح ظاہر ہوں جس کا بظاہر کوئی امکان نظر نہ آئے۔ اس کے لیے وقت کی بھی کوئی قید نہیں۔

عام الفاظ میں اگر بیان کیا جائے تو ذہانت کو ایک خراد کی (lathe) مشین کی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مشین میں اوزار یا اشیا بنانے کی صلاحیت ہے، اس سے سیدھی سادی اور پیچ دار دونوں طرح کی چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔ چیزیں بنانے کے لیے خام مال درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسا خام مال ہوگا جیسا فن ہوگا اور جیسا نقشہ (design) ہوگا ویسا ہی سامان بن کر نکلے گا۔ اگر مشین کو غلط قسم کا خام مال مہیا کیا جائے گا تو غلط اور خراب اشیا بنیں گی۔ اچھا خام مال ہوگا، اچھا ڈیزائن ہوگا تو اچھے قسم کی مصنوعات حاصل ہوں گی۔ ان اعمال میں مشین کا ہنر مندی سے استعمال بھی اثر پذیر ہوگا۔ اگر مشین کو استعمال نہ کیا جائے تو کچھ دنوں بعد زنگ آلودہ ہو کر ناکارہ ہو بھی سکتی ہے۔ اگر مشین کو اس کی استطاعت سے زیادہ استعمال کیا جائے گا تو تیار ہونے والی مصنوعات کا معیار گر جائے گا اور دوسرے یا تیسرے درجے کی اشیاء تیار ہو کر نکلیں گی۔

ذہانت کی مشین کو ہنر مندی سے استعمال کرنے کے لیے اطلاعات (Information) کے خام مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے یعنی مشاہدات اور تجربات کا وہ خزانہ جس کے اکتساب سے ذہانت کا استعمال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی کوئی بچہ عمارتوں کے نقشے نہیں بنانے لگتا، شعر نہیں کہنے لگتا، افسانے نہیں لکھنے لگتا یا سائنسی ایجادات نہیں کرنے لگتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے دماغ کا وہ حصہ جو اطلاعات کے گودام کا کام کرتا ہے کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ ایک نوزائیدہ بچے کو قدرت کی جانب سے عطا کردہ جبلّت کا سب سے پہلا مظاہرہ زندہ رہنے کے لیے کچھ کھانے کی کوشش کرنا، غذا نہ ملنے کی صورت میں رونا اور اپنے غیر محفوظ ہونے کے احساس کے ردِ

عمل سے ہوتا ہے۔اسی لیے سب سے پہلے بچہ اپنا انگوٹھا یا انگلیاں اپنے منہ میں ڈالتا ہے۔اور اپنی حفاظت کے لیے جو کچھ بھی اس کے ہاتھ آتا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔اگر آپ کسی نوزائیدہ بچے کے ہاتھ میں اپنی انگلی دیدیں تو اس کو وہ اپنی پوری قوت سے گرفت میں لے لیتا ہے۔جیسے جیسے بچے کی عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اس کی گرفت ڈھیلی ہوتی جاتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی بچہ اپنی ماں کو نہیں پہچانتا سوائے اس کی خوشبو اور اُس کی آواز کے۔اس کی قوتِ شامّہ کو جو سب سے پہلی خوشبو ملتی ہے وہ ماں کے جسم کی ہوتی ہے۔صرف انسان ہی نہیں ہر مخلوق کے بچے پہلے پہل اپنی ماؤں کو ان کے جسم کی خوشبو ہی سے پہچانتے ہیں جو ولادت کے وقت سے بار بار ان کو ملتی رہتی ہے اور وہی ان کی پہلی اطلاع ہوتی ہے۔ چڑیوں کے بچوں کی پیدائش کے بعد کئی دنوں تک ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلتیں لہٰذا ماں کی پہچان کا ذریعہ صرف اس کے جسم کی خوشبو ہی ہوتی ہے۔ماں کے جسم کی خوشبو کے ساتھ ساتھ بچے کی قوتِ سامعہ ماں کی آواز سنتی ہے اور بار بار اسی آواز کے سننے سے اس کو ماں کی پہچان کا ایک اور ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

بچہ جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس کی آنکھیں ماں کی صورت کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتی ہیں اور اسی صورت کو بار بار دیکھنے سے اس کی عادی ہو جاتی ہیں۔ بچہ جب کسی شے کو دیکھ کر پکڑنا چاہتا ہے تو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔پہلی کوشش میں اس کا ہاتھ اس شے تک نہیں پہنچ پاتا لہٰذا دوسری، تیسری کوشش میں وہ اپنے ہاتھ کی حرکت کو صحیح کرتا ہے اور trial and error کے عمل سے گزر کر پھر اس کو یا اسی قسم کی شے کو پہلی ہی کوشش میں پکڑنے لگتا ہے۔ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بچہ اپنے تجربات میں اضافہ کرنے کے لیے ہر نظر آنے والی چیز غور سے دیکھتا ہے اور پھر اس کی طرف جھپٹتا ہے۔اگر اس شے کو چھونے سے اس کا ہاتھ جل جاتا ہے یا اس کو کسی قسم کی تکلیف پہنچتی ہے تو بچہ دوبارہ اس شے کو چھونے سے پرہیز کرتا ہے اور اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک کہ اس کا ذہن اس شے کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ نہ کر لے کہ اس یا ایسی ہی نظر آنے والی شے کو چھونے سے کتنا نقصان ہوگا یا اس کو چھونے کا محفوظ طریقہ کیا ہونا چاہیے۔

پیدائش کے وقت بچے کے دماغ میں استعمال ہونے والا اطلاعات کا خزانہ بالکل خالی ہوتا ہے۔جیسے جیسے بچہ بڑھتا جاتا ہے اس کے تجربات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ ''عاقل'' اور ''ذہین'' ہوتا جاتا ہے۔ان مثالوں کی بنا پر ہم ایک حتمی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نوزائیدہ بچہ ذہانت کی مشین کے ہوتے ہوئے بھی کسی تخلیقی عمل کے لائق نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے اپنے دماغ کو تجربات بہم نہیں پہنچا لیتا۔اور منطقی طور پر یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ بچے کے تجربات کی پہنچ میں آنے والا خام مال جتنا اچھا، جتنا زیادہ ہوگا اور اس میں جتنا تنوع ہوگا، ذہانت اتنی ہی کامیاب ہوگی اور اس کی شخصیت، اس کی ذہانت، اس کے اعمال اور اس کی تخلیقات اتنی ہی رنگارنگ اور بوقلموں ہوں گی۔

انسان کے تجربے میں آنے والے خام مال یا معلومات کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں مگر ہم ان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔(۱) بنیادی اطلاعاتی معلومات Basic Information اور (۲) تجرباتی معلومات Processed Information۔

بنیادی اطلاعاتی معلومات کی چند مثالیں:

ہلکی شے پانی پر تیرتی ہے۔۔۔ٹھوس شے ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف جاتی ہے، جب کہ ہلکی شے نیچے سے اوپر کی جانب اٹھنے کی کوشش کرتی ہے۔۔۔آگ زمین پر گرتی ہے جب کہ دھواں اور شعلہ زمین سے آسمان کی جانب سفر کرتا ہے۔

سیّال شے بھاری ہونے کے باوجود نشیب کی طرف بہتی ہے۔۔۔آگ ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔۔۔گھاس سبز رنگ کی ہوتی ہے۔۔۔پتے سبز رنگ کے ہوتے ہیں۔۔۔ٹھنڈی آب وہوا میں رہنے والے انسان گوری رنگت کے ہوتے ہیں، گرم ممالک کے لوگ سیاہ فام ہوتے ہیں۔وغیرہ

تجرباتی معلومات کی چند مثالیں:

بھاری شئے پانی پر تیر سکتی ہے، بشرطے کہ اس کی ہیئت کشتی جیسی ہو جس میں پانی داخل نہ ہو سکے۔

ٹھوس شے نیچے سے اوپر کی طرف جا سکتی ہے بشرط یہ کہ اس کو اوپر لے جانے کے لیے طاقت کا استعمال کیا جائے یا اس کی شکل ایسی بنائی جائے کہ فضا میں موجود ہوا اس کو زمین پر گرنے سے بچنے کے لیے سہارا دے سکے۔۔۔قوت کے استعمال سے آگ نیچے سے اوپر کی طرف بھی جا سکتی ہے اور دھواں اوپر سے نیچے کی طرف بھی جا سکتا ہے۔۔۔سیّال شے کو طاقت کے استعمال سے نشیب سے فراز کی طرف بہایا جا سکتا ہے۔۔۔گھاس سبز رنگ کی ہونے کے باوجود خشک ہو کر سبز نہیں رہتی۔۔۔آگ پر پانی ڈالا جائے تو بجھ جاتی ہے اور پھر نقصان نہیں پہنچا سکتی۔۔۔پانی کو دیر تک آگ پر رکھا جائے تو اُڑ جاتا ہے۔۔۔پتے موسمِ خزاں میں درجۂ حرارت کی تبدیلی کی وجہ سے پیلے ہو جاتے ہیں۔

گرم آب وہوا میں رہنے والے گوری رنگ کے بھی ہو سکتے ہیں۔

ٹھنڈی آب وہوا میں پلنے والے سیام فام بھی ہو سکتے ہیں۔وغیرہ

یہاں اسی طرح کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر طوالت کی بنا پر اتنا ہی لکھ دینا کافی ہوگا کہ تجرباتی خام مال اطلاعاتی خام مال کے ہنرمندی سے برتنے یا الٹ پھیر کرنے سے بھی مل سکتا ہے اور کسی دوسرے کے تجربے کو سن کر یا دیکھ کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔گویا معلومات صرف معلومات بھی ہو سکتی ہیں، تجربے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہیں اور ممکنات کے تصورات کے خاکے کی صورت میں بھی۔

انسانی معلومات کا خزانہ (Information databank)

اطلاعاتی ہو یا تجرباتی سب مشاہدات اور تجربات کے ذریعے بڑھایا جا سکتا ہے،

یہی ذہانت کے استعمال میں بھی آتا ہے اور اسی کے ذریعے دماغ اور ذہن مل کر تخلیق کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تجرباتی معلومات کا خزانہ جتنا بڑا ہوگا دماغ کو اس سے تیزی سے استفادہ کرنے میں مدد ملے گی۔ خام مال میں جتنا تنوع ہوگا ذہانت اتنی ہی کامیاب نقش گری کے قابل ہوگی اور تخلیق اتنی ہی رنگا رنگ اور بوقلمونی کی حامل ہوگی اتنی ہی اعلیٰ اور حیرت انگیز ہوگی جس درجے اور جس پائے کی اور جتنی زیادہ اطلاعی و تجرباتی معلومات دماغ کے خزانے (ڈیٹا بینک) میں محفوظ ہوں گی اور ذہانت جتنی درّاک اور تیز ہوگی۔

اس کی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ اگر انسان کے کسی بچے کو پیدا ہوتے ہی جنگل میں چھوڑ دیا جائے جہاں مہذب دنیا سے اس کا کوئی رابطہ نہ ہوتو باوجود تمام تر انسانی جبلّت اور ذہانت کے اس کا عمل اور ردِّعمل جانوروں جیسا ہی ہوگا اس لیے کہ اس کے دماغ میں ذہانت کے استعمال کے لیے جو خام مال مہیا ہے وہ صرف اور صرف جنگل کے ماحول کا ہوگا۔ اردو بولنے والے والدین کے بچے کی پرورش اگر روسی زبان بولنے والے معاشرے میں ہوگی تو وہ اردو کے بجائے روسی زبان ہی بولے اور سمجھے گا، اس لیے کہ روسی زبان ہی ہمہ وقت اس کے کانوں کے پردے سے ٹکراتی رہی ہے۔ گویا ذہانت کی مشین اپنی تمام تر درّاکی کے باوصف وہ کچھ نہیں کرسکے گی جو انسانی یا اردو کے ماحول میں رہ کے کر سکتی ہے۔

انسان کی خلقت کے دوران اس کو جتنی ذہانت ملے اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی، کم ہوسکتی ہے اس صورت میں کہ اس کا غلط استعمال کیا جائے۔ یہ کہنا شاید غلط ہوگا کہ انسان کوشش کرے تو اس کی ذہانت میں اضافہ ہوسکتا ہے، یا یہ کہ وہ زیادہ ذہین بچہ بن سکتا ہے۔ تجربات اور مطالعے کے ذریعے زیادہ معلومات اکٹھا کر کے انسان اپنی ذہانت کا زیادہ اور استطاعت کے مطابق درّاکانہ استعمال تو کرسکتا ہے اور بظاہر زیادہ ذہین نظر آسکتا ہے مگر اس کی بنیادی ذہانت کی مشین جو تخلیق کے دوران اس کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے، بڑھ نہیں سکتی۔ دنیاوی اور تکنیکی مثال کے طور پر ایک موٹر کار اگر زیادہ سے زیادہ سو میل کی رفتار سے بھاگنے کی صلاحیت کے لیے بنائی گئی ہوتو اس میں خواہ کیسا اور کتنا ہی ایندھن کیوں نہ بھر دیا جائے اور کتنی ہی جسمانی کوشش کیوں نہ کی جائے وہ اپنی مقررہ رفتار سے زیادہ بھاگ نہیں سکے گی۔ اچھے ایندھن سے اس کی رفتار سبک ہوسکتی ہے آرام دہ ہوسکتی ہے، زیادہ ایندھن سے ایک وقت میں زیادہ فاصلہ طے کرسکتی ہے مگر کسی طرح بھی اپنی حدِ رفتار سے تجاوز نہیں کرسکتی۔

راقم کے علم کے مطابق انسانی ذہانت میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ یہ جینیات کے میدان میں موجودہ کامیابیوں سے قبل کا کُلیہ تھا اور ابھی تک ہے مگر حالات جتنی تیزی سے تبدیل ہورہے ان کی روشنی میں یہ ممکن دکھائی دیتا ہے کہ اس وقت جب کہ جین کے ذریعے علاج ممکن ہو جائے گا اور ذہانت کی مشین بنانے والے جین اور ان کی کارکردگی کی مکمل نشاندہی ہو جائے گی، تو اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ ''علاج بذریعہ جین'' یعنی جین تھراپی کی گولیوں یا انجکشن کے ذریعے ذہانت میں اضافے والی جین جسم میں داخل کر کے انسان یا کسی بھی مخلوق کی ذہانت میں اضافہ کیا جاسکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی موٹر کار کے انجن میں تبدیلی کر کے اس کو زیادہ طاقتور بنا دیا جائے، ڈیزل سے چلنے والے انجن کو پٹرول سے چلنے والے انجن میں تبدیل کر دیا جائے، موجودہ انجن نکال کر اس کی جگہ اس میں زیادہ طاقتور انجن لگا دیا جائے یا موجودہ انجن میں کسی افزائندے (booster) کے اضافے سے اسکی کارکردگی کو بہتر بنا دیا جائے۔

علاج بذریعہ جین اگرچہ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے مگر اس میدان میں حیرت انگیز دریافتوں کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو دماغ کی بیماریوں (پاگل پن وغیرہ) میں مبتلا ہیں، شفایاب ہوسکیں گے۔ یہ کب ممکن ہوسکے گا، اس کے بارے میں ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے سوائے اس کے کہ اب تک اس جانب ترقی کی رفتار توقع سے زیادہ تیز جارہی ہے۔

ذہانت انسان میں جین کے ذریعے منتقل ہوتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں جین کے پرزوں سے حیاتین اور دوسرے مادّوں کے ذریعے جو احکامات صادر ہوتے ہیں ان ہی کی مدد سے اور دماغ کے خلیوں کے اجتماع سے ذہانت کی مشین یکجا (assemble) ہوتی ہے۔ ابھی تک کی جینیاتی دریافت کے مطابق انسان کی پیدائش کے وقت وراثت میں جین سے بنے آلۂ کارکردگی (processor) کی صورت میں صرف ذہانت ہی منتقل ہوتی ہے، خام مال یعنی والدین کی معلومات کا خزانہ منتقل نہیں ہوتا۔ یعنی تجربے اور اس کے نتیجے میں بننے والے افکار، احساسات، اشکال، مفروضے اور کیفیات وراثت میں نہیں ملتیں۔ مثال کے طور پر اگر علامہ اقبال کا ثانی (Clone) تیار کر بھی لیا جائے تو اس کا مزاج شاعرانہ تو ہوسکتا ہے مگر اقبالِ ثانی میں اتنی ذہانت نہیں ہوگی کہ وہ ''مسجد قرطبہ'' جیسی معرکتہ الآرا نظم کا خالق بن سکے۔

سائنس کے بارے میں ایک اور کلیہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سائنس اپنے کلیات کی خود نفی کرتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر، کبھی سائنس کے مطابق زمین چپٹی تھی مگر اس کی نفی ہوئی اور زمین کو گول مانا جانے لگا، کبھی یہ ایک کلیہ تھا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے مگر بعد میں یہ تسلیم کیا گیا کہ سورج نہیں، خود زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ لہٰذا سائنس میں کچھ حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر کسی دور میں کلوننگ کی سائنس اتنی ترقی کر جائے کہ اولاد کے استقرارِ حمل کے وقت والدین کے ذہن میں موجود اطلاعات کا خزانہ بھی وراثت میں مل جایا کرے۔ اگر ایسا ہو بھی جائے تو والدین کی نوعمری میں حمل ہو جانے کی صورت میں اطلاعات کا خزانہ بھی کم ہوگا بلکہ کبھی نامکمل اور ناپختہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ والدین کے اپنے تجربات کی ناپختگی، خرابی یا عیوب کی کیفیت میں حمل میں آنے والا بچہ اتنا عقیل یا کامل نہیں ہوگا جتنا کہ آگے چل کر اپنے تجربات کی بنا پر اس کے والدین ہوسکیں یا ہو جائیں گے۔

خلیہ

باقر نقوی

شاعروں کا عام طور پر خواب دیکھنے والے، خیالوں کے دشت میں سفر کرنے والے اور تقریباً بے عمل انسان سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس لیے کہ شاعروں کی اکثریت حقیقتاً کچھ اسی طرح کی ہوتی ہے۔ مستثنیات سے قطع نظر، اس میں ہرگز شک نہیں کہ بیش تر شاعر صرف خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف رہتے ہیں اور ماضی کے یا اپنے زمانے کے شاعروں کے خیالات، الفاظ اور ترکیبوں کی تکرار کرتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ادب کی تاریخ اس بات کی گواہی دے گی کہ سب شاعر ایسے نہیں ہوتے۔ غالب نے کہا تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

تو یہ سچ ہے کہ سچے شاعر اکثر ایسے سچ شعر کہہ جاتے ہیں جو کبھی تو بہت تلخ حقائق کی پردہ دری کرتے ہیں اور کبھی کبھی پیشن گوئی بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ہر دور میں ایسے سچے شاعر ملیں گے جو اس منصب پر فائز نظر آتے ہیں۔ میر، غالب، نظیر، مومن، حالی، اکبر، اقبال وغیرہ اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

میرے خیال میں اور میری کوتاہ علمی استعداد کے مطابق اس کتاب کے موضوع پر جو شعر سب سے زیادہ سجتا ہے وہ لکھنو کے دبستان شاعری کے ایک صاحب فکر شاعر چکبست نے شاید کسی الہامی کیفیت میں ڈوبے ہوئے لمحے میں لکھا ہوگا۔

پنڈت برج نارائن چکبست نے آج سے تقریباً سو برس قبل شعر لکھا تھا:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف زندگی بلکہ کرہ ارض پر پائی جانے والی ہر شے خواہ وہ بے جان ہو یا جان دار، کچھ عناصر کی حیرت انگیز ترتیب سے ہی وجود میں آئی ہے۔ بے جان اشیاء، جامد یعنی غیر متحرک اور جان دار اشیاء حرکت پذیر ہوتی ہیں۔ اردو زبان میں زندگی عام طور پر حرکت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہر وہ شے جو حرکت کرتی ہو یا کر سکتی ہو جان دار کہلاتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ زندگی کیا ہے۔ زندگی کس علامت کو کہتے ہیں، اگر صرف حرکت ہی زندگی کی علامت ٹھہری تو پھر انسان کی بنائی ہوئی مشینیں اور سواریاں مثلاً بائیسکل، موٹر کار، ریل گاڑی، دخانی کشتی، ہوائی جہاز اور راکٹ سب زندہ تصور کیے جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے لہٰذا یہ طے ہوا کہ وہ اشیاء جو صرف کسی بیرونی دباؤ، طاقت یا زور کے بل پر ہی حرکت کریں ان کو زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ زندہ یا زندگی کی حامل ان اشیاء کو کہا جا سکتا ہے جو کم از کم۔

☆ کس غذا پر انحصار کریں
☆ قوت حس رکھتی ہوں
☆ نشوونما اور تغیر پذیر ہوں
☆ ان میں کیمیائی عمل (Metabolism) جاری وساری ہو
☆ اپنی افزائش نسل کے مراحل سے گزرتی ہوں

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ زندگی کی علامت سے مملو وہ بنیادی جز جس کو ہم خلیہ کہتے ہیں کس طرح وجود میں آیا۔

کروڑوں برس تک کرہ ارض کا جس کو ہم زمین کہتے ہیں ماحول ہائیڈروجن (Hydrogen) گیس سے بھرا ہوا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس گیس میں زمین کی سخت اور شدید گرم سطح سے اٹھنے والے بخارات اور کئی دوسرے اجزاء شامل ہوتے گئے۔ زمین ٹھنڈی ہوتی گئی، ماحول یا فضا کے بخارات ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے مائع (Liquid) میں تبدیل ہوتے گئے، بھاپ بنی، بادل وجود میں آئے، شدید بارشیں شروع ہوئیں، پانی رواں ہوا، لاکھوں برس تک اسی کیفیت کی وجہ سے دریا بنے، جھیلیں وجود میں آئیں اور رفتہ رفتہ سمندر بنتے گئے۔ بادلوں میں حرکت اور ان کے آپس میں ٹکراؤ کے باعث آسمانی بجلی پیدا ہوئی۔ بجلی کی کڑک چمک اور الٹرا وائٹ تاب کاری (Ultra Voilet Radioactivity) کی وجہ سے مالیکیول (Molecule) وجود میں آئے اور پانی و مٹی کا جز بنے۔ کافی عرصے تک ان اشیاء کے ملاپ اور اس کے ردعمل سے امائینو ایسڈ (Amino Acid) اور لحمیات (Proteins) پیدا ہوئے جو در اصل زندگی کا بنیادی مصالحہ بنے۔

سارا عمل اور ردعمل کیسے ہوا اور اس کا ثبوت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بیسویں صدی کے سائنسدانوں نے اپنی تجربہ گاہوں میں میتھین (Methane) ایمونیا (Ammonia) ہائیڈروجن اور پانی کے محلول میں بجلی کی لہریں گزار کر امائنو ایسڈ، شکر، پروٹین اور چکنائیاں بنا کر دیا۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کا غالباً پورا ادراک نہ رکھتے ہوئے بھی چکبست نے اپنے سو برس قبل لکھے ہوئے شعر میں کہا تھا۔ آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ زندگی کے بنیادی اجزاء یہی ہیں اور ان ہی کے ملاپ اور عرصہ دراز کے ردعمل سے زندگی کے عمل کا پہلا پتھر یعنی زندہ خلیہ (Living Cell) وجود میں آیا۔

یہ سب کچھ جو اتنی آسانی سے چند جملوں میں بیان ہو گیا اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ سب کروڑوں برس میں ہونے والے ردعمل تبدیلیوں اور ارتقاء کے

نتیجے میں ہوا جس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہزاروں صفحات تو کیا کئی کتابیں لکھنی پڑیں گی جو اس کتاب کا مقصود نہیں۔ یہ سارے عوامل اور ان کی ساری تفصیلات سائنسی کتابوں میں موجود ہیں۔ یہاں تو یہ ایک چھوٹی سی تمہید اس بات کی تھی کہ جان دار خلیہ جو ایک زندہ اکائی (Organism) ہے کس طرح وجود میں آیا۔ تو دراصل خلیہ ہی اس کتاب کا مرکزی کردار ہے۔

خلیہ کیا ہے، اس کی ساخت کیسی ہے، یہ زندہ کیوں مانا جاتا ہے، اس کی زندگی کی علامات کیا ہیں اور اگر یہ زندہ ہے تو اس کی مدت حیات کیا ہے اور یہ کیسے فنا کے مراحل سے گزرے گا؟

تاریخ بتاتی ہے کہ زندہ خلیے کے وجود کو برطانیہ کے مشہور سائنسدان رابرٹ ہک (Robert Hook) نے 1865ء میں دریافت کیا تھا۔

دنیا کے سارے نباتات اور حیوانات اگر تھوڑی دیر کے لیے عمارتیں تصور کر لیے جائیں تو ان میں استعمال ہونے والی اینٹیں، گارا (Cement) لگائے جانے والے شہتیر، پلستر، رنگ و روغن سب کچھ کسی نہ کسی قسم کے خلیے کی ترتیب، تلے اوپر رکھنے، ملانے یا جوڑنے سے وجود میں آتے ہیں۔ کسی نے سچ مچ دو گنا تو نہیں مگر ایک محتاط سائنسی اندازے کے مطابق ایک انسان تقریباً تین کھرب مختلف اقسام کے زندہ خلیوں کا مجموعہ ہے جب کہ ہر خلیہ زندہ رہنے کے لیے غذا استعمال کرتا ہے، سانس لیتا ہے، بڑھتا گھٹتا ہے اور چند اقسام کے علاوہ اپنی افزائش نسل بھی کرتا ہے۔

"ہلچل ہے کیس جسم کے اندر چھپی ہوئی"

حیرت کی بات ہے کہ ہمارے اپنے وجود کے اندر یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے مگر نہ ہماری آنکھ یہ سب کچھ دیکھ سکتی ہے نہ ہمارے کان کچھ سنتے ہیں اور نہ ہماری قوت حس اس کو محسوس کر سکتی ہے۔ خلیہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ اس کو نہایت طاقت ور خوردبین کے ذریعے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

اگرچہ یہ اس کتاب کا موضوع نہیں مگر یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ زندہ خلیے ایک طرف، کائنات کے سارے ذرات جن کو ہم بظاہر مردہ سمجھتے ہیں خود ان کے اندر ایٹم کے ذرات ہمہ وقت گردش میں رہتے ہیں۔

"رات دن گردش میں ہیں سات آسماں"

جرمنی کے دو ماہرین حیاتیات ایم۔ جے شیلڈن (M. J Sheildon) اور ٹی۔ شوان (T. Schwann) نے طاقت ور خوردبین ایجاد کر کے اس کی مدد سے تحقیق کے بعد یہ کلیہ پیش کیا کہ تمام جان دار اجسام خلیوں ہی سے بنتے ہیں، خلیہ ہی ہر جان دار کے تمام اعضا و جوارح کی ساخت اور افعال کی اکائی سے اور یہ سارے خلیے افزائش نسل اپنی تقسیم (Cell Division) کے ذریعے کرتے ہیں۔

سائنس دان اس بات سے متفق ہیں کہ زمین پر زندگی کی علامات میں سب سے پہلے صرف ایک خلیے پر مشتمل جراثیم (Single Cell Organism) خلق ہوئے۔ پھر جراثیم کے عمل اور اس کے ردعمل کے نتیجے میں زیر آب نباتات نے سر اٹھایا، لاکھوں برس بعد سمندری حیوانات وجود میں آئے، پھر زمینی نباتات، پھر حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) پھر حیوانات اور جب زمین پھولوں، پھلوں، اجناس اور رنگا رنگ نظاروں سے سج کر تیار ہوگئی تو اس محفل کے دولھا میاں یعنی حضرت انسان تشریف لے آئے۔

ہمارے ہیرو یعنی اتنے چھوٹے سے خلیے کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور یہ بقول چکبست کن عناصر کی ترتیب سے بنتا ہے؟ وہ جان دار جو صرف ایک خلیے سے وجود میں آتے ہیں مثلاً وائرس اور بیکٹریا ان کے خلیے نسبتاً سادہ (Simple Cell) ہوتے ہیں۔ ان کا نظامِ حیات دوسرے خلیوں جیسا ہی ہوتا ہے جن سے بڑے جان دار اجسام ظہور میں آتے ہیں۔

انسانی خلیے کے تین عمومی اجزاء ہوتے ہیں۔ (۱) ایک جھلی نما چادر جو خلیے کی "دیوارِ شہر" یعنی حدود کے تعین اور حفاظت کا کام دیتی ہے (۲) اس احاطے میں بھرا ہوا مختلف لحمیات، نمکیات اور پانی پر مشتمل گاڑھا سا محلول اور (۳) بیچ میں ایک خول نما مرکزہ (Nucleus) اور اس مرکزے کی تجوری میں مقفل چھیالیس کروموسوم (Chromosome) جو آپس میں مل کر تئیس جوڑے بناتے ہیں۔ ہر کروموسوم پر جو ایک تکلے یا باؤلنگ پن (Bowling Pin) کی شکل کا ہوتا ہے دھاگے جیسا لپٹا ہوا ڈی۔این۔اے (DNA) جو دراصل اس کاخ زندگی یعنی زندہ جسم کا مکمل اور تفصیلی تعمیراتی نقشہ (Blue Print) ہوتا ہے۔

گویا ہمارا اور آپ کا جسم تین کھرب مختلف قسم کے جان دار خلیوں کا مجموعہ ہے جس کے ایک ایک خلیہ میں (خون کے سرخ ذرات کے علاوہ) جس کا پورا تعمیراتی نقش وجود ہے، اتنا مکمل نقش کہ اگر کوئی خلیہ اپنے قبیلے (جسم) سے بچھڑ جائے تو ڈی۔این۔اے کے مطالعے اور تقابل سے بلا کسی شبہے کے پہچانا جا سکے کہ یہ کس جسم سے نکلا ہے۔ یعنی ایک قطرے میں پورا دجلہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

جرمنی کے مشہور معالج ڈاکٹر سیموئیل ہانے مان Dr. Samuel Hahnemann (1755ء۔۔۔1843ء) نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے استعمال سے ایک نیا طریقہ علاج دریافت کیا جس کو علاج بالمثل (Homeopathy) کہتے ہیں۔ اس طریقہ علاج کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مادہ (خواہ وہ زہر ہی کیوں نہ ہو) جو انسانی جسم پر مضر اثرات ڈالتا ہے خود اپنے اندر ان مضر اثرات سے پیدا ہونے والی بیماریوں کو رفع کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

"میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں"

میر تقی میر نے جب یہ شعر لکھا تھا اس وقت تک ہومیوپیتھی طریقہ

علاج دریافت نہیں ہوا تھا)۔

ہانے مان ابتداء میں عام طریقہ علاج کا ڈاکٹر تھا مگر اس نے بعض اشیاء کی کم مقدار میں جو طاقت (Potency) دیکھی اس پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی اور آج ہومیوپیتھی طریقہ علاج دنیا کے بیشتر حصوں میں مقبول ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو واقعتاً اگر کوئی مادہ یا زہر صرف اور صرف ہلاکت ہی کا موجب ہوتو ایسی شے کی خلقت ظلم کے مترادف ہوتی۔ لہٰذا کسی بھی شے سے پیدا ہونے والے مرض کا علاج خود اسی کے بطن میں مہیا کر کے خالق کائنات نے کیسا اچھا انصاف کیا ہے۔ اب اگر انسان عقل سے کام لے اور زہر کا استعمال فراست سے کرے تو اس سے ہلاکت کے ساتھ ساتھ شفا بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر ہانے مان نے جب ہومیوپیتھی طریقہ علاج کی دریافت کا اعلان کیا تو اس کے حق میں تجربات کے نتائج اور دلائل کے لیے کچھ مقالات لکھے۔ اپنے ایک مقالے میں ہومیوپیتھی اور اس میں پوشیدہ راز قدرت وخلقت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہانے مان نے لکھا کہ مجھے بے حد حیرت ان عقل والوں پر ہوتی ہے جو کارخانہ قدرت کے اتنے باقاعدہ محیر العقول اور بے مثال نظام تناسب کے مطالعے کے باوجود کہتے ہیں کہ خدا نہیں، تو کیا یہ سب خود بہ خود حادثاتی طور پر وجود میں آ گیا ہے اور اگر یہ حادثہ ہی تھا تو بھلا یہ قوانین، یہ ترتیب اور یہ تسلسل کیسے قائم ہے۔ آخر کون ہے جو اربوں برس سے بغیر کسی تعطل کے یہ کارگاہ کائنات وہستی کو چلا رہا ہے جس میں نہ کوئی انحراف ہے اور نہ کوئی سقم۔

☆

''کمالِ ہنر''

شاعرِ خوش فکر و تازہ نفس، یارِ طرح دار باقر نقوی گزشتہ تیس برسوں سے اپنے ہنرِ شعر کا جادو جگائے ہوئے ہیں اور یوں پوری دُنیا اُن کے کمالِ ہنر کا اعتراف کرتی ہے، مگر اُن کی شخصیت کی ایک اور قابلِ رشک جہت سائنس کے تازہ موضوعات پر اُن کی تحریروں سے نمایاں ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے میں اس طرح کے لوگ نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں جو بیک وقت کلاسیکی شعری روایت پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں اور عصرِ حاضر میں نمود و ظہور کرتی ہوئی سائنسی دریافتیں بھی اُن کی نظر سے اوجھل نہیں ہیں۔

''مصنوعی ذہانت'' کے عنوان سے پیشِ نظر کتاب اردو میں اپنے موضوع کے اعتبار سے شاید پہلی کتاب ہوگی۔ بکھرے ہوئے مضامین کو بلحاظِ موضوع منتخب کرنا اور سلیس و سادہ زبان میں عوام تک پہنچانا باقر نقوی کا ایسا کارنامہ ہے، جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ جدید تر موضوعات میں مستعمل سائنسی اصطلاحات کے تراجم اور اُن کی عام فہم تعریف وتفسیر جس انداز سے کی گئی ہے وہ میرے اس یقین کی توثیق وتصدیق کرتی ہے کہ اگر زبان و بیان پر دسترس ہو اور مترجم موضوع پر محکم گرفت رکھتا ہو تو کوئی بھی سائنسی علم ایسا نہیں ہے جو اُردو میں منتقل نہ کیا جاسکتا ہو۔ ''مصنوعی ذہانت'' میں شامل مضامین عہدِ جدید کی علمی ضرورتوں کو پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ باقر نقوی کی یہ خدمت اردو میں سائنسی مضامین کے موضوع پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور عوام وخواص دونوں طبقوں کے لیے یکساں طور پر فائدہ مند ثابت ہوگی۔

افتخار عارف

سنہرا بال

باقر نقوی

صبح ہوتے اپنے گھر سے چہل قدمی کو نکل پڑا تھا۔ ہر طرف ایک عجیب روپہلی سی فضا تھی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد، بوٹ بیسن کے موڑ پر پہنچ کر، اچانک احساس ہوا کہ میں مادر زاد برہنہ ہوں، بدن پر نہ لباس کا ایک تار نہ پاؤں میں پاپوش۔ ننگا بُوچا۔ اور حیا کا دور دور پتا نہیں۔ شاید حیا بھی کپڑوں کی طرح گھر ہی میں رہ گئی تھی۔ عجب کیفیت سے دوچار تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد احساسِ شرم بھی شروع ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان، حیرت انگیز طمانیتِ قلب بھی تھی۔ نہ جانے کیوں، مگر سب کچھ بس انوکھا معلوم ہو رہا تھا۔

پہلی بار اپنی مردانہ وجاہت، نوجوانی کی زینتوں اور حسن کا احساس ہوا۔ ہوا بھی تو کِن حالات میں۔ یہ بھی خواہش ابھر رہی تھی لوگ اس دلیر مرد کی طرف پسندیدگی اور استعجاب کے ملے جلے انداز میں دیکھیں۔ مگر سب اپنے آپ میں مگن تھے۔

دنیا کا نظام طے شدہ انداز میں چلتا ہے، سورج کروڑوں برس سے ایک ہی سمت سے طے شدہ اوقات پر نکلتا ہے۔ چاند بھی مخصوص دنوں میں غائب کیوں ہو جاتا ہے۔ اس کے نظامِ اوقات میں کوئی انوکھا خلل کیوں نہیں پڑتا۔ مگر کبھی ندرت بھی تو ہونی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ دادا نے کیا وہی باپ کرے اور بالکل ہی مختلف دور میں پیدا ہونے والا پوتا بھی اسی طرح سب کچھ کرے۔ تو پھر انسان کے تخلیقی جوہر کہاں جائیں گے۔

دُبلا پتلا جسم، گندمی رنگ کا، کوئی نوجوان جیسے کسی ساحلِ عریانی پر محوِ خرام ہو۔ بس کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مگر اس ’ساحل‘ پر ایک بھی برہنہ حسینہ نہیں۔ تو پھر ایسے ساحلِ عریانی کا لُطف کیا؟

بوٹ بیسن کی سڑک کے دورویہ پیدل چلنے والوں کے راستے پر غسلِ آفتابی کے لیے استعمال ہونے والے کُرسی نما بستر لگے تھے، اور رنگ برنگی بِکنی میں ملبوس، سنہرے بالوں والی حسینائیں، اور نہانے کے لباس میں مرد تھے۔ یہ کیسی انوکھی تبدیلی ہے۔ عام طور پر تو ادھر آتے ہوئے تو شرفا کو ڈر لگتا تھا، کہ دکانوں کے مال بیچنے پر مامور لوگ اس طرح آ گھیرتے ہیں جیسے بیٹھے پر مکھی! وہ سب کہاں چلے گئے۔ ہوسکتا ہے صبح کے وقت بوٹ بیسن کا بھی وہی عالم ہوتا ہو جس طرح رات بھر کے جشن وطرب کے بعد کسی بازارِ حسن کی صبح۔

بوٹ بیسن کی سڑک پر چہل پہل تو نظر آتی تھی مگر کوئی آواز نہیں! گویا پُرانے زمانے کی خاموش مگر رنگین فلم چل رہی ہو۔ یا اللہ! یا تو میں بہرا ہوگیا ہوں یا سب گونگے ہوگئے ہیں۔ مگر گاڑیوں کے چلنے کی آوازیں بھی تو نہیں آرہی ہیں! اب تو امیروں کے وہ لڑکے بھی نہیں نظر آرہے تھے، جو اپنے اپنے بزرگوں کی ’ھذا مِن فضلِ شیطان‘ دولت کا اظہار کرنے کے لیے مہنگی مہنگی کاریں بے مقصد دوڑاتے پھرتے ہیں، جن کو دیکھ کر خوف آتا ہے۔

کیسا روپہلا، کیسا پُرسکون اور کیسا جادوئی نوعیت کا موسم ہے۔ ایسا کہ وقت کا احساس زائل، بازار بھرے پُرے سجے ہوئے۔ دورویہ حسین جوڑے چہل قدمی میں بھی مشغول۔ مگر وہی سناٹا۔ گزرتی ہوئی کاریں بھی بے آواز۔

اپنا برہنہ بدن دیکھنا، مگر خجل نہ ہونا۔ حیرت، کہ آج کوئی مجھے دیکھتا نہیں۔ گویا برہنگی عیب نہیں فیشن ہو، اسٹائل ہو، جدّت ہو، افتخار ہو۔

یا مظہر العجائب!

اچانک ضمیر نے کچوکا دیا۔ چھوڑ اس بازار کو، اس ساحلِ عریانی نما بستی کو، اور نکل جا کسی صحرا کی طرف، جہاں نہ کوئی دیکھنے والا ہو نہ ٹوکنے والا، ’تہذیبِ نو‘ کی حکمرانی سے بہت دور، اور فطرت سے بہت قریب۔ اس لیے اور بھی کہ تیرے بدن پر لباس ہی نہیں۔ اور تجھے شرم بھی نہیں آرہی ہے۔ شرم بھی تو انسان کے لیے ضروری شئے ہوتی ہے۔ ورنہ پھر جانور اور انسان میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔

صحرا میں سکون ہی سکون ہوگا۔ مگر ہم ہمیشہ سکون کے متلاشی یہ کیوں بھول جاتے ہیں تھا کہ ’سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں‘۔ موت بھی تو سکون ہی کا ایک ایڈیشن ہوتی ہے!

رہ رہ کر دماغ میں خجالت کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

یکلخت منظر تبدیل ہوجاتا ہے۔

چاروں طرف، دور دور تک، اونچی اونچی، ہری بھری، بے ہنگم اُگی ہوئی قد سے بلند جھاڑیاں۔ نہ دوڑتی ہوئی گاڑیاں، نہ لال لال آنکھیں دکھانے والے سگنل۔ بس حدِّ نظر تک کھُلا آسمان، موسم ایسا کہ نہ صبح نہ شام۔ نہ بادل اور نہ دھوپ، ہوا ہے تو سہی مگر کبھی تیز اور کبھی آہستہ۔ گویا جنگل میں بھی ایک جادوئی دنیا تھی! دور دور تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد! کہیں جنّت میں بھی ایسا ہی ماحول نہ ہو!

چلتے چلتے خواہش نے سر ابھارا، موسم اچھا ہے، سو، آج ذرا چہل قدمی لمبی ہوجائے۔ بہت دور تک، ذرا نئے انداز کی!

مگر چہل قدمی کی بھی کوئی حد ہوا کرتی ہے۔ اور اگر راستہ بھٹک گئے تو کیا ہوگا۔

بھٹکنا کیا معنی! اسی راستے واپس تو ہوا جاسکتا ہے۔

مگر، یاد رہے کہ واپسی کا راستہ آسان نہیں ہوا کرتا۔

وسوسے نے دل میں سر اُبھارا۔ بہت ہولیا اب واپس ہولو، نہ جانے آگے اور کیا دیکھنا پڑے۔

مگر اب تو سمت کا بھی اندازہ نہیں ہو رہا! یہ کیا! اب واپسی کیسے ہو گی؟ واپسی کی کوشش کی تو پریشان کہ کس طرف کو قدم بڑھائے جائیں!

ارے! تو کیا واقعی راستہ کھو بیٹھے ہیں؟ اب کدھر کو چلیں؟ کہیں نہ کہیں تو جانا ہی ہوگا۔ مگر نہ بدن پر لباس ہے نہ پاؤں میں جوتی! اس حال میں کہاں جایا جاسکتا ہے۔

ایسے صحراؤں میں اور بھی خطرات ہوتے ہیں۔ یہ تو کینیا کی سفاری جیسا صحرا ہے۔ دور دور تک جھاڑیاں مگر کہیں بھی کوئی پیڑ نہیں۔ کہیں سے کوئی تیندوا نکل آیا تو؟ تجھ برہنہ تن کو ہرن ہی سمجھے گا۔

پرانے خطرات سے بھاگنے والوں کو نئے اور زیادہ بھیانک خطرات جھیلنے پڑتے ہیں۔

ارے واہ! اچانک یہ قلعہ نما عمارت کہاں سے آ گئی۔ Thank God۔ یہ تو کسی لارڈ کی حویلی لگتی ہے۔ مگر گیٹ تو کھلا ہوا ہے۔ اندر چل کر دیکھتے ہیں۔ جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ صحرا سے تو چھٹکارا ملا۔ پہلے بستی سے چھٹکارے پر سکون مِلا تھا، اب صحرا سے چھٹکارے پر خوشی؟ خوب! انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا!

گیٹ سے داخل ہوتے ہی کیاریوں سے بنی ایک بھول بھلیاں سامنے منھ کھولے کھڑی ملی!۔ یک نہ شُد دو شد۔ ایک اور مشکل! زندگی میں کبھی کبھی ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب انسان کہیں گُم ہو جانے کی آرزو کرنے لگتا ہے۔

کہیں یہ بھول بھلیاں تحفظ کی خاطر، خودکُش بمباروں سے بچنے کے لیے تو نہیں، یا پھر یہ کوئی نئی چال ہے۔ راستہ بھی بھولے اور اس پر مستزاد یہ کہ بھول بھلیاں کا سامنا ہے۔! ’مرے پہ سودُرّے‘ اسی کو کہتے ہوں گے، مگر اس کو تو بھگتنا ہوگا۔

مگر میں کوئی خودکُش بمبار تو نہیں۔ خودکُش بمبار تو ڈھیلے ڈھالے، ضرورت سے زیادہ لباس میں نکلتے ہیں۔ یہاں تو بدن پر لباس کا ایک تار بھی نہیں!

نیت اچھی ہو تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے میاں!۔ غنیمت جانو۔ بھول بھلیاں کو بھی نعمت جانو۔ مہم جوئی کرنے والوں کے بھی مقدر ہوا کرتے ہیں۔

کسی لارڈ کی حویلی نہیں، یہ برطانیہ کے ’آسمانی بھونپو‘ کی عمارت ہے۔ ارے یہ کیا؟ اور سامنے وہ سڑک ہے جس پر ہر سال انگلستان کی ’موٹی‘ ملکہ سنہرے رتھ میں بیٹھ کر، جس کے بوجھ کو ہر رنگ کے فربہ اور جہان بھر کے چیدہ چیدہ، سدھے ہوئے گھوڑے کھینچتے ہیں، ’فرمان‘ جاری کرنے جاتی ہے۔ ارے! ہم کہاں پہنچ گئے؟

یاد کرو نا! یہ وہی شہراہ ہے، جس پر روز آنہ تم لنچ کے بدلے ایک سیب اور ایک کیلا کھایا کرتے تھے، ٹہلا کرتے تھے، اور پورے ایک گھنٹے دیدارِ حسیناں کی دلچسپ اور ہیجان انگیز مشغولیت رہا کرتی تھی۔ لدگئے وہ زمانے۔

ارے! یہ کیا؟ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ کیاریوں سے بنی بھول بھلیاں میں داخلے کے وقت تو عالمِ برہنگی تھا۔ اب بدن پر یہ لباس کہاں سے آ گیا! شاید بھول بھلیاں میں داخل ہو کر اپنی بھول کا احساس ہو گیا ہو، اور بدن پر ویسا ہی لباس آ گیا ہو جس کو دیکھ کر ساری رعایا تو چپ تھی مگر ایک لڑکا بول پڑا تھا ’’بادشاہ ننگا ہے، بادشاہ ننگا ہے‘‘ مگر ہم تو بادشاہ نہیں! ابھی ابھی ایک موٹی ملکہ ادھر سے گزری تھی۔ تو کیا اس کا لباس بھی ویسا ہی تھا؟ واہ، واہ۔ اگر ملکہ جوان ہوتی تو کچھ لُطفِ نظارہ بھی ہوتا، یہ تو اسّی برس کی تھی۔

اب جیسا بھی ہو لباس تو ہے نا۔ کوئی کچھ بھی سمجھا کرے، کچھ بھی کہا کرے۔ دنیا حقیقت کی آنکھ سے دیکھتی سب کچھ ہے مگر مصلحت کی زبان سے بولتی ہے۔

ہر طرف سے پنجابی بولنے کی آوازیں۔ ارے! یہ لاہور ہے یا امرتسر ہے یا ساؤتھال ہے یا کچھ اور۔

ہر طرف پگڑیاں ہی پگڑیاں! چودھریوں کی پگڑیاں، اللہ میاں کے طوطوں کی دُمچی والی پگڑیاں، طالبان کی سیاہ پگڑیاں، ملّاؤں کی سفید پگڑیاں، ہندی ملّاؤں (سرداروں) کی نارنجی پگڑیاں، مارواڑیوں کی پگڑیاں۔ یااللہ اور کتنی پگڑیاں دیکھنی پڑیں گی؟

کوئی پگڑی اُچھال نہ دے! مگر میرے سر پر تو کسی قسم کی پگڑی نہیں۔

کیوں نہ ہم بھی ایک نئے قسم کی پگڑی ایجاد کرلیں؟ جس میں ایک نہیں کئی طرح کے رنگ ہوں، اور حسبِ ضرورت اس کو دوبارہ باندھ کر آرام سے ہر طرح کے پگڑی والوں کے جلوس میں شامل ہو جایا کریں۔ اتنی بڑی ہو کہ اس میں چھوٹے موٹے ہتھیار بھی چھپائے جاسکیں! ہتھیار؟ ارے بھائی اپنی حفاظت کے لیے بھی تو ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے!

چلو اچھا ہوا۔ جان بچی لاکھوں پائے، پگڑی والوں میں تو آئے۔ کم از کم یہ اپنی طرف کے تو ہیں۔ کچھ تو مروّت کریں گے۔

لندن کی بس اور کھچا کھچ بھری ہوئی، بالکل کراچی کی طرح، جہاں لوگ بس کے پیچھے لگی سیڑھیوں پر آم، امرود کی طرح لٹکے، حتیٰ چھتوں پر بھی چڑھے سفر کرتے ہیں، سڑک کے ہچکولوں کے باعث گرتے بھی ہیں، اپاہج بھی ہوتے ہیں مرتے بھی ہیں۔ انتظامیہ کو کسی پر رحم نہیں آتا!

حواس درست ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے پہلو سے لگی ایک گوری لڑکی کھڑی تھی۔ اتنی قریب کی اس کے جسم کی حرارت موٹے موٹے کوٹوں کے درمیان سے گزر کر بدن کی حساس جلد تک پہنچ رہی تھی۔ لڑکی جوان بھی، اور

نہایت حسین بھی۔سبحان اللہ! لوگ تو گورے رنگ کے حسینوں کو رنگ دار جلد والوں کے حسینوں سے بہتر کہتے ہیں! اس میں بھی ایک احساسِ کمتری کا دخل ہوتا ہے۔

جوں ہی حسین لڑکی کی قربت کا احساس ہوا،جسم میں کرنٹ دوڑنے لگے ہیں۔اسی کو جوانی کہتے ہیں۔یہ سب ہارمون کا چمتکار ہوتا ہے بابا!

لوگ کہتے ہیں کہ پہلی نظر میں محبت ہوگئی ہے۔محبّت صرف ماں کے دل میں اپنے اولاد کے لیے ہوتی ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے۔اور کوئی رشتہ محبت کا نہیں ہوتا۔کہتے ہیں کہ خون کے رشتوں میں محبت ہوتی ہے۔اگر ہوتی ہے تو ایک بھائی دوسرے بھائی سے نفرت کیوں کرنے لگ جاتا ہے۔اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو قتل کیوں کرادیا تھا۔آنکھیں کیوں نکلوا دی تھیں؟اور وہی اورنگ زیب مسلمانوں کا محبوب شاہنشاہ کہلایا!!

میاں! جس کو ہم محبّت کہتے ہیں،محبّت نہیں دراصل ضرورت ہوتی ہے۔بیٹا باپ سے اس لیے محبّت کرتا ہے کہ نظر باپ کے مال پر ہوتی ہے۔جہاں بیٹا معاشی طور پر خود کفیل ہوتا ہے،وہاں باپ کی موت پر رسمی طور پر محض پھول بجھوا کر رشتے کا پاس کرتا ہے۔باپ بھی بیٹے کی 'محبّت' میں گرفتار ہوتا ہے جب اسے بیٹے سے معاشی توقعات ہوتی ہیں،یا مجبوریاں ہوتی ہیں۔

جوان مرد اور جوان عورتیں اس لیے 'محبّت' میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں ایسا سیّال دوڑ رہا ہوتا ہے جس کی ضروریات انہیں مجبور کر دیتی ہیں۔باقی سب انسیت ہوتی ہے جو ایک ساتھ سالہا سال بسر کرنے سے بھی ہو جاتی ہے۔جانوروں کو بھی انسیت ہو جاتی ہے۔اور کچھ نہیں۔لوگ اسے محبت کہہ کر جواز پیدا کر لیتے ہیں۔تو کیا ہم بھی کبھی کبھی جانور ہو جاتے ہیں؟

ہاں،تو ہمارے پہلو سے لگی ایک گوری لڑکی کھڑی تھی ۔ جوں ہی اس کی قربت کا احساس ہوا،جسم میں کرنٹ دوڑنے لگے تھے۔اور کچھ نہیں تو قربت تو ہے۔اس کے جسم کی اور شینیل کی ملی جلی خوشبو تو ہے۔لڑکی شاید نشے میں تھی، بار بار اس کا سر میرے کاندھے پر ٹِک جاتا۔ایک بار دل میں خیال آیا کہیں یہ مدہوشیٔ حسنِ طلب تو نہیں۔مگر پھر سوچا،ابھی کچھ دیر اور دیکھتے ہیں،ہو سکتا یہ حسنِ طلب ہی ہو! جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

افسوس۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو صرف ایک پاؤنڈ اور بیس پنس! ارے! اتنا تو بس کے کرایے کے لیے بھی کافی نہیں۔کم از کم کرایہ تو دو پاؤنڈ ہے۔پاؤنڈ کے سکّے پر نظر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس پر تو ہٹلر کی شبیہ بنی ہوئی تھی۔

یا اللہ! برطانیہ کا سکّہ اور اس پر ہٹلر کی شبیہ! یہ کیسا سکّہ ہے؟ کیا جرمنی نے برطانیہ پر قبضہ کر لیا ہے؟ مگر چرچل نے تو کہا تھا کہ جب تک برطانوی نظامِ انصاف قائم ہے، جرمنی ہم کو فتح نہیں کر سکتا۔تو کیا ہٹلر سے مفاہمت ہو گئی ہے؟ یا برطانیہ کا نظامِ انصاف کسی آمر کی چھری تلے آ گیا ہے؟ کیا ابھی دوسری عالمی جنگ کا زمانہ ہی چل رہا ہے؟ کیا ہٹلر نے ملکہ کے خاندان میں شادی کر لی ہے اور اس کو تخت کی وراثت بھی مل گئی ہے؟ کیا حکومت برطانیہ ہی کی ہے،اور ہٹلر صرف رسمی بادشاہ رہے گا۔بالکل ویسا ہی جیسے ہمارے ایک متشرع،ڈاڑھی والے صدر صاحب تھے،جن کو کھانے،نماز پڑھنے اور وزیرِ اعظم کی ہر بات پر سر ہلانے کے سوا کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا! کیا مزے کی نوکری تھی! دل میں عجب عجب خیالات موجیں مار رہے تھے۔

ہم یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ برطانیہ سمیت یورپ کے تمام خاندان ایک دوسرے کے قرابت دار رہے ہیں۔ماؤنٹ بیٹن کا اصل نام تھا بیٹن برگ۔ جرمن زبان میں برگ پہاڑ کو کہتے ہیں سو جب ماؤنٹ بیٹن کے خاندان کی انگلستان کے شاہی خاندان سے رشتے داری ہوئی تو بڑی چالاکی سے اس نے اپنے نام کو انگریزی نام کا لبادہ پہنا دیا۔اور وہ بیٹن برگ سے ماؤنٹ بیٹن بن گیا۔حرف تبدیل ہو گئے مگر معنیٰ وہی رہے! کیا خوب کاری گری ہے! ہو سکتا ہے کہ کچھ نیا پیچ پڑ گیا ہو۔حکومت میں ہونے والے اپنے جیب میں ہر طرح کے جادوئی امکانات رکھا کرتے ہیں۔''نہ جانے کون سا کس وقت کام آ جائے! سوا ایک جیب میں بُت ایک میں خدا رکھنا!''

خیالات بھی بالکل بندر کی طرح ہوتے ہیں۔کبھی اس ڈال پر اور کبھی اُس ڈال پر۔ان پر قابو پانا کارِ محال ہے۔

مگر یہ بس بھی اپنی بستی تک تو نہیں جاتی۔یعنی اور بھی بسیں لینی ہوں گی،تو دو،چار یا چھ پاؤنڈ درکار ہوں گے۔

دادی امّاں ٹھیک ہی تو کہا کرتی تھیں نا ''بیٹا گھر سے نکلو تو پاؤں میں اچھی جوتی ہو اور جیب میں معقول رقم ہو۔''

با دلِ ناخواستہ لڑکی کی قربت چھوڑ،بس کے کنڈکٹر سے کہا، بھائی میرے پاس تو دو پاؤنڈ بھی نہیں۔کیا میں بس سے اتر جاؤں؟ ہائے رے بدقسمتی، کہیں پیچھا نہیں چھوڑتی!۔کوئی بات نہیں۔پھر کبھی! وصل کی خواہش ہی سہی! اس میں تو کچھ خرچ نہیں ہوتا!

بس کنڈکٹر بدبخت بھی کٹھور دل کا آدمی نکلا۔پتہ نہیں ایشیائی تھا یا انگریز۔اطوار سے تو لگتا ہے،ایشیائی ہی رہا ہوگا۔

زبان ہی سے پہچان ہوتی ہے نا۔علی ابنِ ابی طالب نے کہا تھا ''کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ'' مگر اس نے تو بول کر بھی نہ دیا! تو اس گونگے کی پہچان کیسے ہوتی!

اس جانور نما انسان نے اشارے ہی سے کام لیا۔زبانِ بے زبانی سے،یعنی آنکھ کے اشارے سے بس سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔گویا کہہ رہا ہو'' جیب خالی تو تمھارے لیے سڑک بھی خالی''۔

یہ بھی مہربانی تھی اس کی،کہ جتنی دور بھی سفر کیا،مفت کیا!
پیدل بھی ہو گئے،راستہ بھی نہیں معلوم،کدھر جانا ہے۔
اچانک سامنے گھر کا دروازہ آ گیا۔

ارے واہ! چلو مشکل آسان ہوگئی۔
کنجی لے کر تو نکلے تھے مگر نہ جانے ہول میں کہاں گر گئی۔ گھنٹی بجائی۔ بیوی پریشان! دوڑی ہوئی آئی۔
ارے! آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ گھڑی دیکھو، دِن کے بارہ بج رہے ہیں!
گھڑی کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ارے بس کچھ نہ پوچھو۔
کچھ تو بتاؤ! میں کب سے پریشان ہو رہی تھی۔
آج جیسی چہل قدمی پہلے کبھی نہیں ہوئی! بڑا لطف آیا۔
بیوی سے جھوٹ بولنا جائز ہے!
ایک لمحہ ہی گزرا تھا کہ وہی محبت کرنے والی بیوی بَل کھا کر بڑے بڑے ناخونوں والی پچھل پائی بن گئی۔
پچھل پائی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غور سے دیکھا جیسے وہ ان میں پوشیدہ راز تلاش کر رہی ہو۔ اس کے نظریں بار بار میرے اوور کوٹ کے کاندھے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔
''ہاں ہاں، کیوں نہیں، مزہ کیوں نہیں آیا ہوگا'' رنگ رلیاں منا کر آرہے ہونا۔ وہ مٹک کر انگلی نچاتے ہوئے بولی۔
''بھئی، کیا بکواس ہے''
اپنے سیاہ رنگ کے کوٹ کے کاندھے پر نظر کی تو سنہرے رنگ کا ایک لمبا سا بال لہرا رہا تھا۔
اس لمبے سنہرے بال کا کیا جواز پیش کرتا؟
زبان گُنگ، کوشش کے باوجود، بولنا چاہا تو آواز نہیں نکل رہی تھی۔
اتنے میں محسوس ہوا کی پیچھے سے کسی نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مخاطب کرنے کوشش کی۔ پلٹ کر دیکھا تو نشے میں چور وہی بس والی گوری لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے لمبے لمبے سنہرے بال ہوا میں ہلکورے لے رہے تھے۔
''واہ مسٹر، آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے آئے'' وہ بڑے ناز سے بولی۔ پلٹ کر بیوی کی طرف دیکھتا ہوں تو بالکل ڈرامے کے اسٹیج کی طرح یک سر منظر بدل چکا تھا۔ نہ گھر تھا نہ گھر کا دروازہ۔ نہ غرّاتی ہوئی پچھل پائی!
حیرت تو بہت ہوئی۔ مگر، چلو ایک طرف سے تو سکون ہوا۔
مگر اب یہ لڑکی، اور یہاں کس لیے آئی ہے؟ اس کو پتا کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟ کہیں یہ بھی ایک مصیبت نہ بن جائے؟
لڑکی بولی ''میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھے ڈانس ہال میں لیجانے کی درخواست کروگے۔ مگر پلٹ کر دیکھا تو تم اچانک غائب ہوگئے تھے''
لو! ہیں نہ اس میں مصیبت کے آثار!
میں نے بات بناتے ہوئے کہا ''ڈارلنگ میں ذرا سگریٹ خریدنے کے لیے بس سے اترا ہی تھا کہ بس چل دی'' اب میں اس کو کیا بتاتا کہ میرے جیب میں تو بس کا کرایہ بھی نہیں تھا، سگرٹ کہاں سے خریدتا۔ میں ڈانس ہال میں چلنے کی فرمائش کیسے پوری کرتا۔
میں نے کہا ''سوری ڈیر'' مگر اب میں تو تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ وہ بولی اچھا اگر تم نہیں جاسکتے تو میرا بال واپس کرو۔
میں نے سوچا اچھا ہوا، یہ بال میرے لیے وبال ہی تو تھا۔
میں نے خاموشی سے اپنے کوٹ کے کاندھے پر سے اس کا سنہرا بال چٹکی میں اٹھا کر اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔
لڑکی کے پیچھے پیچھے کچھ کالی، سفید اور ہری پگڑی والے بھی آگئے تھے۔
ان سب کے منھ لٹکے ہوئے تھے اور ان سب کے کوٹ کے کاندھوں پر سنہرے بال لہرا رہے تھے۔

سیّارہ

اور کچھ سنا تم نے
آج اک نجومی نے
اور ایک سیّارے، کا سُراغ پایا ہے
جانے کتنی صدیوں سے
یہ غریب سیّارہ
بے کراں خلاؤں میں
بے شمار سیّاروں، کے طوائف میں گم تھا

اتنی دور کیوں جاؤ
خود ہماری دنیا میں، صد ہزار سیّارے
صد ہزار برسوں سے
بے شعاع و بے رونق،
سورجوں کے نرغے میں، خوار ہوگئے لیکن
کب کسی نجومی نے
ان کو ڈھونڈنا چاہا
○

''نیرنگئ جہان''

حمدِ باری تعالیٰ

بحرِ عجائبات ہے بحرِ عجائبات
اے ربِّ کائنات یہ تشکیلِ کائنات

جس سمت دیکھئے، بجز حیرانگی ہے کیا
حیرت سے تک رہے ہیں بشر کے تصورات

بس ماورائے فہم ہے زنجیرِ کن فکاں
مصروفِ خلقیت ہے ابھی فاطر الصفات

نیرنگئ جہان میں انسان کی نمود
اور اس پر مستزاد ہے تخلیقِ فکریات

دانش بدوش ذہنوں میں یہ ذوقِ آگہی
اور ذوقِ آگہی کے علاوہ یہ حسیات

ہیں دست بستہ ہمارے ملائک اسی لیے
آدم کی پوری ہوسکیں ساری ضروریات

اے مالکِ جہانِ سبب تیرے ہاتھ کے
قبضہ میں ہے نظامِ جہاں، موت اور حیاتؔ

حیاتؔ رضوی امروہوی
(کراچی)

نعت

کیسی رہائی سب کو دلائی حضورؐ نے
کی زندگی میں سب سے بھلائی حضورؐ نے

لوگوں کو بت کدوں سے اُٹھایا ہے اس طرح
شمعِ یقیں دلوں میں جلائی حضورؐ نے

ان کو تھی فکر ہم نہ جہنم میں جا گریں
جنت کی راہ ہم کو دکھائی حضورؐ نے

احساں یہ کم ہے خاک نشینوں کے درمیاں
عمرِ عزیز اپنی بِتائی حضورؐ نے

دنیا و آخرت میں کیا سرخرو ہمیں
گویا ہماری بگڑی بنائی حضورؐ نے

طوفاں بدوش زلزلے برپا ہوئے مگر
بحر وفا میں ناؤ چلائی حضورؐ نے

شعلے دہک رہے تھے حسنؔ معجزہ یہ ہے
اشکوں سے اپنے آگ بجھائی حضورؐ نے

حسنؔ عسکری کاظمی
(لاہور)

نعتِ رسولِ مقبول

جو بھی احمد کی بات ہوتی ہے
حاصلِ کائنات ہوتی ہے

جو بھی ذِکر نبیؐ سے بنتی ہو
وہی شکلِ نجات ہوتی ہے

گُنبدِ سبز کے مقابل ہے
آج سُورج کو مات ہوتی ہے

رحمتِ حق کی بات بھی بے شک
یادِ حضرتؐ کے ساتھ ہوتی ہے

اِک تصوّر ہے کالی کملی کا
جِس کے صدقے میں رات ہوتی ہے

جس پہ دونوں جہان رشک کریں
اُنؐ کی لوحِ صفات ہوتی ہے

اُن کی سیرت سے استفادہ ہو
تب ہی روشن حیات ہوتی ہے

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

سلام بحضورِ امامِ عالی مقامؑ

درسِ وفا جہاں کو سکھایا حسینؑ نے
دینِ محمدیؐ کو بچایا حسینؑ نے

جس کی کوئی مثال زمانہ نہ دے سکا
حق کا علم ایسا اُٹھایا حسینؑ نے

نوکِ سِناں پہ کی ہے تلاوت امام نے
قرآن کو گواہ بنایا حسینؑ نے

گل کر دیے چراغ بھی جانے کے واسطے
انصاف کا تقاضا نبھایا حسینؑ نے

کذب وریا کی پھیلتی ظلمت کے باوجود
پرچم صداقتوں کا دکھایا حسینؑ نے

اسد بیگ
(راولپنڈی)

گڑیا

ناصر بغدادی

(کراچی)

آفس کی آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے میں نے دریچے سے باہر نظر دوڑائی۔ وہ لڑکی حسبِ معمول سڑک کی دوسری طرف بس اسٹاپ کے قریب انجانے کھیل رچانے میں مصروف تھی۔ اس وقت اُس نے قرمزی رنگ کا اسکرٹ اور سرخ بلاؤز پہن رکھا تھا جس میں اُس کا تن شبنم سے دھلے ہوئے گلاب سے زیادہ نکھر آیا تھا۔ اُس کے لبوں پر بچپن کی معصوم اور تفکرات سے بے نیاز مسکراہٹ اس طرح ناچ رہی تھی جیسے اوس کے شوخ قطرے پھولوں کے سینے پر اٹھکھیلیاں کرتے ہیں۔ اُس کے بال گردوغبار سے اٹے ہوئے تھے۔ نازک نازک ہاتھوں پر مٹّی کے ذرّات نمایاں تھے، اور دھول میں بیٹھنے کی وجہ سے گرد اُس کے کپڑوں پر اس طرح جم گئی تھی جس طرح ایک جگہ کئی دنوں تک پانی سڑنے سے کائی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر جیسے وہ اردگرد کی ہر شے سے بے نیاز تھی، اپنے ہی خیالوں میں گم، بچپن کے انجانے اور کیف زا کھیل رچانے میں مصروف۔۔۔!

اس کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہ تھی۔ اُس کے چہرے پر اس قدر بھولپن برستا تھا کہ میرا دل بےاختیار اُس کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں اُس کی حرکات وسکنات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ ہر روز کرسی پر بیٹھے ہوئے اس کی طرف پابندی سے دیکھنا میری عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ گو مجھے اس آفس میں چارج لیے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن میں اُس کے متعلق بہت کچھ جان چکا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کی ماں بس اسٹاپ پر ڈرائی فروٹ فروخت کرتی ہے، اُس کے باپ کو مرے دو سال ہو چکے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

میں جس جگہ ملازم تھا، وہ مالی اعتبار سے ملک کی ایک مستحکم کمپنی تھی، ہیڈ آفس کراچی میں واقع تھا، اور اصلاً میری دلچسپی کا مرکز بھی وہی تھا لیکن آفس کے بعض طالع آزماؤں نے ایسی چال چلی کہ مجھے اسسٹنٹ منیجر بنا کر لاہور کی برانچ میں بھیج دیا گیا۔ چونکہ ملازمت پُرکشش تھی اور زندگی کا لنڈورا پن برقرار تھا لہٰذا کفرانِ نعمت کا مرتکب ہو کر بےوقوفی کا ثبوت دینا نہیں چاہتا تھا۔ لاہور آنے کے فوری بعد میں نے ٹرانسفر کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔

ایک بھیگی ہوئی، مسحور کن شام کو میں بس اسٹاپ پر بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ حسبِ معمول لوگ اپنے اپنے انداز میں وقت گزاری کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ ایک کم عمر لڑکا شام کا اخبار لیے گاہکوں کی تلاش میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی بھیڑ کے دیکھ کر کچھ ٹھیلے والے بھی اپنا مال لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ غرض وہ جگہ بس اسٹاپ سے زیادہ ایک بارونق بازار کا نقشہ پیش کرنے لگی تھی۔ ایسے میں وہ چھوٹی سی لڑکی بے نیازانہ شان سے ایک طرف بیٹھی مٹّی کے اُس گھروندے کو پھولوں سے سجا رہی تھی جس کو شاید کچھ دیر قبل اُس نے مکمل کیا تھا۔ وہ اپنے کام میں اس درجہ منہمک تھی کہ اس کو اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اُٹھی اور ذرا دور جا کر کھڑی ہو گئی، مختلف زاویوں سے گھروندے کو دیکھا اور پھر شاید پھول جمع کرنے کہیں چلی گئی۔

دفعتاً دور سے بس آتی دکھائی دی، اور جیسے ہجوم میں کھلبلی سی پیدا ہو گئی۔ اتنی دیر سے جو لوگ صبر ایوبی کا مظاہرہ کر رہے تھے، اُن کے لیے مزید اس آزمائش سے گزرنا جیسے ناممکن ہو گیا تھا۔ ہر شخص لائن توڑ کر بس کی طرف یوں سرپٹ دوڑا جیسے بس میں سیٹ نہ ملنے پر اُس کے خلاف تادیبی کارروائی کا امکان ہو۔ ہر ممکن بچاؤ کی کوشش کے باوجود مجھے بھی اس سیلابی ریلے کے متاثرین میں شامل ہونا پڑا۔ بس میں داخل ہونا تو دور کی بات، اس طوفان بدتمیزی اور دھکم پیل نے میری چول چول ڈھیلی کر دی تھی۔ جاتی ہوئی بس میں لٹکتے ہوئے مسافروں کا نظارہ بھی کچھ کم عبرت ناک نہ تھا! میں کچھ دیر وہیں کھڑا اپنی اکھڑی ہوئی سانسیں درست کرتا رہا۔ اُنگلیوں سے کنگھی کا کام لے کر بالوں کو سنوارا، اور تب یکا یک میری نظر اس چھوٹی سی لڑکی پر پڑی تو میں نے اس کے گالوں پر آنسوؤں کو کپکپاتے ہوئے دیکھا۔

اس کی گود پھولوں سے بھری ہوئی تھی، اور وہ اپنے گھروندے کے پاس کھڑی اداس نظروں سے اس طرح ہجوم کو دیکھ رہی تھی جیسے اس میں شامل ہر شخص اس کے گھروندے کی بربادی کا ذمہ دار رہا ہو۔ میں نے اس کا گھروندہ دیکھا جو کسی ناکام عاشق کے دل کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ شاید اس بھاگ دوڑ میں کسی کا پاؤں اس پر پڑ گیا تھا۔ مجھے اس بچی کی بےبسی پر افسوس ہوا۔ اُسی لمحے مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں ایک چاکلیٹ ہے۔ آفس میں دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے چپراسی سے چاکلیٹ منگوائے تھے۔ تین تو میں نے اُسی وقت کھا لئے تھے، اور چوتھے کو چبانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک ملاقاتی آ گیا تھا، اور یوں اُس کی جان بچ گئی تھی۔۔۔ میں بچی کے پاس پہنچا، وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی، اور جب اس نے اپنا چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں خوف اور حیرت کے امتزاج سے پھیل گئیں۔

''م۔۔۔ میں نے آپ کو کچھ نہیں کہا'' اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم نے کچھ کہا ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ میری مسکراہٹ دیکھ کر اُس کا خوف دور ہوا، اور جب میں نے چاکلیٹ اُس کی طرف بڑھایا تو اس کا استعجاب عود کر آیا۔ اس کا دایاں ہاتھ چاکلیٹ کی طرف بڑھا مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی خلاء میں رک گیا۔

''لے لو'' میں نے پیار سے کہا، اور خود اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ

تھمادیا۔''تمہارانام کیاہے؟''

''رجیہ''وہ معصومیت سے بولی۔

''اوہ۔تو تمہارانام رضیہ ہے!!''میں خواہ مخواہ ہنس دیا۔

''نہیں۔رجیہ۔امّاں مجھ کواسی نام سے پکارتی ہیں''اس کے بھولپن پر میں پھر ہنس دیا۔

''کہاں رہتی ہو؟''میرے سوال پر اُس نے اپنی انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔میں نے اُس طرف دیکھا۔بس اسٹاپ سے ڈیڑھ دوفرلانگ کے فاصلے پر جھگیوں کی ایک بے ترتیب قطار بہت دور تک چلی گئی تھی۔میں نے وہاں سے نظریں ہٹالیں۔

''کیاتم مجھے اپنے گھرلے جاؤ گی؟''میرایہ سوال شاید اُس کے لیے غیر متوقع تھااس لیے اس نے مجھے عدم تیقن کے انداز میں دیکھا،پھراثبات میں گردن ہلادی۔اسی اثناء میں ایک اور بس آگئی اور مجھے آسانی سے جگہ مل گئی۔اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھاوہ ابھی تک فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔مجھے اپنی جانب متوجہ پاکراُس نے اپنانھنا ساہاتھ لہرادیا۔

دوسرے دن میں نے اپنے آفس کے دریچے سے دیکھا کہ رجیہ ایک باسکٹ لئے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی ہے۔اُس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس کے لیے کافی وزنی ہے۔کبھی وہ کسی کوروک کر ملتجیانہ انداز میں کچھ کہتی، اور جب وہ انکار میں گردن ہلادیتا تو مایوسی سے آگے بڑھ جاتی۔پھر وہ سامنے سے آنے والے کسی راہ گیر سے اسی انداز میں شاید وہی بات کہتی۔۔۔یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ وہ کچھ بیچ رہی تھی۔ہرطرف سبک رفتاری سے چکر کاٹنے کی بناء پر اُس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں مگراُسے تو جیسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔مگر میں نے دیکھا کہ کسی نے بھی اُس کی چیزوں کوخریدنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔میں واپس کرسی پر بیٹھ کرفائلوں کی ورق گردانی میں مصروف ہوگیا۔

اُس شام کو میں نے پھراُسے دیکھا۔وہ فٹ پاتھ کے ایک طرف پانچ پتھروں سے کوئی کھیل رچارہی تھی۔میں جب بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی اُس وقت میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے جواباً مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔پھر میں نے چندلمحوں بعد اس کو اپنی ماں سے کسی چیز کے لیے ضد کرتے ہوئے دیکھا۔اس کے انداز سے یوں لگا جیسے اُس کو اپنی مطلوبہ شے نہ ملی تو روناشروع کردے گی۔کافی دیرہوگئی مگربس نہ آئی۔میں نے وقت گزاری کے لیے شام کا اخبارخریدااور یوں ہی ورق گردانی کرنے لگا۔چندثانیوں بعد میں بے اختیار چونک پڑا۔کوئی میراہاتھ سہلا رہا تھا۔میں مڑا۔سامنے رجیہ کھڑی مسکرارہی تھی۔اس کے ہاتھ میں چار چھ اخروٹ تھے جن کووہ میری طرف بڑھارہی تھی۔

''یہ کیا؟''میں نے حیرت سے کہا۔''یہ لے کر کیا کروں گا؟''

''کھائیے گا''وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

''کیاتم بدلہ چکارہی ہو؟''میں نے ہنس کر پوچھااوراس نے نفی میں سر ہلادیا۔میں نے معصوم لڑکی کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اخروٹ قبول کرلیے تو اُس کے چہرے پرنور پھیل گیا۔وہ بولی۔

''کیاآپ ہمارے گھرنہیں آئیں گے؟''

''کل آؤں گا''میں نے جواب دیا۔وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تاہم وہ خاموش رہی۔میں سمجھ گیا کہ اس کے جذبات کوٹھیس پہنچی ہے۔

واپسی پر میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے حواس پرمکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔میرے خیالوں میں اُس کا عکس قوسِ قزح بن کر جھلملا رہاتھا۔اُس کے متعلق سوچتے ہوئے لگا کہ دنیامیں کچھ ایسی دلفریب اوردلکش چیزیں ہیں جن کی موجودگی ذہن میں بالیدگی پیدا کردیتی ہے،خیالوں میں رنگ بکھیرتی ہے، جب وہ میرے خیالوں میں چپکے سے آئی تو مجھے محسوس ہوا جیسے وہ آسمان میں اُڑتی ہوئی کوئی خوب صورت سی چڑیا ہو۔صبح کے وقت پھیلتا ہوا اُجالا ہو یاشبنم کی ایک ایسی بوند جو کسی پتے کی سینے پر بیٹھی مسکرارہی ہو۔

دوسرے دن جب میں نے آفس کے دریچے سے باہر جھانکا تو وہ کہیں نظر نہیں آئی۔نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دل پر کوئی وزنی شے رکھ دی گئی ہے۔دوپہر تک میں نے کئی مرتبہ باہر دیکھا مگر ہر مرتبہ میری نظروں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔آج وہ نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔مجھے لگا کہ آفس کے کام میں میرا دل نہیں لگ رہا ہے۔وقت بھی پہاڑ بن گیا تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔بڑی مشکل سے گھڑیال نے پانچ بجائے تو میں نے فائلوں کے ڈھیر کوالماری میں رکھ کرمقفل کردیا،اور چابی جیب میں رکھ کرآفس سے باہر نکل گیا۔میری آنکھیں ہرسمت اس کو تلاش کررہی تھیں مگر وہ اوراس کی ماں دونوں کہیں نظر نہیں آئے۔میرے دل پرایک گھمبیرسی کیفیت مسلط ہوگئی۔کتنی عجیب بات تھی۔میں ایک ایسی لڑکی کے متعلق سوچ رہا تھا جس سے میں صرف دومرتبہ ہی مل سکا تھا۔اوروہ ایسی غیرمعمولی خصوصیات کی حامل بھی نہیں تھی کہ اس کی عدم موجودگی میرے دل میں کسی خلاء کی پیدائش کا موجب بن جاتی!!مگراس کے باوجود میں خود کو نارمل محسوس نہیں کررہا تھا۔

پورے چار دن گزر گئے لیکن اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی رجیہ اوراُس کی ماں نظر نہیں آئے۔میں نے اپنے تئیں لعنت ملامت کی کہ اس دن میں رجیہ کے ہاں کیوں نہیں گیا۔مجھے اس کا گھر معلوم ہوتا تو آج مجھے اس قدر پریشانی کیوں اٹھانی پڑتی۔پانچویں دن شام کو میں نے رجیہ کی ماں کو دیکھا۔وہ حسب سابق اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی ڈرائی فروٹ بیچ رہی تھی مگر رجیہ اطراف میں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔

''تم رجیہ کی ماں ہونا؟''

''جی ہاں''وہ مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اتنے دنوں سے رجیہ کونہیں دیکھا۔ وہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ۔۔۔'' اس کی ماں کا چہرہ خوشی سے تابناک ہوگیا، وہ اب اسکول جانے لگی ہے''

اور مجھے اس خوش خبری نے کیا کچھ دیا، اس کو الفاظ میں بیان کرنا بے حد مشکل تھا۔

تقریباً ایک ماہ بعد جب مجھے کراچی تبادلے کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے آپ میں بے کرانی سی محسوس کی۔ میری حالت اُس مسافر سے مختلف نہ تھی جیسے ریگستان کے سفر میں اچانک نخلستان نظر آ گیا ہو۔ میں نے سوچا کہ لاہور چھوڑنے سے قبل میں ایک بار رجیہ سے ضرور ملوں گا، اور اُسے ایک ایسا تحفہ دوں گا کہ وہ زندگی بھر مجھے یاد رکھے گی۔ اس غرض سے اسی شام میں ایک بے حد مشہور کھلونوں کی دکان میں داخل ہوا۔ دکان ہزاروں قسم کے کھلونوں سے بھری پڑی تھی۔ الماریوں میں قد آدم گڑیاں زندہ انسانوں کی طرح بیش قیمت لباس پہنے اس طرح کھڑی تھیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ بڑی بڑی لانبی میزوں پر ریل کی چھوٹی چھوٹی پٹڑیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر چھوٹی چھوٹی ریلیں دوڑ رہی تھیں۔ میں تنوعات کی بھیڑ میں دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ بالآخر مجھے ایک گڑیا بے حد پسند آئی۔ وہ تھی بھی بڑی خوب صورت۔ اُس کے ہاتھ میں دودھ کی ایک بوتل تھی۔ جوں ہی گڑیا میں چابی بھری جاتی تو وہ گڑیا اس بوتل کو آہستہ آہستہ اپنے منہ کی طرف لے جاتی۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ میں رجیہ کے لیے یہ گڑیا خریدوں گا۔ مگر جب اس کی قیمت معلوم ہوئی تو میں نے بے اختیار ہتھیار ڈال دیے۔ اگرچہ اس وقت اتنی رقم میری جیب میں تھی مگر میرے اندرون کا ہم زاد نہیں چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی کے لیے اتنی رقم خرچ کی جائے جس سے دوبارہ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ لین دین کی منطق نے اس معصوم لڑکی کی محبت کو بیدردی سے قتل کر دیا ہے۔ میں نے کوئی سستی سی گڑیا خریدنی چاہی مگر اس وقت دکان میں ایسی کوئی گڑیا نہیں تھی اور پھر میں نے رجیہ کے لیے تحفہ خریدنے کا ارادہ ہی ختم کر دیا اور دکان سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن جب اُس کی ماں مجھے ملی تو میں نے اس سے کہا کہ جلد ہی لاہور چھوڑ رہا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ رجیہ سے ملاقات کروں۔

''یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی بابو جی'' وہ ٹوکری سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ابھی چلیں۔ رجیہ گھر پر ہی ہے''

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ دو چار تنگ اور گندی گلیوں کو عبور کرنے کے بعد ہم ایک خستہ حال جھگی کے قریب رکے۔ وہاں پر چند میلے کچیلے لونڈے نہ جانے کب سے طوفانِ بدتمیزی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ رجیہ کی ماں نے انہیں ڈانٹ کر بھگایا، اور مجھے عاجزی کے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں ہچکچاتے ہوئے اس کے پیچھے ہولیا۔ اندر کی حالت کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں۔ جتنا میں نے اندازہ لگایا تھا، بدحالی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر رجیہ گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر اُس کا چہرہ کھِل اٹھا۔

''آپ۔۔۔'' اس کی آواز میں حیرت و مسرت کی آمیزش تھی۔

''ہاں رجیہ۔۔۔ میں تم سے ملنے آیا ہوں'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''میں اگلے ہفتے کراچی واپس جا رہا ہوں''۔

''پھر کب آئیں گے؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''شاید کبھی نہیں''

''اوہ۔۔۔'' وہ اُداس ہوگئی۔

''تم کو دکھ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ اب میں کس سے باتیں کروں گی؟''

''دنیا میں بے شمار لوگ ہیں''

''مگر وہ مجھ کو قریب تھوڑی آنے دیتے ہیں!!'' اس کی آواز میں ملفوف کرب مجھ سے چھپ نہیں سکا۔ میں کچھ دیر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر وہاں کی فضا ایسی نہیں تھی کہ میں زیادہ دیر ٹھہر سکتا۔

''آپ جا رہے ہیں؟'' جب میں نے اسے خدا حافظ کہا تو وہ دکھ سے بولی۔

''ہاں رجیہ''

''ایک منٹ۔۔۔'' اس کے چہرے نے غیر مانوس احساسات کو جنم دیا، میں نے دیکھا کہ وہ پلنگ کے نیچے جھک کر کچھ دیکھ رہی ہے۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی چیز تلاش کر رہی ہے۔ چند لمحوں بعد وہ اُٹھی، اُس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی، ویسی ہی گڑیا جس کو میں اُس کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ میرے اندرون میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔

''اسے رکھ لیجیے'' وہ بھولپن سے بولی۔ ''آپ جب اس گڑیا کو دیکھیں گے تو میں آپ کو یاد آ جاؤنگی'' میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں۔

''نہیں رجیہ! میں اسے نہیں لے سکتا'' میں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

''لے لیجیے ورنہ بچّی کو دکھ ہوگا'' اس کی ماں بولی ''اس نے یک ایک پیسہ جمع کر کے اُسے خریدا تھا'' کچھ ایسی صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ اس مرتبہ میں انکار نہ کرسکا۔ میں نے گڑیا اس کے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے دیکھا کہ رجیہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔

جب میں جھگی سے باہر نکلا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ میں دبی گڑیا مجھے حقارت سے دیکھ رہی ہے اور میں شرم کے مارے زمین میں دھنسا جا رہا ہوں!!

''مسیحاؤں کے حضور''

کیلی فورنیا (امریکہ) میں مقیم ڈاکٹر فیروز عالم ماہر طبیب، مشفق انسان اور اعلیٰ پائے کے ادیب کے طور پر منفرد شناخت کے حامل ہیں۔ گذشتہ دنوں ڈاکٹر صاحب کا تازہ افسانوی مجموعہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' دستیاب ہوا تو ایک دُور افتادہ ادیب اور افسانے کی ادنیٰ طالب علم کے طور پر میری خوشی بے بہا اور بے حساب تھی۔ مجموعے کو دیکھتے ہی پہلی خواہش دل میں یہ پیدا ہوئی کہ میں اس افسانوی مجموعے پر نئے زاویے سے ایسا کچھ تحریر کروں جس سے کتاب اور صاحبِ کتاب کو سمجھنے میں قاری کے لیے آسانی ہو سکے۔

آپ اسے میری خود غرضی کہیں یا کوئی اور نام دیں ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں شامل ایک کہانی جس میں نوجوان مریض ڈاکٹروں کی غفلت سے آن کی آن میں دم دے دیتا ہے کو پڑھ کر میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ چونکہ میں اور میرا خاندان برسوں پہلے اسی طرح کے سانحے سے گزر چکے تھے لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی کہانی پڑھ کر، خود پر گزری رُودادِ الم تحریر کرنے پر مجبور ہوگئی۔ میرا یہ عمل کس حد تک صائب ہے، اس کا فیصلہ میں آپ اور ڈاکٹر فیروز عالم صاحب پر چھوڑتی ہوں۔

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

۱۸ ر دسمبر جُمعہ کا دن صبح ساڑھے آٹھ کے قریب کا وقت ہوگا دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔ میں نے بھاگ کر فون اُٹھایا دوسری طرف ارون بھیا تھے۔ گھبرائی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہا کہ ''ہم لوگ پی جی آئی جا رہے ہیں وہاں پہنچ جاؤ''۔ پی جی آئی کا نام سُنتے ہیں پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''کیا ہوا سب ٹھیک تو ہے؟''

''تم بس جلدی پہنچو ہم بھی پہنچ رہے ہیں۔ چاچا جی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔'' اتنا کہہ کر اُنھوں نے فون کاٹ دیا۔ اُن دنوں موبائل تو ہوتے نہیں تھے۔

چاچا جی یعنی میرے پاپا۔ ایکسیڈنٹ کیسے اور کہاں ہوا؟ یہ سوال ذہن میں کُلبلانے لگا۔ ابھی تو پہلے حادثے کے چکرویوہ سے باہر نہیں نکل پائے تھے کہ اس خبر نے کھلبلی مچا دی۔ اُسی وقت میں اور میری بہن جو تیار ہو رہی تھیں چھوٹے چچا کے گھر ان کے چوتھے کی رسم میں شریک ہونے، اب گاڑی ہسپتال کی طرف بھگا دی۔

ابھی دس دن پہلے سب بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ ایک ضروری فنکشن میں شرکت کرنے کے لیے پانچ دن کا دلی جانے کا پروگرام تھا۔ والدین کے ساتھ میں اور میری بہن ریتو اپنی نجی کار سے دلی کے لیے (نو) ۹ ر دسمبر کی صبح ہی روانہ ہوگئے۔ یہاں میں یہ واضح کردوں پاپا نے ہم چاروں بہنوں کو ایسی تربیت دی تھی کہ ہم کبھی کسی کام کے لیے اوروں کا منہ نہ دیکھیں کسی کے محتاج نہ ہوں۔

اسی وجہ سے کبھی گھر میں بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ پہلی اولاد ہونے کے باعث میں اپنے پاپا کے سب سے قریب تھی سب سے لاڈلی۔ اردو شعر و ادب کا ذوق مجھے ہی وراثت میں اُن سے ملا۔ حافظ، غالب، نظیر اور اقبال اُن کے پسندیدہ شاعر تھے۔ رات کو سونے سے قبل وہ ان چاروں میں سے کسی ایک کے دیوان کا مطالعہ ضرور کیا کرتے۔ پاپا کی گفتگو میں علمی، ادبی چاشنی کے ساتھ اُن کے پسندیدہ شعراء کا حوالہ اکثر سننے کو ملتا۔ جب بھی شہر میں کوئی مشاعرہ منعقد ہوتا یا کوئی اچھا سا ڈرامہ کھیلا جاتا تو ہم دونوں کے علاوہ کسی کو اس میں شریک ہونے کی دلچسپی نہ ہوتی۔ وہ کھُلے ذہن اور فراخ دل کے مالک تھے۔ وہ صرف ہمارے پاپا ہی نہیں بڑے بھائی اور ایک اچھے دوست بھی تھے۔ ہر عمر کے شخص کے ساتھ ویسے ہی بن جاتے۔ کوئی بھی پریشانی چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، خود ہی اُس سے نپٹ لیتے ہم تک اُس کی آنچ بھی نہ آنے دیتے۔ وہ گھر کے ایسے اہم مرکزی کردار تھے جن کے ارد گرد ہم ماں بیٹیوں کی زندگی گھومتی تھی۔ اُن کی موجودگی میں سارے گھر کی فضا میں پیار، محبت، شرارتیں، سکون اور خوشیاں پھیلی ہوئی محسوس ہوتیں۔

خود اُنھوں نے کبھی سکوٹر، کار کچھ بھی نہیں چلایا مگر ہم سب کو سائیکل سے کار تک چلانی بھی سکھائی اور لے کر بھی دی۔ سب کو اُن کا ڈرائیور بننا بہت پسند تھا۔

دلی کے سفر میں، میں اُن کی ڈرائیور تھی۔ وہاں پانچ دن کا قیام بہت ہی یادگار رہا، فیملی فنکشن کے دوران کئی پرانے لوگوں سے ملاقات بھی ہوئی

کئی ایسے رشتے داروں کے اصرار پر اُن کے گھر جا کر سب کا گلہ بھی دُور کیا۔ میری ماں کے برعکس انھیں دوستوں، رشتے داروں اور لوگوں سے ملنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ یہ پانچ دن کیسے ہنسی خوشی سب سے ملنے ملانے میں کٹ گئے معلوم ہی نہیں ہوا۔

۱۳ر دسمبر دوپہر کے وقت ہم لوگ دلی سے روانہ ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح میرے ساتھ والی سیٹ پر پاپا بیٹھے۔ سارے راستے باتیں کرتے رہے۔ دلی کے لیے نکلنے سے ایک روز پہلے میں اپنے دفتر میں کام کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف پاپا تھے۔ ''تخلیق'' لاہور سے نکلنے والے رسالے میں میری پہلی نظم بہ عنوان ''تلاش'' چھپی تھی اور انہوں نے ایک ہی سانس میں وہ نظم پڑھ لی تھی اور پوچھا ''یہ کس کی تلاش ہے تمہیں؟ مجھے تو بتایا ہی نہیں''۔

پہلی بار کسی رسالے میں نظم چھپی تھی اور اس کی اطلاع پاپا سے جس انداز میں ملی اُس وقت جو مسرت حاصل ہوئی تھی وہ بیان نہیں کرسکتی۔ اُسی زمانے میں، میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانوں کے ذریعہ کیا تھا اور اُنہیں اس بات کی خوشی بھی تھی اور میری حوصلہ افزائی بھی کرتے رہتے۔

پاپا کا پروگرام تھا کہ اگلی صبح یعنی ۱۴ر دسمبر کو میرے چھوٹے چاچا کے ساتھ شملہ اپنے دوسرے بھائی کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے جانا تھا۔ میرے پاپا چھ بھائی تھے اور وہ دوسرے نمبر پر تھے۔ شملہ والے بھائی کا باقی بھائیوں سے اپنی شادی کے بعد کوئی زیادہ آنا جانا نہیں تھا اس لیے اتنا قریبی رشتہ ہونے کے باوجود اپنائیت کا ہمیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا۔ جب وہ اپنے بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے آئے تو کسی نے وہاں جانے کی حامی نہیں بھری۔ انھوں نے بھی کچھ نہیں کہا اپنے دوسرے چھوٹے بھائی کے ساتھ شملہ جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اتنا ہی ہنس کر بولے ''کیا کروں خون کا رشتہ ہے کبھی کبھی یہ خون اُبالے کھاتا ہے۔ سب بھول کر میں جاؤں گا ضرور''۔

دلی سے گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں قریب پانچ بج گئے۔ کار سے اُترتے ہی پاپا نے کہا۔

''Thanks بیٹا''۔

میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو کہنے لگے۔

''ٹھیک ٹھاک پہچانے کا۔ اب کچھ دن بالکل پریشان نہیں کروں گا اپنے ڈرائیور کو۔''

ابھی آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ اطلاع ملی کہ چھوٹے چاچا اسپتال میں ہیں اور سبھی صبح سے ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پتا چلا کہ صبح چاچا سیر کے لیے نکلے۔ سردیوں کی صبح دُھند میں لپٹی ہوئی تھی اور ایک انجانی گاڑی کی چپٹ میں آ گئے۔ چوٹ سر پر لگی تھی اور گرتے ہی ہوش کھو بیٹھے۔ اس وقت پی جی آئی کی امرجنسی میں داخل تھے۔ اسی وقت دوبارہ گاڑی نکال کر پی جی آئی کی طرف روانہ ہو گئے۔ پاپا نے بیٹھتے ہی کہا۔

''Sorry بیٹا''۔

اُنھیں کچھ دیر پہلے کہی ہوئی اپنی ہی بات یاد آ گئی تھی۔

''آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہو۔ صرف آپ کے بھائی کا نہیں ہمارے چاچا کا بھی ایکسیڈنٹ ہوا ہے''

وہ تین دن اور تین راتیں اسپتال، ڈاکٹرز اور گھر آنے جانے کے چکر میں گزرے۔ ۱۶ر دسمبر کی صبح ہی اُنھوں نے اُسی حالت میں بنا آنکھیں کھولے رختِ سفر باندھ لیا۔ پاپا کو چھوٹے بھائی کے اس طرح اچانک بنا کچھ کہے بنا کچھ سنے چلے جانا کسی صدمے سے کم نہیں تھا مگر اُنھوں نے گھر کے بڑے ہونے کے ناتے خود کو سنبھالا۔ بیمار چاچی اور اُن کی اکلوتی شادی شدہ بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور آخری سفر کی ساری رسمیں خاندان کے بڑے بیٹے یعنی ارون بھیا سے پوری کروائیں۔ طے یہ ہوا کہ ممی پاپا چوتھے کی رسم تک وہیں رُکیں گے۔ ہم دونوں بہنیں صبح چاچا کے گھر چلی جاتیں اور رات واپس لوٹ آتیں۔ ہمارے فون سے پہلے پاپا کا فون آ جاتا یہ جاننے کے لیے کہ ہم سلامتی سے پہنچ گئیں۔

پی جی آئی کے امرجنسی کے باہر ہی ہمیں کچھ لوگ مل گئے اور ہمیں سیدھے پاپا کے پاس لے گئے۔ پاپا سٹریچر پر لیٹے تھے اور پوری طرح ہوش میں تھے۔ ہمیں گھبرایا دیکھ کر ہلکے سے مُسکرائے اور کہنے لگے ''سب ٹھیک ہو جائے گا فکر مت کرو'' اُنہیں اس طرح بات کرتے دیکھ کر کچھ راحت محسوس ہوئی۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ڈاکٹری جانچ ہو چکی تھی زخموں پر مرہم پٹی تو ہو گئی تھی مگر اُن کا کہنا تھا کہ جلد ہی آپریشن کرنا پڑے گا شاید بائیں ٹانگ کاٹنی پڑے (Amputation)۔

ارون بھیّا نے ہی ہمیں بتایا کہ صبح سویرے ہی وہ پاپا اور تین دوسرے رشتے داروں کو ساتھ لے کر شمشان گھاٹ چاچا جی کے پھول (ہڈیاں) چُننے گئے تھے۔ سپردِ آتش کے بعد جب مرحوم کی راکھ ٹھنڈی ہو جاتی ہے تبھی پھول چُننے جاتے ہیں۔ کارجی ہی راکھ کے ڈھیر سے پھول چُن چُن کر لائی گئی تھیلی میں ڈال دیتا ہے۔ پھر اسے گھر نہیں لایا جاتا یا تو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہتے پانی میں بہا دیا جاتا ہے یا وہیں جمع کر دیتے ہیں اور جب جانا ہو تب لے جاتے ہیں۔ وہ تھیلی وہیں جمع کروا دی گئی اور راکھ کو تھیلے میں ڈال کر بہتے پانی میں بہانے کے لیے لے گئے۔ دسمبر کی سردی شباب پر تھی سورج چھپا بیٹھا تھا اور ہلکی ہلکی دُھند چھائی ہوئی تھی۔ پُل کے نیچے گھگھر کا پانی بہتا تھا۔ پُل پر پہنچ کر بھیّا نے گاڑی روک دی اور باقی کے تینوں لوگ وہ راکھ لے کر نیچے اتر گئے۔ پاپا اُترنے لگے تو بھیّا نے روک دیا۔ ''آپ رہنے دو باہر سردی بہت ہے۔ ہم لوگ پُل کے آخر سے گاڑی موڑ کر لاتے ہیں'' پہلے تو وہ رُکے پھر یہ کہہ کر نکل گئے کہ ''میں گاڑی میں بیٹھنے تھوڑی آیا ہوں'' اور بھیّا چُپ چاپ گاڑی کو پُل کے آخر سے موڑ کر لانے کو چلے گئے۔ یہ چاروں لوگ ابھی راکھ کو پٹری سے کھڑے ہو کر پانی میں بہا کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایک طرف سے بس اور سامنے کی

طرف سے ٹرک کو آتے دیکھا۔اُن دونوں کی آپس میں ٹکر ضرور ہو جاتی اگر ٹرک پٹری پر نہیں چڑھ جاتا۔ٹرک کو پٹری پر چڑھتے دیکھ وہ سبھی اِدھر اُدھر بھاگے اور پاپا بھاگنے کے چکر میں وہیں گر گئے اور ٹرک کا پچھلا پہیاّ اُن کی بائیں ٹانگ کو کچل گیا۔جب تک بھیاّ گاڑی موڑ کر لائے یہ حادثہ ہو چکا تھا۔سبھی سکتے میں تھے اُنہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ایک دم سے یہ کیا ہو گیا۔پھر پاپا نے ہی آخر کہا ''یار واب اُٹھاؤ بھی مجھے''اسی وقت گاڑی میں ڈال کر انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا۔

دن میں کئی بار ڈاکٹروں سے ملے۔اُن کے مطابق آپریشن کے لیے جو سامان چاہیے تھا وہ بھی بازار سے خرید لیا گیا۔وقت گزر رہا تھا اور اُن کی تکلیف بھی بڑھ رہی تھی۔پاپا درد کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر شاید درد کی شدت اتنی تھی کہ انھوں نے مجھے بُلا کر کہا''ڈاکٹروں کو کہو ٹانگ کاٹنی ہے تو کاٹ دو مگر جلدی کرو''۔ہم اُن سے یہ بات چھپا رہے تھے اور وہ اس فیصلے سے سمجھوتہ بھی کر چکے تھے۔ہمیں بس اُن کی جان کی سلامتی چاہیے تھی،ہمیں ٹانگ کٹنے پر بھی تسلی تھی۔تین بار آپریشن کا وقت مقرر ہو گیا اور ہر بار آپریشن ملتوی ہوتا گیا۔اُن کی تکلیف بڑھتی گئی اور ہماری بے بسی۔ہم انہیں کسی پرائیویٹ اسپتال بھی لے کر نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ایکسیڈنٹ کا کیس تھا کوئی ہاتھ نہ ڈالتا۔مجبوراً ڈاکٹروں سے بھی خود تو کبھی کسی سے سفارشیں کراتے رہے کہ آپریشن جلدی کر دو۔صبح سے شام ہو گئی۔خبر ملتے ہی ماں بھی اسپتال پہنچ گئی تھیں مگر پاپا کے پاس صرف ایک مرتبہ ہی گئیں باہر بیٹھی رہیں۔وہ اُن کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں اور آنکھیں اُن کے بس میں نہیں تھیں بہتی جا رہی تھیں۔اتنی تکلیف میں سٹریچر پر لیٹے لیٹے بھی پاپا مجھے کہہ رہے تھے کہ''جا اپنی ماں کو بھی دیکھ آ۔اُسے کچھ کھلا پلا آ''

دوپہر کو چاچا جی کے اُٹھالے کی رسم مکمل ہوئی تو وہاں آئے رشتے دار بھی اسپتال پہنچ گئے۔ڈاکٹر نے آکر بتایا کہ آٹھ بجے آپریشن ہو جائے گا۔شُکر شُکر کر کے رات کے آٹھ بھی بج گئے۔انھیں آپریشن تھیٹر لے جانے کی ساری تیاری ہو گئی۔اتنے میں خبر ملی کہ آپریشن اس وقت ممکن نہیں کیونکہ پاپا کی شکر کا لیول بڑھ گیا ہے اور دل بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہا Heart Problem ہو گئی ہے۔پہلے یہ قابو میں کرنا ضروری ہے ٹانگ کا آپریشن تو بعد کی بات ہے۔

دو دن پہلے امرجنسی کے جس وارڈ میں چاچا جی کو Oxygen لگائی گئی تھی اور Heart Pumping کی جا رہی تھی اسی وارڈ کے مریض ہمیں دوبارہ وہاں دیکھ کر حیران ہو کر پوچھنے چلے آئے۔اُسی جگہ پر انہیں بھی رکھا گیا پھر Oxygen اور پمپنگ شروع ہو گئی۔I.C.U میں جگہ نہیں ملی۔منہ پر ماسک لگنے کی وجہ سے بولنا بھی بند ہو گیا۔ہمت اتنی تھی کہ ڈاکٹر دیکھنے آتے تو لکھ کر اپنا B.P اور طبیعت کے مطلق پوچھ لیتے۔پھر یہ بات بھی ختم ہو گئی۔

دھیرے دھیرے دو دنوں میں سبھی Organs نے کام کرنا بند کر دیا اور Multiple failer کے باعث دوائیوں کے سہارے دو دن اور کٹ گئے۔وہ اگلے دو دن اور دو راتیں ہم لوگوں نے مر مر کر گزارے صرف اس اُمید پر کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے شاید وہ ٹھیک ہو جائیں۔

۲۰ر دسمبر شام پانچ بجے کے قریب ارون بھیاّ Pumping کر رہے تھے اور میں پاپا کے پاس ہی سٹول پر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبائے ''اوم نموشوائے'' کا جاپ کر رہی تھی۔پاپا کی آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔یکلخت مجھے محسوس ہوا کہ ایک زبردست کرنٹ ہاتھوں سے ہوتا ہوا میرے پورے جسم میں دوڑ گیا۔اس سے پہلے اس طرح کا کرنٹ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔اُسی وقت بھیاّ نے زور سے آواز دے کر ڈاکٹر کو بلایا۔مجھے وہاں سے ہٹا دیا گیا۔کئی ڈاکٹرز ایک ساتھ آ گئے جنہوں نے پاپا کو گھیر لیا۔کوئی زور زور سے اُن کا سینا دبا رہا ہے کوئی انجکشن لگا رہا ہے پھر جب وہ کوشش کر کے ہار گئے تو انھوں نے چادر سے اُن کا منہ ڈھانپ دیا۔اُنہیں اس درد سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی اور ہم سب کچھ لُٹا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔

۱۶ر دسمبر کی صبح وہ ایسے گھر سے نکلے کہ ۲۱ر دسمبر کو صبح ہی اُن کے مردہ جسم کو گھر لایا گیا۔دونوں بھائی شملہ ایک ساتھ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے، شملہ تو جا نہیں سکے معلوم نہیں کون سے راستے سے ہوتے ہوئے کس مقام پر جا پہنچے۔دونوں بھائیوں کی استھیوں کا وسرجن ایک ساتھ ہی ہری دوار میں بہتی گنگا میں کیا۔چنڈی گڑھ سے ہری دوار کا پانچ گھنٹے کا سفر لال تھیلی میں اُن کی استھیاں میری گود میں ایسے تھیں کہ جیسے میں اُن کے وجود کو سمیٹ کر گود میں بیٹھی ہوں۔بچپن میں جن کی گود میں کھیلے بڑے ہوئے تو اُن کے وجود کو گود میں سمیٹ کر سفر کے آخری مقام تک پہنچانا پڑا۔

پھر اس کے بعد شروع ہوئی گھر میں ویرانی، خالی پن، درد، مایوسی اور اُداسیوں کی داستان۔ہنستا کھیلتا گھر خاموش ہو گیا۔گھر کا مرکزی کردار جس کے اردگرد گھر کی کل کائنات سانس لیتی تھی وہ ایسے غائب ہوئی جیسے جسم سے جان۔کچھ سوال اتنے عرصے بعد بھی پریشان کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں نے اگر وقت پر اُن کا آپریشن کر دیا ہوتا تو شاید وہ بچ جاتے۔پھر خود کو تسلی بھی دینے لگتے ہیں کہ ایک انسان جس نے ساری زندگی خود اعتمادی سے بسر کی ہو اُسے اپاہج بن کر جینا کتنا تکلیف دہ ہوتا۔شاید اوپر والے کو یہی منظور تھا۔مگر راکھ میں دبی چنگاری کی طرح یہ بات ذہن و دل کو اکثر پریشان کر دیتی ہے کہ ڈاکٹروں کی لاپرواہی کی وجہ سے ہمارے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ہماری ماں بیوہ ہو گئی۔اور یہ گھر ویران ہو گیا۔

خدا جانے سچ کیا ہے مگر ایک سچ تو یہ ہے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ہمارے ساتھ ہمارے دل میں ہماری یادوں میں آج بھی بستے ہیں اور تا زندگی ہمارے ساتھ ہی ہونگے۔خدا نہ کرے کبھی کسی ڈاکٹر سے ایسی غفلت سرزد ہو اور ایک شخص کے ساتھ جڑی کئی زندگیاں بھی اُجڑ جائیں۔

☆

سخت جانی ہائے تنہائی

سید سعید نقوی
(نیویارک)

''ہائے میری ٹانگ'' احمد کی سسکی میں درد کی شدت نمایاں تھی ارے کوئی ہے جو میری مدد کرے۔ احمد کا بدن کمر سے نیچے بالکل مفلوج ہو چکا تھا۔ کاش درد کا احساس بھی مفلوج ہو جائے، مٹ جائے۔ درد رہے یا نہ رہے بس محسوس نہ ہو۔ اس درد سے چھٹکارا پانے کے لئے اس وقت وہ سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ ارے کوئی میری مدد کرے۔ اس نے چاہا کہ ذرا کروٹ لے لے تو شاید آرام آ جائے، مگر جسم نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ درد کی ٹیسیں اب صرف جسم میں نہیں بلکہ جسم سے آگے کہیں روح تک کچو کے لگا رہی تھیں۔

کان کا یہ حصہ تقریباً بارہ فٹ چوڑائی اور سولہ فٹ لمبائی کا ایک ہال سا تھا۔ فرش پر چھت سے گرنے والے کچھ چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے۔ دیوار پر لگا بلب معجزانہ طور پر ابھی تک جل رہا تھا، گویا زندگی کے ہونے کی یاددہانی کرا رہا ہو۔ سولہ کان کن بالکل ٹھیک تھے، خراش تک نہیں آئی تھی، بارہ کان کنوں کی ہلکی پھلکی چوٹیں تھیں۔ تین کارکن زیادہ زخمی تھے۔ چھت سے گرنے والے پتھر سے ایک کارکن کے سر پر شدید ضرب آئی تھی اور وہ بے ہوش تھا ایک کان کن کے اعضا پر ضرب آئی تھی اس کا ایک بازو اور پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کچھ جسمانی چوٹوں سے بے خبر تھے، کچھ درد سے کراہ رہے تھے، سب کے چہروں پر ہراس تھا۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا جو کوئی زبان پر لانے کو تیار نہیں تھا۔ ٹمٹماتا بلب سامنے کی دیوار پر گھٹتے بڑھتے سایوں سے ایسی شکلیں بنا رہا تھا جس سے ماحول ڈراؤنا اور بوجھل ہو گیا تھا۔ کسی نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو جیسے تمام کارکن کسی نیند سے بیدار ہو گئے۔ سب کو اپنی چوٹیں یاد آنے لگیں، ہر طرف سے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دو کان با قاعدہ آواز سے رو رہے تھے۔ احمد کی آواز ان کی آواز میں دب گئی تھی۔ جو کم زخمی تھے وہ زیادہ آواز سے شور کر رہے تھے۔ گاؤں کا مولوی نور الدین بھی ان دبے ہوئے کان کنوں میں شامل تھا۔ شومئی قسمت وہ ان سولہ کان کنوں میں شامل تھا جن کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ جبار نے لپک کر احمد کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

''سب مل کر زور لگائیں تو یہ بڑا تودہ ہٹ جائے اور احمد اس کے نیچے سے نکل آئے'' جبار نے ساتھی کان کنوں کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا

نورلدین اس وقت تک دوسرے زخمی کے پاس پہنچ گیا تھا اور اس کے گال پر ہلکے ہلکے تھپڑ لگا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

''ذرا سا پانی ہوتا تو اسے ہوش میں آنے میں آسانی ہوتی'' نور الدین نے بے بسی سے کہا۔ جواب سب کو معلوم تھا لیکن کسی نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔

جن کان کنوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں ان کے سر کے نیچے قمیضوں کا تکیہ بنا کر رکھ دیا گیا۔ یہ تو اچھا ہوا کسی کے بھی خون جاری نہیں تھا۔

''اب کیا ہوگا'' یہ سوال جو اکتیس ذہنوں کے ہر خلیے میں موجود تھا مزید دبا نہ رہ سکا۔ ایک کارکن نے روتے ہوئے یہ سوال کیا داغا، وہ جو ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے سب اچانک ایک ساتھ بولنے لگے۔

''ہونا کیا ہے زندہ دفن ہوں گے''

''مجھے تو بہت پیاس لگ رہی ہے''

''میں ایسے زندہ دفن ہونے کو تیار نہیں''

''مجھے سانس نہیں آ رہی'' ایک کان کن سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

یہ جملے آپس میں ایسے ہی گڈمڈ ہو کر معنی کھو رہے تھے، جیسے اکلوتے بلب کے پیدا کردہ سامنے دیوار پر رقص کرتے کالے دیو۔

''اللہ کی ذات سے اتنا مایوس بھی نہیں ہونا چاہئے'' نورالدین کی آواز میں چھپی امید نے باقی آوازوں کا گلا گھونٹ دیا۔ بے یقینی اور ہراس کے ماحول میں امید کا صور ایسا ہی جادو اثر ہوتا ہے۔ سب بانسری بجانے والے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

''مجھے نہیں معلوم ہم کب تک قید میں رہیں گے'' نورالدین کی تقریر جاری تھی ''لیکن میں اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوں۔ وہ لوگ یقیناً ہمیں کھود نکالنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں ہفتوں کے لئے آکسیجن موجود ہے'' نورالدین نے جیسے خود بخود کنٹرول سنبھال لیا۔ ''سب سے پہلے اپنی جیبوں، کونے کھدروں میں دیکھیئے کچھ کھانے کے لئے موجود تو نہیں؟''

''ہاں اگر ہے تو کچھ کھا پی لیں تا کہ سوچنے سمجھنے کی قوت بحال ہو'' ایک کان کن نے رائے دی۔

''بے وقوف، اگر کچھ نکل بھی آئے تو اسے بہت سنبھال کر خرچ کرو، کیا معلوم یہاں کب تک قید رہنا پڑے'' دوسرے کان کن نے مشورہ دیا۔

ایک بار پھر مختلف آوازیں گونجنے لگیں۔

''میرے خیال میں ہمیں ایک لیڈر چن لینا چاہیئے، تا کہ آپس میں اختلاف نہ ہو'' نورالدین اجتماعی بے چینیوں سے نبٹنے کے ہنر سے واقف تھا۔

''ارے احمد کو اس تودے سے نکالنے میں کوئی مدد کرو'' اس سے

پہلے کہ کوئی نورالدین کی بات کا جواب دیتا، جبار کی ملامتی آواز آئی۔اپنی بے حسی سے شرمندہ کئی کان کن اٹھ کر لپکے۔

''ٹھہرو، یہ بے وقوفی نہ کرنا'' نورالدین اطمینان سے بیٹھا رہا، اس نے اٹھنے کی کوئی کوشش نہیں کی

''کیا مطلب، احمد کو ایسے ہی تودے کے نیچے دبے رہنے دیں، درد سے تڑپ رہا ہے'' اب جبار چیخ پڑا۔دیگر کان کنوں نے بھی حیرت سے نورالدین کو دیکھا۔

''بھئی کان میں حادثہ ہو تو اندر بغیر سوچے سمجھے ایسے دیواریں اور تودے ادھر سے ادھر نہیں کرتے، ہوسکتا ہے مزید مٹی اور چھت سر پر آن پڑے، نکاسی کا راستہ نہ بند ہو جائے۔'' نورالدین نے سمجھایا۔

''جو ہوگا دیکھا جائے گا، ابھی کم از کم اسے تو درد سے نجات دلائیں، اللہ سے امید رکھیں اچھا ہی ہوگا'' جبار نے تودے کو اکیلے ہی ہلانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

''احتیاط لازم ہے، تودے کو ہٹانے میں بہت خطرہ ہے'' نورالدین نے ساتھی کارکنوں کو سمجھایا۔ جبار نے سب کی طرف طائرانہ نظر ڈالی، سب کان کن تودے سے پیچھے ہٹ گئے، لیڈر کا انتخاب خود بخود ہو گیا تھا۔

''میں تو کہتا ہوں یہ عذاب ہم پر آیا بھی احمد کی وجہ ہی سے ہے'' نورالدین جیسے اپنے آپ سے بولا

''کیا مطلب'' جبار زخمی آواز میں بولا

''تمھیں اپنے یار کی حرکتیں نہیں معلوم'' نورالدین زہر خند لہجے میں بولا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہو'' جبار اس جال میں پھنس چکا تھا پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا۔

''اپنی کان کے مالک خرم صاحب کی بیوی سے اس کا تعلق سب ہی جانتے ہیں، جلد یا بدیر سزا تو ملنی ہی تھی'' نورالدین کی آواز زہر میں بجھی تھی۔

''بکواس بند کر نورالدین'' جبار غصے سے نورالدین کی طرف بڑھا تو کئی کان کن بیچ میں آ گئے۔''ہوش کر جبار، نورالدین صحیح کہہ رہا ہے، کیسی شیخی مارتا تھا احمد''

''لیکن احمد کے ساتھ ہمیں کس چیز کی سزا مل رہی ہے'' ایک اور کان کن کے سوال کا نورالدین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔احمد اب درد کی شدت سے نکل کر نیم بیہوشی کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔

دھماکے کی آواز اتنی شدید تھی کہ میلوں دور ملک برادرز کے دفتر میں کھڑکی کے شیشے بجنے لگے۔خرم کچھ ہی دیر پہلے دفتر پہنچا تھا۔آبائی ملکیت تھی کانوں کی۔ یہ بات تو قدرتی تھی کہ وقار ملک کے بعد علی احمد ملک اور اب خرم ملک ہی اس کاروبار کو سنبھالے گا۔ یہ ملکیت صرف تین پشتوں تک ہی محدود نہیں تھی، لیکن صرف اتنی موروثیت ہی خرم ملک کو زبانی یاد تھی۔ان تین پشتوں کے نفع سے اب کاروبار دوسری شاخوں میں بھی پھیل گیا تھا، چمڑے کا کام، ملبوسات کا کام، اب تو سیمنٹ کی فیکٹری بھی لگی ہوئی تھی۔لیکن اس دولت کا اصل ماخذ تو یہی کانیں تھیں۔معدنیات کے علاوہ، سنگِ مرمر اور دوسرے قیمتی پتھر ملک برادرز کی تجوریوں کا پیٹ بھر رہے تھے۔خرم ملک آکسفورڈ سے کان کنی میں ماسٹرز کی ڈگری لے کر آئے تھے۔فیشن تو یہی تھا کہ خاندان کے چشم و چراغ سمندر پار کسی معروف یونی ورسٹی سے ڈگری لے آئیں۔گو عموماً یہ ڈگری ان کی سوچ، فکر یا علمیت کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی تھی۔ پشتوں سے یہ شہسوار ڈگری تو لے آتے مگر تعلیم یافتہ ہونا ان کی سرشت میں نہیں ہوتا۔یونیورسٹی بھی مطمئن رہتی کہ بیرونِ ملک کے طلبہ سے بھاری فیس موصول ہو جاتی۔ یہ گریجویٹ اپنے گھر جا کر ہی لنکا ڈھاتے۔مگر خرم ملک کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔انہوں نے تو تعلیم کو سنجیدگی سے لے لیا تھا، ذہنی طور پر بن سنور کر واپس لوٹے تھے۔کان کنی میں ماسٹر ڈگری کے دوران کان میں ہونے والے حادثے، اس کے اثرات، اس کے بچاؤ اور سد باب سب کے متعلق کتنا ہی تو پڑھا تھا۔ذہنی طور پر ہر وقت وہ اس حادثے کے لئے تیار تھے، پلان بنے ہوئے تھے، مگر یہ قیامت واقعی آ بھی جائے گی، یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔اب جو زوردار دھماکے کی آواز سنی تو اس کا دل بیٹھ گیا۔کھڑکی میں لگے شیشے اپنی اپنی جگہ اچھل کود کر واپس جم گئے۔خرم ملک کے دل کا بھی شاید یہی حال ہوا۔ابھی یہ حقیقت ذہن میں بیٹھی بھی نہیں تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''کیا ہوا سر؟'' عالیہ گھبرائی ہوئی دفتر میں داخل ہوئی۔

خرم اس کی بات ان سنی کر کے فون کا چونگا اٹھا چکے تھے۔دوسری طرف سے وہی خبر ملی جس سے وہ لاشعوری طور پر پہلے ہی واقف تھا۔

فون رکھ کر وہ دھم سے کرسی پر گر سا گیا۔

''کیا ہوا سر'' عالیہ نے اب نزدیک آ کر خرم ملک کے شانوں پر ہلکا مساج شروع کر دیا۔خرم برطانیہ سے شادی کر کے لوٹے تھے لیکن عالیہ کے سحر سے نہیں بچ سکے تھے۔پہلی غلطی تو اس وقت ہوئی جب عالیہ کو اس کی شکل و صورت دیکھ کر اپنی سیکریٹری کے طور پر ملازم رکھ لیا۔عالیہ پڑھی لکھی تھی اور سابقہ تجربہ بھی تھا، لیکن خرم نے یہ فیصلہ دماغ سے نہیں دل سے کیا تھا۔اس غلطی کے بعد پھر دوسری غلطیاں ہوتی چلی گئیں۔اس پر طرہ یہ کہ عالیہ نے اپنی حیثیت سے زیادہ کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا۔اب اس دہرے رشتے کی مقناطیسیت چاہنے کے باوجود انہیں آزاد نہیں ہونے دیتی تھی۔

خرم نے کرسی سے اٹھ کر کوٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو عالیہ اسے پہلے ہی واکئے تیار تھی کہ وہ اپنے بازواس میں ڈال دے۔

''کان میں دھماکہ ہو گیا ہے'' ابھی تفصیلات کا نہیں پتہ۔الماری

میں سے ''حادثے کے بعد'' کے عنوان کا فولڈر نکالو اور اس پر عمل شروع کراؤ۔ انجینئر سے کہو فوراً مجھ سے کان پر ملے۔ سب ملازمین سے کہو چھٹی کے بعد بھی موجود رہیں کہ کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' خرم تقریباً بھاگتے ہوئے دفتر سے نکل رہے تھے، ساتھ ہی ہدایات کا سلسلہ جاری تھا۔ حادثے کی مختلف جہتیں ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے تک عالیہ کو ہدایات دیتے رہے۔ ڈرائیور کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دھماکے کی آواز نے ایک غیر محسوس طور پر مالک اور مزدور سب کی حیثیت کو ایک خاص سطح پر ہموار کر دیا تھا۔ خرم کے دروازہ بند کرتے ہی ڈرائیور نے تیزی سے کار کان کی طرف بڑھا دی۔

کان میں وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ ٹھٹکا ہوا، سہما ہوا وقت، جیسے کوئی جانور اچانک کار کے سامنے آ جائے اور کشش و پنج میں رہے کہ آگے بھاگنا بہتر ہے یا واپس لوٹنا۔ وقت بھی ایسے ہی منجمد ہو گیا تھا۔ زخمی کان کن اپنی اپنی جیبوں، اوور آل، اوزار کے تھیلوں اور بکسوں کی تلاشی لے کر سامان جمع کر رہے تھے۔ ٹارچ، ماچس، پانی، پٹی کرنے کے قابل کوئی سامان، غذا یا پینے کے قابل کوئی شے۔ یہ سب چیزیں ایمانداری سے ایک ہی جگہ جمع کی جا رہی تھیں۔ یہ سارا کام ایسی خاموشی سے ہو رہا تھا جیسے آواز نکلی تو کوئی اور دیوار گر پڑے گی۔ احمد کی درد بھری آواز بھی اب بند ہو گئی تھی، درد شاید مایوس ہو گیا تھا یا بے ہوشی کی وادی میں پناہ مل گئی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ یہ کام فوراً ہی ختم ہو گیا۔ کون سا ایسا لق ودق میدان تھا۔ چاروں طرف کان کی دیواریں، نیچی چھت، گنے چنے اوزاروں اور غذا کے تھیلے، سب کی تلاشی فوراً ہی مکمل ہو گئی۔ اب وہ سب پھر اضطراب میں تھے کہ اب کیا کریں۔ نور الدین بھی اتنی جلد فراغت پر مضطرب تھا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ جانتا تھا انہیں مصروف رکھنا کتنا اشد ضروری ہے۔ جیسے ہی فارغ ہوں گے اپنی صورتِ حال کے متعلق سوچنے کا موقع ملے گا، اور مایوسی، ناامیدی انہیں گھیر لے گی۔ امید ان کی مشترکہ دوست تھی، جس نے سب کو ایک بندھن میں باندھ دیا تھا۔ مایوسی اور ناامیدی ان کان کنوں کی حیوانی جبلتوں کو بیدار کرتی، زندہ رہنے کی تڑپ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر دیتی۔ انہیں مصروف رکھنا کتنا ضروری لیکن کتنا دشوار ہو گا، نور الدین اس خیال سے ہی سہما جاتا تھا۔

''اب جتنی بھی غذا ہے اسے فی کس کے حساب سے تقسیم کر دو۔ لیکن ایسے خرچ کریں گے کہ کم از کم یہ تین دن تک تو چل سکے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں پڑے گی، پھر ہم آزاد ہوں گے''۔

نور الدین کو خود بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ تین دن کا دورانیہ کہاں سے اس کے ذہن میں آیا۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ اب کم از کم اسے اتنا وقت ضرور مل گیا تھا۔

''تین دن؟'' کسی سمت سے آواز آئی

تین دن ہی تو ہیں، تین ماہ تو نہیں۔ آرام سے گزر جائیں گے۔ اپنے رب کو یاد کرو اور آپس میں اخلاص سے رہو۔ اس وقت ہمیں اس چیز کی سخت ضرورت ہے۔

''نور الدین، احمد کو بھی ذرا دیکھ لے'' کسی نے رائے دی

''خود کیوں نہیں دیکھ لیتے'' نور الدین ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ''سزا دینا اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، بچانا چاہے گا بچا لے گا، مالک کی عورت پر نظر رکھنے والے کا مر جانا بہتر ہے''۔

اتنے میں عقب سے ایک کراہ کی آواز آئی۔ ایک بیہوش مریض ہوش کی وادی میں واپس قدم رکھ رہا تھا۔ نور الدین نے لپک کے اس کا سرہانا اپنی گود میں رکھ لیا۔ چند سال ایک کمپونڈر کا کام کرنے کا تجربہ تھا۔ سر گود میں رکھنے میں پوری احتیاط برتی تھی کہ سر سیدھا رہے۔ گردن کی ہڈی پر ضرب ہوئی تو بے توجہی سے بات خراب بھی ہو سکتی ہے۔

''پانی'' زخمی کے منہ سے نکلا

''ذرا سا اس کے منہ میں پانی تو ٹپکا دو'' نور الدین نے ایک کان کن سے کہا

''لیکن ابھی تقسیم مکمل نہیں ہوئی''

''کوئی بات نہیں، بعد میں اس کے حصے میں سے یا میرے حصے میں سے کم کر لینا، لیکن ابھی تو اس کو پانی دیدو۔'' نور الدین نے بڑے رسان سے کہا۔

اس سے نبٹ کر، وہ دوبارہ اپنی جگہ بیٹھنے سے پہلے دوسرے زخمیوں پر نظر ڈالنا نہیں بھولا تھا۔ احمد کے پاس جبار تھا، نور الدین نے اس کی طرف جانے کی زحمت نہیں کی۔ ایک چادر نما کپڑا اچھا کر اب اس پر خورد ونوش کی جو اشیا مل سکی تھیں انہیں اکتیس حصوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔

''اگر جلد ہی کوئی آسرا نہیں بنا تو کیا ہو گا'' نور الدین نے دل میں سوچا۔ ''جب تک امید باقی ہے، یہ سب کان کن مہذب ہیں، بلکہ اس مصیبت میں گرفتار ہونے کے سبب باہمی تعاون بڑھ گیا ہے۔ کسی ایسی حرکت کا امکان نہیں جس سے بچانے والا اپنا ارادہ بدل دے۔

ڈرائیور نے گاڑی حادثے والی کان سے تھوڑے فاصلے پر روکی تو خرم فوراً باہر آ گئے۔ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ عورتوں کے بین کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ لوگوں کی پریشانی ابھی اشتعال میں تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کان کے دو حفاظتی گارڈ خرم کے نزدیک آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مایوس اور غمگین آدمی اپنا غصہ کسی پر بھی نکال سکتا ہے۔

''اطلاع یہ ہے کہ حادثے کے وقت کان میں کوئی نوے مزدور تھے۔ ان میں سے انسٹھ باہر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اکتیس کان کن لا پتہ ہیں اور غالب امکان یہی ہے کہ کان میں پھنسے ہوئے ہیں'' انجینئر نے خرم کو رپورٹ دی۔

''ان کے زندہ رہنے کا کیا امکان ہے'' خرم کی آواز اتنی دھیمی تھی

کہ انجینئر کو قریب آ کر سننا پڑا۔لیکن وہ اس سوال کے لئے تیار تھا۔

''جہاں چھت گری ہے اس کے پیچھے ایک ہال نما جگہ ہے جہاں اس وقت کھدائی ہو رہی ہے، امکان ہے کہ یہ وہاں موجود ہوں گے۔ اگر کسی بھاری پتھر یا تودے کے نیچے نہیں دب گئے تو فوری خطرہ نہیں ہے'' انجینئر کی آواز بھی اتنی ہی دھیمی تھی۔

''ہمارے پاس کتنا وقت ہے'' کیا ڈاکٹر کیا انجینئر اس سوال سے سب ہی گھبراتے ہیں۔ کتنا وقت باقی ہے، سارے عمل اور کردار کا دارومدار اسی کے گرد گھومتا۔اسی لئے اپنی تمام سائنسی تربیت کے باوجود انجینئر کے لئے یہ سوال سب سے ٹیڑھا تھا۔

''شاید چند دن، سارا انحصار غذا اور زخمیوں کی حالت پر ہے'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا

اب خرم نے مجمعے کی طرف رخ کیا۔اس کی پیشہ ورانہ تربیت یہی کہہ رہی تھی کہ صورت حال کا قرار واقعی جائزہ پیش کر دے۔ اچھے برے سارے عوامل۔

''آپ سب کو معلوم ہے کہ کان نمبر سولہ کی چھت گر گئی ہے۔'' خرم نے مضطرب چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ہمارے اکتیس دوست لاپتہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ ملبے کے پیچھے ایک ہال نما کمرے میں قید ہو گئے ہیں۔'' مجمعے نے واضح طور پر سکون کا ایک مشترکہ سانس لیا۔

''لیکن، لیکن اب اس ملبے کو بہت احتیاط سے اٹھانا ہے کہ جہاں وہ سب مقید ہیں، اس حصے پر دباؤ نہیں پڑے۔ فیصل آباد سے بڑی کرینیں پہلے ہی چل پڑی ہیں۔لیکن ملبہ ہٹا کر راستہ بنانے میں چند دن بھی لگ سکتے ہیں۔'' اب مجمعے کو گویا سانپ سونگھ گیا۔''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انتظامیہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی''۔ لوگ شاید اس سے بھی زیادہ بری خبر کے منتظر تھے کہ وہ اس سہارے سے اپنی امیدیں باندھ کر وہیں بیٹھ گئے۔

''عارضی خیمے لگوا کر، کچھ یہاں روشنی کا انتظام کریں'' خرم نے ہدایات دیں'' پھنسے ہوئے کانکنوں کے جو اعزا یہاں رہ کر انتظار کر رہے ہیں انہیں خیموں میں جگہ دیں، ان کے کھانے پانی کا میری طرف ے انتظام ہوگا۔انجینئر صاحب آپ اپنی ساری توجہ ملبے کے پار راستہ بنانے پر مرکوز رکھیں''۔

''ملک صاحب یہ کان کنوں کی آج کی شفٹ کی فہرست ہے'' ایک اوورسیئر نے خرم کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما دیا۔''جو لوگ باہر آ گئے ہیں ان کے نام پر میں نے ایک لکیر کھینچ دی ہے''۔

خرم پھنسے ہوئے کانکنوں کی فہرست پڑھنے لگا۔ انگلستان سے آنے کے بعد اس نے کوشش کی تھی کہ اپنی کانوں میں کام کرنے والے تقریباً دو سو کان کنوں کو وہ نام سے جان سکے۔فہرست پر نظر دوڑاتے ہوئے اس کی نظر احمد کے نام پر آ کر رک گئی۔احمد پہلے اس کے گھر میں ڈرائیور تھا۔اپنی بیوی کا ڈرائیور کی طرف التفات کا معاملہ کچھ زیادہ چھپ نہ سکا تھا۔اس کے کچھ ہی عرصے بعد خرم کو ایسی چہ مگوئیاں سننے کو ملیں کہ اسے یقین نہ آیا۔اپنا دامن خود صاف نہ ہونے کی بنا پر اس میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ بیوی سے پوچھ گچھ کرتا۔شکر ہے اوورسیئر نے احمد کو گھر کی ڈرائیوری سے ہٹا کر کان میں لگا دیا تھا، یہ مسئلے کا قابلِ قبول حل تو نہ تھا مگر اس سے خرم کو وقت مل گیا تھا کہ اپنے معاملات پر نظر ثانی کر سکے۔ اب جو فہرست میں احمد کا نام دیکھا تو دل میں عجیب عجیب خیال آنے لگے۔شاید قدرت نے یہ موقع اسے جان بوجھ کر دیا ہے۔ایک قدرتی حادثے کے باعث اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے تو کیا اچھا ہے۔

اوورسیئر خرم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا دزدیدہ نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا گویا اس کے دل میں جاری جنگ سے واقف ہو۔

کان میں اب انتظار کا موسم شروع ہو گیا تھا۔اشیاء کی تقسیم مکمل ہو چکی تھی۔زخمیوں کی حتی الامکان مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔اب انتظار تھا کسی آواز کا، کسی اجنبی روشنی یا سائے کا۔ پژمردہ چہرے، ایک دوسرے سے آنکھیں ملانے سے گریزاں۔ فضا میں اب ایک بساندسی شامل ہو گئی تھی۔حادثے کو کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ دو کان کن مزید برداشت نہیں کر سکے تھے اور ایک کونے میں جا کر پیشاب کر آئے تھے۔

''نورالدین، ایک بات مجھے تنگ کر رہی ہے'' ایک کان کن اپنا منہ نورالدین کے کان کے پاس لا کر بولا۔

''وہ کیا ہے میاں؟''

''نورالدین وہ، وہ ملک صاحب بھی تو اس احمد سے واقف ہیں''

''تو؟''

''تو یہ کہ'' ایک توقف آ گیا، کان کن کچھ سوچ رہا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔

''ابے تو کیا؟''

''تو ملک کے لئے اس سے بہتر موقع کیا آئے گا''

''نہیں'' نورالدین سناٹے میں آ گیا۔''ایسا کیسے ممکن ہے، اور ہم سب''، لیکن اس کی آواز میں ایک بے یقینی تھی۔

''تیرے ذہن میں یہ وسوسہ آ بھی گیا تھا تو اپنے تک نہیں رکھ سکتا تھا؟'' نورالدین الٹ پڑا۔لیکن آواز دھیمی ہی رکھی تھی۔اس نے سن رکھا تھا کہ لاعلمی ایک نعمت بھی ہو سکتی ہے، آج ثبوت بھی مل گیا۔

''نہیں، تو خرم صاحب سے واقف نہیں، میں جانتا ہوں۔فکر نہ کر۔ وہ ہم سب کو بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اور پھر اوورسیئر، سرکاری کارندے، ہمارے گھر والے'' نورالدین کچھ اسے تسلی دے رہا تھا کچھ اپنے آپ کو۔

''کیا وقت ہوگیا، کتنے گھنٹے ہوگئے ہمیں یہاں پھنسے'' ایک کان کن نے سوال کیا۔

''کوئی چودہ کلاک ہوگئے ہیں'' ایک ساتھی کی روہانسی سی آواز آئی۔

''میرے خیال میں ہمیں کچھ سونے کی کوشش کرنی چاہیئے'' نور الدین نے رائے دی۔

''نیند کس کمبخت کو آئے گی؟''

''صحیح کہہ رہے ہو لیکن آنکھیں موند کر، بن کے ہی پڑ جاؤ۔ اٹھیں گے تو کچھ وقت بھی گزر جائے گا، پھر کچھ ایک ایک راشن بھی پیٹ میں ڈال لیں گے۔'' نور الدین نے اپنی قمیض کا بچھونا راشن کے سامنے لگا دیا تھا۔ گویا یہ اس کی آرام گاہ تھی۔ وہ اس قلیل مقدار کو برابری سے تقسیم کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ اسے پتہ تھا بھوک ایک ایسا جانور ہے جو ایک دفعہ بیدار ہو جائے تو خود اپنا گوشت کھانے سے بھی نہیں چوکتی۔ کچھ دیر کے لئے کان میں خاموشی چھا گئی، حیرت یہ ہے کہ چند کان کن واقعی سو بھی گئے۔

بھاری مشنری کے انتظار میں خرم بیٹھا نہیں رہا تھا۔ اس کی تربیت کام آئی تھی۔ ایک دو انچ چوڑا سوراخ بہت احتیاط سے آگے بڑھایا جا رہا تھا، جیسے کوئی سانپ اپنا راستہ بناتا جا رہا ہو۔ بند کان میں پھنسے مزدوروں کی جائے پناہ کا اندازہ تقریباً ڈھائی سو فٹ زیرِ زمین لگایا گیا تھا۔ یہ دو انچ چوڑا سوراخ اب تقریباً پچاس فٹ کی مسافت طے کر چکا تھا، لیکن اسی میں چھتیس گھنٹے لگ گئے تھے۔ کان کے باہر اولین بھاری مشنری کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ رشتہ داروں کے ساتھ کچھ اخبار والوں نے بھی ڈیرہ لگا لیا تھا۔ ٹی وی والے بھی مستقل حال بتا رہے تھے، اب پوری قوم کی توجہ اس سانحے کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

''ٹن'' اس آواز کے ساتھ ہی سوراخ کرنے والی مشین کی گراری رک گئی۔

''کیا ہوا'' خرم نے فوراً سوال کیا، یہ آواز کیسی تھی۔ ان چھتیس گھنٹوں میں وہ ایک بار بھی نہیں سویا تھا۔ گھر سے کئی دفعہ پیغام آ چکا تھا کہ وہ آ جائے، اوورسیئر کس کام کے لئے رکھا ہے، مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اس ملک کے خون میں یقیناً کچھ خرابی تھی یا اس کا کوئی پرزہ ڈھیلا تھا، کوئی بات بھی ملکوں والی نہیں تھی، کوئی اور ہوتا تو بیوی کو نکال دیتا یا احمد کو مروا دیتا۔ چلو تب نہیں تو اب، کیسا اچھا موقع تھا، مگر اس میں تو کوئی بات ملکوں والی تھی ہی نہیں۔

''جناب برما نکاسی کے پائپ سے ٹکرایا ہے'' انجینیئر جو نقشے پر جھکا ہوا تھا اس نے انگلی سے پائپ کا راستہ واضح کیا۔

''یہی پائپ نیچے اس ہال سے بھی گزر رہا ہے جہاں وہ کان کن پھنسے ہیں؟'' خرم کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

''ہاں گزر تو رہا ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں تھوڑی دیر ضرور لگے گی لیکن برما گھوم کر پائپ کے نیچے سے سوراخ گہرا کرتا رہے گا، یہ کان کنی کا خاص آلہ ہے جناب''

''اچھی بات ہے، لیکن میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس برمے سے پائپ پر آواز پیدا کی جائے تو نیچے ہال میں بھی شاید سنی جا سکے، انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم ان کی تلاش میں ہیں۔''

''ٹن'' کی آواز نیچے ہال میں بھی سن لی گئی تھی۔ آواز نے گویا مردہ جسموں میں جان ڈال دی۔

''اوئے سنا تو نے، تم نے بھی سنا'' کئی کان کن ایک ساتھ بول پڑے

''وہ ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں، انہوں نے ہمیں پا لیا ہے''

''اللہ تیرا شکر ہے'' نور الدین نے دعا کو ہاتھ بلند کر دئے۔

لیکن ٹن کی وہ خوش کن آواز ایک بار آ کر پھر دوبارہ نہیں آئی تو چہرے لٹکنے شروع ہو گئے۔ کوئی کچھ نہیں بولا، لیکن آنکھوں میں بہت سے سوالات تھے، شکایت تھی کہ یہ کیسا مذاق تھا۔ اس مختصر ہال کی ہوا اب دبیز ہو چکی تھی۔ تازہ ہوا کی آمد نہیں تھی، جو آکسیجن جمع تھی وہ اکتیس نفوس سانس لے کر خرچ کر رہے تھے۔ پھر سانس کے ساتھ جو گیس خارج ہو رہی تھی اس سے ہال کی فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ نور الدین کا بس چلتا تو سانس لینے پر بھی راشن لگا دیتا۔ بقیہ تیس کان کن اسے اپنی ذمہ داری محسوس ہو رہے تھے۔ احمد کو نکال بھی دوں تو بھی ان تیس جنوں کا تو کچھ کرنا ہوگا، اس نے دل میں سوچا۔

اب تقریباً دو دنوں کے بعد اس کی تسلیوں میں وہ دم خم نہیں تھا۔ پھر یہ کہ وہ کچھ بھی کہے، فضا میں بڑھتی ہوئی مایوسی کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔

''ٹن'' آواز پھر سنائی دی، اور پھر ٹن ٹن ٹن، نور الدین کو لگا کوئی قید خانے کا تالہ کھول کر آزادی کی نوید دے رہا ہو۔ اس نے جھٹک کر اپنے سر کو صاف کیا۔ نقاہت سے خود اس کا دل بھی اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اب تک سب مل کر دو دو راشن کھا چکے تھے کوئی پانچ پانچ راشن ہر ایک کے حصے کے باقی تھے۔ شکر ہے چند کان کن زخموں سے بیہوش تھے ورنہ راشن اور کم ہو جاتا۔ نور الدین کو خود ہی اپنی گھٹیا سوچ پر شرمندگی ہوئی۔ پانچ پانچ راشن، راشن کیا ایک مٹھی بھر چاول، یا دو بسکٹ یا کسی کے پاس بچی ہوئی ایک روٹی۔ دن میں اگر دو راشن سے گزارہ کریں تو ڈھائی دن چل سکتے ہیں۔ حالانکہ اس کی بھوک اس وقت ایسی تھی کہ پورے اکتیس بندوں کا پانچوں وقت کا راشن منٹوں میں چٹ کر سکتا تھا۔ اس نے دیوار کے سہارے خود کو کھڑا کیا اور ٹن کی آواز کی سمت بڑھا۔ یہ جاننا زیادہ دشوار نہ تھا کہ یہ آواز اس پائپ میں سے آ رہی تھی جو سامنے والی دیوار اور چھت کے جوڑ کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس ہال میں کئی چیزیں ایسی تھیں جسے نور الدین پائپ پر مار کر آواز پیدا کر سکتا تھا۔ اس نے ایک ہتھوڑا اٹھا کر پائپ پر برسانا شروع کر دیا۔ ''ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن'' نور الدین نے بیرونی دنیا سے رابطہ بحال کر لیا۔

پائپ کے اطراف سے گزر کر دوانچ کے راستے کو مزید آگے بڑھانا خاصہ دشوار ثابت ہوا۔اب حادثے کو تقریباً تین دن گزر چکے تھے۔اندر اور باہر دونوں طرف سے ٹن ٹن امیدیں بحال رکھے ہوئے تھی۔وہ رشتہ دار جو مشتعل ہو کر بلوے پر آمادہ تھے وہ بھی ایک عجیب بے چینی سے انتظار میں گرفتار تھے۔خرم نے بھی ایک خیمے میں ہی ڈیرہ جمالیا تھا۔ان تین دنوں میں زیادہ وقت انتظار میں ہی گزرا تھا۔اسے سوچنے کا بہت وقت ملا۔عالیہ کے ساتھ اس کے تعلق کا کوئی سبب یا جواز نہیں بنتا تھا۔خرم اس سے اچھی طرح واقف تھا۔یہ بات اس کا لاشعور تو بہت پہلے قبول کر چکا تھا مگر ان تین دنوں میں وہ اس حقیقت کو شعوری طور پر قبول کر کے اپنے افعال میں امان تلاش کر چکا تھا۔اسے یقین تھا کہ احمد کی طرف اس کی بیوی کا جھکاؤ محض انتقامی تھا اور بات ہر گز التفات سے آگے نہیں بڑھی تھی۔اس نے بیوی کو بھی وہیں خیمے میں بلوا لیا۔پچھلے دو دنوں میں دونوں ایک دوسرے سے خاصے گلے شکوے کر کے ایک دوسرے کے جذبہ شرمندگی میں پناہ گیر تھے۔ایک لحاظ سے اس حادثے نے خرم کو موقع فراہم کیا تھا کہ اپنی زندگی کو واپس ایک سمت فراہم کر سکے۔

بیوی کو وہیں خیمے میں بلا لینے کا عمل خرم کے لئے تو جیسا بھی رہا مگر تعلقاتِ عامہ کے لئے بہت خوشگوار ثابت ہوا۔لوگوں نے اسے ملک خاندان کی اپنے کان کنوں سے محبت اور وفاداری سے تعبیر کیا۔

جس جگہ سے سوراخ کو بڑھایا جا رہا تھا وہاں سے اچانک تالیوں کی آوازیں آنے لگیں تو خرم لپک کر خیمے سے باہر نکلا۔

''کیا ہوا؟''

اس کا سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی اوورسیئر نے جوش میں بولنا شروع کر دیا تھا:

''سوراخ نیچے ہال تک پہنچ چکا ہے''

''اس سے کیا فائدہ ہوگا''

''اب ہم کم از کم ان کان کنوں تک تازہ ہوا اور شاید پانی اور کچھ مائع پہنچا سکیں گے۔''

حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ کر خرم نے انجینئر کو گلے لگا لیا۔

''لیکن وہ بھاری مشینیں کب نکاسی کا راستہ بنا سکیں گی کہ وہ پھنسے ہوئے کان کن باہر آ سکیں؟''خرم نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''جناب ابھی اس میں مزید تین سے چار دن لگنے کا امکان ہے۔ بہت احتیاط سے آگے بڑھنا پڑتا ہے کہ کہیں ملبہ، کوئی چھت یا شکستہ دیوار راستے کو بالکل مسدود نہ کر دے''۔خرم کو اپنی خوشی نصف ہوتے محسوس ہوئی۔

تالیوں کی آواز سن کر کان کنوں کے خاندان بھی خیموں سے باہر نکل آئے تھے۔یہ اچھی خبر سن کر ان کے چہرے دمک اٹھے اور وہ ایک دوسرے کو گلے لگانے لگے۔مصیبت نے سب کو جیسے جذبوں کی ایک ہی لڑی میں پرو دیا تھا۔کیمرے کی آنکھ ان جذبوں اور سوراخ کی کھدائی کے منظر کو پوری قوم تک پہنچانے لگی۔

نیچے ہال میں تین دن تین قیامتوں کی طرح تھے۔اب ہوا اتنی کثیف تھی کہ کئی لوگ سر میں درد اور قے کی شکایت کر رہے تھے۔تین دن کا فضلہ بھی فضا میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔گو بُو کا احساس اب اتنا معمول بن گیا تھا کہ جاتا رہا تھا۔تبدیلی احساس کو بیدار کرتی ہے۔اب ہال کی فضا مسلسل بوجھل تھی اور واحد تبدیلی تیزی سے کم ہوتی آکسیجن ہی تھی۔تین اور کان کن جو پہلے ہوش میں تھے اب بیہوش تھے۔کھانے کا راشن ختم ہونے کے قریب تھا۔کمزوری اور نقاہت اتنی شدید تھی کہ پہلے دن جو بچ جانے کی آس انہیں زندہ رکھے ہوئے تھی وہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔گزشتہ رات کھٹ پٹ سے نورالدین کی آنکھ کھلی تو اس نے ایک کان کن کو بچے کچھے راشن پر جھکے دیکھا۔یہ لالچ اور ناانصافی دیکھ کر اس حالت میں بھی وہ رہ نہ سکا۔پاس پڑے ایک پتھر کو اس کی جانب پھینکا تو وہ کان کن گھسٹ کر اپنی جگہ پر جا لیٹا۔نورالدین ان سے آخری دم تک اچھی اقدار کا خواہشمند تھا۔اس نے گھسٹ کر اپنے آپ کو ایسے بٹھا لیا کہ ایک دفعہ کا بچا ہوا راشن اب اس کے داہنے جانب پشت پر تھا اور اس تک پہنچنے کے لئے نورالدین کو پھلانگ کر جانا پڑتا۔وہ خود چاہتا تو بہت آسانی سے ہاتھ بڑھا کر راشن میں خرد برد کر سکتا تھا، لیکن اب آخر وقت میں وہ کوئی ایسا کام کر کے اپنا ایمان خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ذہن پر ایسی غنودگی طاری تھی کہ کوئی اسے پھلانگ کر راشن تک جاتا تو اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔لیکن ہم سب کی طرح رکاوٹیں کھڑی کر کے نور الدین مطمئن ہو گیا تھا کہ بدعنوانی کو روک لے گا۔اچانک اسے ایسا لگا کہ جیسے ہال میں تازہ ہوا کا جھونکا سا آیا ہو۔شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں، یا اب ہذیانی کیفیت شروع ہو رہی ہے۔لیکن اس ہوا کے جھونکے کے ساتھ اب ہال کی فضا واضح طور پر بہتر ہو رہی تھی۔سانس لینا نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔تشویش کی بات صرف یہ تھی کہ ٹن ٹن کی آواز بند ہو گئی تھی۔نورالدین نے بمشکل خود کو گھسیٹ کر نیم دراز کیا تو سامنے کی دراز میں ایک سوراخ نظر آیا، تازہ ہوا اسی میں سے آ رہی تھی۔اس نے وہیں کھڑے ہو کر کئی منٹ تک گہری سانسیں لیں۔کئی اور کان کن بھی واضح طور پر اس تازہ ہوا کا اثر محسوس کر رہے تھے سوراخ میں سے اچانک سنسناہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور ایک دوانچ قطر کا پائپ اس میں سے جھانکنے لگا۔نورالدین وہیں زمین پر بیٹھ گیا کہ مزید کھڑے رہنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔وہ شاید وہیں دوبارہ غنودگی میں چلا گیا۔اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کتنی دیر اس بیہوشی میں رہا لیکن خواب میں اسے محسوس ہوا کہ جیسے منہ پر پانی کے قطرے گر رہے ہیں۔اس نے آنکھ کھولی تو واقعی جس پائپ سے پہلے ہوا آ رہی تھی، اسی پائپ میں سے رس رس کے پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔نورالدین کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک پتلی دھار میں تبدیل ہو گیا۔نورالدین نے منہ کھول دیا اور مٹیالے پانی سے اسے اچھو لگ گیا۔واہ ری

قدرت، درست ہی تو کہا ہے پالنے والے نے کہ ہم پتھر میں بھی رزق پہنچاتے ہیں۔نورالدین کی طرح پانچ چھ اور کان کن بھی اپنا جسم گھسیٹ کر وہاں پہنچ گئے اور اس مٹیالے پانی سے پیٹ بھرنے لگے۔نورالدین نے ہمت کر کے ایک بیہوش کان کن کو بھی اس پائپ کے نیچے کھینچ لیا کہ اس کے منہ پر پانی کی ہلکی سی دھار پڑنے لگی۔اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ہوش مند کان کنوں نے بمشکل گھسیٹ کر جنہیں بھی پائپ کے نیچے پہنچا سکتے تھے پہنچا دیا۔چند ہی لمحوں میں پانی جیسے آیا تھا اسی طرح بند بھی ہو گیا۔کان کنوں نے وحشت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن نورالدین نے انہیں اطمینان دلایا کہ یہ غالباً اس لئے ہے کہ ہال میں کیچڑ نہ پیدا ہو، چند گھنٹوں بعد پانی یقیناً دوبارہ کھلے گا، اور ہوا بھی یہی۔

پانی اور ہوا کی نکاسی سے اب صورتِ حال بہتر تھی لیکن کان کو بند ہوئے کوئی چھ دن گزر چکے تھے۔راشن کب کا ختم ہو چکا تھا۔اب اندر ہال میں اوپر ہونے والی کھدائی کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔دو انچ کے پائپ کو چوڑا کر کے اب تقریباً ایک فٹ قطر کی جگہ بنائی جا رہی تھی۔پائپ کے اطراف کی مٹی اندر کان میں گری تو اس کے پاس بیٹھے کان کن ڈر کے ہٹ گئے۔یہ خوف روزِ اول سے سب کے دماغ میں تھا کہ ہلکی سی بے احتیاطی سے اس ہال کی چھت ان کان کنوں پر گر بھی سکتی ہے۔مگر اس مٹی کے گرنے سے کوئی ایک فٹ چوڑائی قطر کی سرنگ باہر کی دنیا کو اندر دبے کان کنوں سے رابطہ بنانے کا ذریعہ بن گئی۔ساتھ ہی سورج کی روشنی ایک کرن اس سوراخ سے ہال کو روشن کر گئی۔جو کان کن اس قابل تھے وہ سب تالیاں بجانے لگے۔

''ہیلو تم لوگ کیسے ہو'' ڈھائی سوفٹ کا فاصلہ طے کر کے ایک فٹ قطر کی سرنگ سے یہ آواز ہال میں ایسے سنائی دی جیسے صور پھونکا جا رہا ہو۔کئی کان کنوں نے جواب دینے کی کوشش کی مگر کسی سے آواز نہ نکلی۔بھوک، کمزوری، بخار، نمونیہ مختلف کان کنوں کو مختلف مراحل درپیش تھے۔نورالدین جب کوشش کے باوجود آواز نہ نکال سکا تو اس نے ہلکے ہلکے تالیاں بجانی شروع کر دی۔بے ربط، بہت مدہم سی آواز جیسے کوئی فالج زدہ شخص بے ہنگم طریقے سے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارے۔اس کی دیکھا دیکھی چند دوسرے کان کنوں نے بھی یہی حرکت دہرائی تو ہال میں اتنی گونج ضرور پیدا ہوگئی کہ یہ تھپ تھپ باہر سنی جا سکے۔باہر کھڑے سینکڑوں لوگ، جو ''تم لوگ کیسے ہو'' کا جواب نہ پا کر دم سادھے کھڑے تھے، سینکڑوں کے مجمعے کے باوجود ایسی خاموشی تھی کہ کوئی سوئی بھی گرتی تو آواز سن لی جاتی۔ایسے میں جب کان کے پیٹ سے تھپ تھپ کی آواز باہر پہنچی تو ایک شور مچ گیا، لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے، مبارک بادیاں، خوشی کی کلکاریاں، انسانی ہمت اور زندہ رہنے کی جبلت ایک بار پھر جیت گئی تھی۔

اسی ایک فٹ کے سوراخ سے ایک تھیلی میں چاکلیٹیں بسکٹ، طاقت کی گولیاں اور ڈاکٹروں کی تجویز کی ہوئی غذا، جو اس مختصر سوراخ سے گزر بھی سکے۔، نیچے بھیجی گئی۔ساتھ ایک پرچے پر یہ نوید بھی کہ دو دن بعد بھاری مشنری اتنا بڑا سوراخ کر لے گی کہ انہیں باہر نکالا جا سکے۔کسی عقلمند نے ایک سادہ کاغذ اور قلم بھی بھیج دیا، کہ رابطے کا یہ ذریعہ باقی رہے۔غذا نیچے کیا پہنچی گویا حیات واپس لوٹ آئی۔ذرا ہمت ہوئی تو نورالدین نے جائزہ لیا۔حیرت کی بات تھی سب کی سانس جاری تھی۔بڑے تودے کے نیچے دبا احمد بھی سانس لے رہا تھا۔جبار اس کے منہ میں پانی ٹپکا تا رہا تھا۔اب اس غذا کے ساتھ آئے طاقت کے قطرے بھی سب مریضوں کے منہ میں ٹپکا دیئے گئے۔ایک وقت کے کھانے کے ساتھ ہی واضح فرق پڑ گیا تھا۔رات ہونے سے پہلے، غذا کی دوسری قسط نیچے اتری تو نورالدین نے کاغذ پر پیغام لکھ کر اوپر بھیج دیا:

رسی اوپر کھینچی گئی تو اس کے وزن سے صاف ظاہر تھا کہ نیچے سے کان کنوں نے کچھ رکھ کر بھیجا ہے۔خرم بھی رسی کھینچنے والے کے پاس کھڑا ہو گیا۔جو ٹوکری نیچے بھیجی گئی تھی اس میں سوپ کی بوتل اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر کان کنوں نے نیچے سے بھیجا تھا۔خرم نے بڑھ کر پرچہ اٹھایا اور اسے بلند آواز سے پڑھنے لگا:

''کچھ دوائیوں کی سخت ضرورت ہے ساتھ کچھ تاش کے پتے بھیج دو یہ سوپ ٹھنڈا ہے اسے گرم کرا کے دوبارہ بھیجو''

آپ کا خادم نورالدین۔

خرم کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ بکھر گئی، پاس کھڑے انجینئر اور اوورسیئر سب ہی ہنسنے لگے۔ہمیشہ کا سور ہے یہ نورالدین۔

غریب انسانوں!

برطانوی خبر رساں ادارے کی تحقیقی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھاری بھر کم دولت پر مشتمل مینجمنٹ ٹیموں کے ذریعے دنیا کے کھرب پتی لوگوں کی دولت میں مزید اضافہ ہوا ہے جبکہ کروڑ پتی لوگ مزید غریب ہو گئے ہیں۔رپورٹ کے مطابق کم از کم تین کروڑ ڈالر رکھنے والے افراد کی کل تعداد ایک لاکھ ستاسی ہزار جبکہ ان کی دولت میں اعشاریہ آٹھ فیصد کمی کے بعد دو ہزار پانچ سواسّی ارب ڈالر رہ گئی ہے۔اس کے مقابلے میں دولت مند کھرب پتی لوگوں کی تعداد، دو ہزار ایک سو ساٹھ ہو گئی ہے۔ان کی دولت میں چودہ فیصد اضافہ کے بعد اُس کی مالیت چھ سو بیس ارب ڈالر ہو گئی ہے۔

کوّے بہت ہیں

رومانہ رومی

(کراچی)

کرنل کبیر سے ملنے کی خواہش اسے کامرہ تک لے ہی آئی ،اس نے وین کے مطلوبہ اسٹاپ پر رُکتے ہی اپنا مختصر سامان اُٹھایا اور وین سے باہر آگیا وین سے باہر نکلتے ہی اسے خنکی کا احساس ہوا اس نے بیگ کاندھوں پر ڈالا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا اسے کرنل کبیر نے بتا دیا تھا کہ جیسے ہی وُہ اڈے پر اترے گا اسے لانے کے لیے فوجی جیپ وہاں کھڑی ہوگی اس کی نظریں اسٹاپ سے ہوتی ہوئی سامنے واقع لاثانی ریسٹورنٹ پر رُک گئی جہاں اک فوجی جیپ کھڑی تھی وُہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا وہاں پہنچا جیپ کے ساتھ کھڑے فوجی کی متلاشی نگاہوں نے اسے آتے دیکھا تو گویا جانچ لیا کہ اس کے صاحب کا یہی مہمان ہے اس کے لبوں سے اردو اور پنجابی میں گندھا ہوا لفظ نکلا

''ذیشان صاحب؟''۔

اس نے ہلکا سا گردن کو خم دیا گویا یہ اثبات کا اشارہ تھا چند لمحوں بعد وُہ جیپ کی پچھلی آرام دہ نشست پر بیٹھا فوجی چھاؤنی کی حدود میں داخل ہو رہا تھا واقعی یہ شاہراہ،شاہراہِ عام نہ تھی یہ علاقہ ہر خاص وعام کے لیے گذرگاہ کی حیثیت نہ رکھتا تھا داخلے کے گیٹ پر فوجی گاڑی کے ڈرائیور کو بھی چند لمحہ روکا گیا پھر شناخت کا مرحلہ پل میں طے ہوتے ہی اسے اندر داخلے کی اجازت مل گئی۔ جیپ انتہائی صاف ستھرے،سرسبز و پھول دار راستے سے گزرتی ہوئی کئی آرمی بیر کس کو طے کرتے ہوئی بالآخر ایک نہایت نفیس اور سجے ہوئے دفتر کے سامنے جا کر رُک گئی،ڈرائیور نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا احتراماً جھکتے ہوئے اسے اِک دفتر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ کرنل کبیر وہاں آپ کے منتظر ہیں وُہ پتھروں سے تراشے ہوئے راستے پر چل پڑا دفتر کے باہر بھی خاکی وردی میں ملبوس اردلی کھڑا تھا اس نے اسے اپنا نام بتایا وُہ اندر چلا گیا چند لمحوں بعد ہی جب اردلی باہر آیا تو اس کے ساتھ ہی کرنل کبیر بھی آگیا،کلف لگی خاکی وردی میں اس کا جمال اور جلال بیک وقت نکھرا ہوا لگ رہا تھا اس نے والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر ذیشان کا استقبال کیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے دفتر میں چلا گیا رسمی باتوں کا،سفر کے حال احوال کا اور چائے کا دور چلنے لگا۔

ذیشان معروف افسانہ نگار و تنقید نگار کے طور پر جانا جاتا تھا۔کرنل کبیر سے اس کی شناسائی ،جان پہچان کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا قلمی رشتے کی مضبوطی اور پھر ٹیلی فونک گفتگو،ایک دوسرے کے مضامین پر اظہارِ خیال ،ان کے رشتوں کو مضبوط کرتی چلی گئی فوجیوں کے بارے میں نہ جانے کیوں ذیشان کی رائے زیادہ مثبت نہ تھی تاہم وُہ کرنل کبیر کو''کرنل'' سے زیادہ ایک لکھاری کی حیثیت سے پسند بھی کرتا تھا اور اس کی تحریروں کا دلدادہ بھی تھا۔دفتر میں چند لمحے رُک کر کرنل کبیر اُسے اپنی جیپ میں لے کر گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

تراشیدہ پتھروں کی مدد سے تعمیر کردہ کھلے کھلے گھر،شہر کی دھول آلودہ زندگی سے باہر آکر یہاں کی فضا اسے بالکل مختلف محسوس ہو رہی تھی وُہ سحر زدہ کیفیت سے گزرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وُہ پاکستان ہی کے کسی شہر میں گھوم رہا ہے یا پھر کسی طلسماتی فضا نے اسے آگھیرا ہے اسے سارا ماحول کسی الف لیلوی داستان کا حصّہ لگ رہا تھا اس کی سوچ کو اس وقت بریک لگے جب گاڑی نے ایک جھٹکا سا لیا اس نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے دیکھا گاڑی کرنل کبیر کے گھر کے کھلے آنگن میں رُک چکی تھی۔ یہ گھر کوئی دو ہزار گز پر بنا ہوا تھا گھر کے چاروں اطراف باغ تھا جسے بڑی محنت سے سنوارا گیا تھا اُسے ابھی تک کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہ آئی تھی ہاں ایک خاص بات جو اُسے محسوس ہوئی وہ تھی فضا میں ایک عجیب سا سکوت،اِس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتا کرنل نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دونوں گھر میں داخل ہوگئے۔کھانا کھاتے اور گپ شپ کرتے شام ڈھلنے لگی اسی اثنا میں کرنل کبیر نے اُسے یہاں کے ایک خوبصورت پارک کو دیکھنے کی دعوت دی۔پارک کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا اِس لیے اُنہوں نے پیدل چلنا شروع کردیا۔وہ شروع سے کئی اہم باتوں کو اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں محفوظ کرتا جا رہا تھا جو اُسے سوالات کرنے کی ترغیب دے رہے تھے مگر وہ بڑے صبر وتحمل سے کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا چلتے چلتے باتیں کرتے کرتے اُسے موقع مل ہی گیا۔

''کرنل صاحب! کیا ہمارا پورا ملک آپ کے اس فوجی چھاؤنی کی طرح خوبصورت اور صاف ستھرا نہیں ہوسکتا؟''

کرنل کبیر نے چونک کر اسے دیکھا،چند لمحے سوالیہ سی نظریں جیسے وُہ سمجھنا چاہتے ہوں کہ میں نے آخر یہ سوال کیوں،کس لیے کیا ہے؟ ان کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں شاید وُہ اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے اور اب مناسب جواب تلاش کر رہے تھے پھر انتہائی دھیمے لہجے میں انہوں نے کہنا شروع کیا۔''ذیشان صاحب! میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر محبّ وطن شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے وطن کا ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر قصبہ ایسے ہی نکھرا نکھرا حسین، جاذبِ نظر اور خوبصورت ہو مگر ایسا خواہش سے نہیں بلکہ محنت اور توجہ سے ہوتا ہے۔فوج جیسا نظم وضبط،محنت ولگن اور اپنے کام سے گہری وابستگی،لگن اگر ہر شخص کا وطیرہ بن جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کے ہمارے ملک کا ہر کونا آپ کو ایسا ہی نظر آئے گا بات صرف وصرف محنت اور لگن کی ہے۔''

''مگر کرنل صاحب! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فوج جیسی سہولیات اور وسائل عوام کو کہاں میسر ہیں؟''

''بالکل میسر ہیں! بات صرف اُن کے صحیح استعمال کی ہے۔'' کرنل نے فوراً جواب دیا۔

اِس سے پہلے کہ بات مزید آگے بڑھتی پارک کا صدر دروازہ قریب آ گیا اور وہ دونوں پارک میں داخل ہو گئے۔ پارک کو عمدہ پلاننگ سے بنایا گیا تھا پارک بڑے وسیع رقبہ پر محیط تھا۔ اس کے چاروں طرف مصنوعی پہاڑ بنائے گئے تھے جب کے نیچے وادی میں پانی کی ایک بڑی شفاف سی جھیل بھی موجود تھی۔ اِس جگہ کی خوبصورتی کو آنکھوں میں اُتارتے ہوئے وہ پارک کے درمیان بنے ہوئے جدید طرز کے چھتری نما ہٹ کے اندر پتھر سے تراشیدہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن ہمارے درمیان جاری باہم ادبی و سیاسی گفتگو تھمنے کا نام نہ لے رہی تھی اس ماحول کو کوؤں کے اچانک شور نے متاثر کر دیا ذیشان نے سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا لاتعداد کوّے فضا میں منڈلا رہے تھے کچھ اونچی پرواز سے کچھ نیچی پرواز سے اُڑان بھرتے ہوئے کائیں کائیں کئے جا رہے تھے پارک کی پوری پُرسکون فضا کو یوں ڈسٹرب ہوتے دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا اس نے کرنل کبیر سے پھر ایک سوال کر دیا۔ ''کرنل صاحب!۔۔۔ایک زمانہ تھا کہ یہاں کوّے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے تھے یہاں کی فضا میں طوطے، کوئل، مینا اور چڑیوں کے ساتھ ساتھ دیگر اسی طرح کے خوش کن پرندے یہاں کی فضا میں محوِ پرواز رہتے تھے کہیں سے کوئل کی کوک آتی تھی تو کہیں سے تیتر کی سبحان تیری قدرت کی صدا آتی تھی اب وُہ آوازیں بند ہو گئی ہیں اور ان خوبصورت پرندوں کی جگہ ان بدصورت پرندوں نے لے لی ہے آخر کیوں؟۔۔۔آخر یہاں بھی کوّے زیادہ کیوں ہیں؟۔۔۔''

کرنل بے ساختہ ہنس دیا جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

شام ڈھلتے ہی اندھیرا بڑھنے پر پارک کی روشنیاں جل اُٹھیں اور ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تو ہم نے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچ کر چائے کے ایک تازہ کپ نے سردی کے احساس کو جیسے ختم کر دیا، کرنل کبیر نے اسے اپنا ایک تازہ افسانہ سنایا اور اس دوران اسے بتایا کہ ہم رات کا کھانا آفیسرز میس میں جا کر کھائیں گے۔

آفیسرز میس، گو کچھ فاصلے پر تھی مگر ذیشان نے اس پر اصرار کیا کہ ہم پیدل جائیں گے، گھر سے کلب کے لیے جب وُہ روانہ ہوئے تو رات گہری ہو چکی تھی مگر چاند کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔۔۔عجیب سے طلسماتی ماحول میں قدم بہ قدم چلتے ہوئے مینڈکوں کی ٹراہٹ اور جھینگروں کی آوازیں سُنتے ہوئے وُہ آفیسرز میس تک پہنچے پھر جیسے ماحول اچانک بدل گیا۔۔۔کلب اچھے خاصے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوئے جس کا ایک حصّہ انڈور گیم کے لیے مخصوص تھا۔ بچے ویڈیو گیم کھیل رہے تھے جب کہ بڑے سنوکر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اندر کا ماحول بجلی سے چلنے والے ہیٹروں کی وجہ سے گرم تھا۔ اُن دونوں نے یہاں کچھ وقت گزارا اور رات کے کھانے کے لیے ڈائننگ ہال کی جانب چل دیئے۔ ڈائننگ ہال بھی کافی بڑا اور خوبصورت تھا۔ اِس کو قیمتی اور نفیس فرنیچرز سے آراستہ کیا گیا تھا جب کہ ایک کونے میں دیوار کے مخصوص حصے کو ٹی وی اسکرین میں تبدیل کر دیا گیا تھا بہت سے افراد ٹی وی پر خبریں سننے میں محو تھے۔ اُس وقت نیوز چینل پر ملک میں ہونی والی تازہ ترین دہشت گردی کی ایک خبر نشر ہو رہی تھی جس کو سن کر دونوں نے دکھ سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ دہشت گردوں کا تعلق ہمارے اُس پڑوسی ملک سے ہے جنہیں کبھی ہم نے پناہ دی تھی مگر اب وہی ناسور کی صورت ہمارے ملک کی بربادی کا سبب بن رہے تھے۔ اُس نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے سوال کر ہی لیا۔۔

''کرنل صاحب! کیا یہ وہی لوگ نہیں ہیں جن کو آپ ہی کے ایک جرنیل نے اپنے دورِ حکومت میں ملک میں پناہ دی اور ان کی امداد کے نام پر ڈالر وصول کئے ان کو ملک کے اندر پنپنے کا موقع دیا اور پھر اُن کے نام پر مزید ممالک سے فوائد حاصل کئے اِس کُھلی چھوٹ کی وجہ سے اِس وقت ہمارا ملک ناجائز اسلحے اور منشیات کی عالمی منڈی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور پورے ملک میں کسی کی جان محفوظ نہیں ہے؟''

کرنل کبیر نے افسوس زدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ ایک شخص کی غلطی پر پوری فوج کو کیسے ذمے دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ آپ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ تپتے ہوئے صحراؤں کی جھلسا دینے والی گرمی سے لے کر سیاچین کی خون جما دینے والی سردی میں ملک کی حفاظت کرنے والے بھی یہی فوجی ہوتے ہیں۔''

''مجھے اِس بات سے انکار نہیں! اُس نے کہا۔ مگر پتا نہیں کیوں حالات کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پوری قوم سیاست دانوں اور فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں یرغمالی ہو! کیوں کہ یہ فوجی جرنیل محدود مدت کے لیے آ کر لامحدود وقت کے لیے ملک پر قابض ہو جاتے ہیں اور کیا یہ بات سچ نہیں ہے کہ آپ ہی کے ایک اور سابق فوجی جرنیل نے اپنی حکومت کو لامحدود وقت کے لیے قائم رکھنے کی خاطر فوجی افسران کو ملک کے تمام سول اداروں کا سربراہ بنا کر ملک میں ملٹری بیورو کریسی کو متعارف کروایا جن کی یہ پریکٹس آج تک قائم ہے اور جس کی وجہ سے سارے سول ادارے تباہ ہو کر رہ گئے۔ اِس جیسی اور بہت سی دیگر غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہم نہ صرف آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں سے آغاز کیا تھا بلکہ آج تک ہم میں یک جہتی اور قومی تشخص پیدا نہیں ہو سکا اور نہ ہی بین الاقوامی طور پر ہماری کوئی شناخت بن سکی۔ اِس کا ذمہ دار کون ہے کہ آج تک قائدِ اعظم کے بعد نہ کوئی اچھا لیڈر ملا اور نہ ہی مخلص جرنیل۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے، معیشت تباہی کے دہانے پر آ پہنچی مگر قوم کے نمائندوں کو شرم نہ آئی فوج اپنے دفاعی بجٹ میں اضافہ کرتی رہی، پلاٹ لیتی رہی، فوجی اسکیمیں،

فوجی بینک متعارف کراتی رہی اور اپنے مفادات حاصل کر کے حکمرانوں کو سب کچھ کرنے کی اجازت دے دی اُن کی عیاشیوں پر قوم قرض دار ہوتی جارہی ہے ۔ملک کے دفاع کے نام پر اربوں کے بجٹ خرچ کرنے کے باوجود جاسوسی طیاروں کے حملوں پر کسی جرنیل کو کوئی تشویش نہیں ،سب خاموش اور ایسی چُپ سادے بیٹھے ہیں جیسے اِن سب باتوں سے اُن کا کوئی تعلق ہی نہ ہو کچھ مخصوص جرنیل ہیں جو اپنی مدتِ ملازمت شاہانہ انداز سے مکمل کرنے کے بعد باقی زندگی بھی عیش سے گزار رہے ہیں ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ملک کے حالات خراب ہوں اور اُنہیں مارشل لاء کے ذریعہ ملک پر حکومت کرنے کا موقع ملے۔'' س نے ساری باتیں کھل کر کہہ دیں۔

'' آپ نے ہمارے فوجی جرنیلوں کے بارے میں بہت ہی غلط اندازہ لگایا ہے ایسی کوئی بات نہیں دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔''

کرنل کبیر کچھ بولتے بولتے رک گئے اور کہا۔'' دراصل میں کچھ سمجھانا چاہوں تب بھی شاید میں آپ کے ذہن کی سوچ تبدیل نہیں کر پاؤں گا''۔

'' لیکن یہ بات ضرور ہے کہ چاہے حکومت عوامی ہو یا فوجی ہماری تقدیروں کا فیصلہ وہ غیر ملکی آقا کرتے ہیں جو ہمیں اپنی شرائط پر قرضوں کی بھیک دیتے ہیں اور جس کا فائدہ بھی صرف اور صرف افسر شاہی ،سیاست دان حضرات سمیت چند مخصوص فوجی جرنیل ہی اُٹھاتے ہیں اور اُٹھاتے رہیں گے''۔

کرنل کبیر ،کی گفتگو کو روکتے ہوئے ذیشان نے کہا'' میری بات کا بُرا نہ مانیے گا دراصل ایک ادیب ہونے کے ناطے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حساس ہوں سب ہی فوجی سب ہی سیاست دان یقیناً کرپٹ نہیں ہیں تاہم اکثر یت'' خربوزے کو دیکھ کر خربوزے کی طرح'' بگڑ چکی ہے اور پھر پیسہ کس کو بُرا لگتا ہے۔۔۔اب تو ہمارے سیاست دانوں اور فوجیوں نے عوام کو لوٹ لوٹ کر سوئس بینک بھر دیئے ہیں کسی نے دبئی میں تو کسی نے برطانیہ میں جائیدادیں خرید لیں تو کسی نے امریکہ میں کاروبار میں رقم لگا کر خود کو مستحکم کر لیا ان کا پاکستان سے بھاگنا آسان ہے کوئی مولانا بن کر لوٹ رہا ہے تو کوئی قرضہ اتارو اسکیم کا نام لے کر تو کوئی این جی او بنا کر ،یہاں سب لیٹرے ہیں اور ان کے ہاتھوں لٹے ہوئے عوام میں قطعی ہمت نہیں کہ وُہ روڈ پر احتجاج کر سکیں اس لیے کہ ان کی صبح سے شام تک کی ساری جدوجہد مزدوری کر کے اتنی رقم حاصل کرنا مقصد ہوتا ہے کہ جس سے وُہ اپنے بیوی بچوں کا عزت سے پیٹ بھر سکے کیا آپ کو اس کا اندازہ ہے کہ پچھلے چار سالوں میں پاکستان میں کتنی شریف خواتین عصمت فروشی کی طرف مائل ہوئی ہیں؟۔۔۔کیا آپ کو اس کا اندازہ ہے کہ کتنی بوڑھی ماؤں کے بیٹے ،کتنی ہی خواتین کے سہاگ نشے کے عادی ہو کر روڈ پر پڑے ملتے ہیں لوگوں نے سرِ عام موبائل تک چھیننا شروع کر دیئے ہیں۔۔۔کراچی میں تو خواتین سونے کے زیورات پہننے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں ۔۔۔کیا اس میں صرف سیاست دان ملوث ہیں کیا ہم ایک طویل مدت تک برسرِ اقتدار رہنے والے فوجی حکمرانوں کو رعایتی نمبر دے دیں جو مکمل قوت و طاقت کے ساتھ بادشاہت کر تے رہے اور جو چاہتے تو ملک کی قسمت بدل سکتے تھے لیکن جو فوجی ذاتی مفادات کی خاطر کالا باغ ڈیم نہ بنا سکا ہوؤہ ملک کی قسمت کیا بدلیں گے؟۔۔۔ہمارے ملک کی تباہی میں فوجی و سول دونوں قیادتوں کا ہاتھ ہے۔''

ذیشان کی ہیجان انگیز گفتگو کو سنتے سنتے کئی بار کرنل کبیر کو ذرا آہستہ، ذرا آہستہ کہنا پڑا اردگرد موجود فضا پر پڑنے والے اثرات سے وُہ اپنے مہمان کو شاید محفوظ رکھنے کا خواہاں تھا۔۔۔آخر اس نے کہا کہ'' ذیشان صاحب افسانہ لکھنے اور حقیقت میں بڑا فرق ہے''۔اس سے پہلے کہ کرنل کبیر کچھ اور کہتے ان کے کانوں تک ٹی وی کی ایک گونجتی ہوئی آواز پہنچی کسی نے ٹی وی کی آواز اچانک تیز کر دی تھی وہاں بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔

'' اعلیٰ عدالت کی جانب سے بڑے کیس پر تفصیلی فیصلہ آنے کے بعد کرنل صاحب کے ادارے کو اہم ذمہ داری کے لیے طلب کر لیا گیا تھا۔

اعلان سُن کر کرنل کبیر جیسے سکتے میں آ گئے انہوں نے ذیشان کی طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی مجرم!۔۔۔

ذیشان ہنس دیا اور بولا۔

'' کرنل صاحب !۔گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔۔۔میں نے آپ کو کہا تھا ناں کہ کبھی یہاں کوئلیں کوکا کرتی تھیں۔۔۔تیتر'' سبحان تیری قدرت'' کہا کرتے تھے۔۔۔چڑیاں چہچہاتی تھیں۔۔۔مگر۔۔۔اب فضاؤں میں ان کو مٹایا جا چکا ہے اور اب یہاں صرف کوؤں کا راج ہے اور کوؤں کا کام ہی کائیں کائیں کرنا۔۔۔ٹھونگیں مارنا۔۔۔اور۔۔۔ہاتھ سے گوشت چھین کر فضاؤں میں اُڑ جانا ہے۔۔۔آئیں کرنل صاحب ہم وہاں چلیں جہاں یہ کوّے نہ ہوں۔۔''

۔ تیز ترین بہترین ۔

امریکی سائنسدانوں کے ایجاد کردہ چار ٹانگوں والے روبوٹک چیتے نے ٹریڈمل پر 28 اعشاریہ 3 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ کر نہ صرف اپنا سابقہ ریکارڈ 18 میل فی گھنٹہ بلکہ انسانوں میں تیز ترین دوڑنے والے جمیکا کے ایتھلیٹ یوسین بولٹ کا 27 اعشاریہ 8 میل فی گھنٹہ دوڑنے کا ریکارڈ توڑ کر تیز ترین ربوٹک چیتے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

''شرارے خیال''

آصف ثاقب

(بوئی ہزارہ)

کبھی خوشی کبھی ہم کو ملال دیتے ہیں
جو کچھ نہ ہو وہ اشاروں میں ٹال دیتے ہیں

وہ ہم پہ آگ گراتے ہیں آسمانوں سے
ہم اپنا خون اُدھر کو اچھال دیتے ہیں

ہمارا جسم بہاریں ہے ان کی چاہت میں
وہ زخم دیتے ہیں اور ڈال ڈال دیتے ہیں

غبارِ راہ کے ذرّے جو حرف دیں ہم کو
فلک سے گرتے شرارے خیال دیتے ہیں

اٹھا کے راکھ سخاوت کے ٹھنڈے چولھے سے
وہ اس فقیر کے کاسے میں ڈال دیتے ہیں

کبھی تو آئے گی ثاقبؔ ہماری باری بھی
ابھی عدو کے جہازوں کو ٹال دیتے ہیں

❍

نصرت زیدی

(راولپنڈی)

شاخ شاخ گلشن میں اب ہے آشیاں اپنا
برق کیا جلائے گی سارا گلستاں اپنا

اے جنوں گریباں دھجّیاں سلامت ہیں
اک سدا بہاراں ہے دشتِ گلفشاں اپنا

پیار کے مراحل سب طے کیۓ نگاہوں نے
ہمسفر تھا جو اپنا تھا نہ ہمزباں اپنا

اب تو شہر بھی اُس کا یاد ہی نہیں آتا
عاشقی مبارک ہو دشتِ بے اماں اپنا

جھلملائے ہے اُس کی ماہتاب پیشانی
رات دن تصور ہے رشکِ کہکشاں اپنا

اس کو اک تعلق تھا ہم سے کچھ دنوں پہلے
ذکر اُس حوالے سے ہے کہاں کہاں اپنا

لا کے بعد کہتے ہیں سرحدیں ہیں ایماں کی
کیا یقیں کی منزل پر آ گیا گماں اپنا

❍

خالدحمید شیداؔ

(امریکہ)

وہ ستمگر جو کبھی ترکِ جفا کرتے ہیں
ہم نفل پڑھتے ہیں، تعریفِ خدا کرتے ہیں

اور محفل میں اگر ہم کو بلاتے ہیں کبھی
رات بھر بیٹھ کے ہم حمد وثنا کرتے ہیں

شکرِ شکر سے کرتے ہیں زباں کو شیریں
چومتے پاؤں ہیں، جاں اُن پہ فدا کرتے ہیں

یاد رہتی نہیں کچھ نالہ و زاری اپنی
ہم یوں اُن کے لیے دن رات دعا کرتے ہیں

بھول جاتے ہیں،ہمیں اُن کے مظالم سارے
ہم نہ پھر بھول کے بھی اُن کا گلا کرتے ہیں

راز کھلتے ہیں مگر ہم پہ گرفتاری کے
درِ زنداں وہ رحم کھا کے جوا وا کرتے ہیں

اُن کی بندش سے رہائی نہیں ممکن شیداؔ
باندھتے اور ہیں جب بھی وہ رہا کرتے ہیں

○

ڈاکٹر شباب للت

(شملہ، بھارت)

پاپیادہ موم کی سڑکوں پہ چل کر جُون میں
پاؤں نہلانے لگا ہے خود وہ اپنے خون میں
جُرم ٹھہرائی گئی ہے آج کے قانون میں
جو شرافت ہم کو پُرکھوں سے ملی تھی خون میں
قافلے کے ہم سفر وہ اب بھی آجاتے ہیں یاد
ہجرتوں کی رُت میں جو مارے گئے شبخون میں
تم ملے تو بن گیا دلچسپ مضمونِ حیات
رنگ کیا کیا بھر دیئے ہیں تم نے اِس مضمون میں
راز کی باتیں بھی اب تو راز رہ سکتی نہیں
اُس نے اک آلہ لگا رکھّا ٹیلی فُون میں
عشق میں کیا کیا تھا اپنی تجربہ کاری پہ ناز
فیل بھی آخر ہوئے تو ہم اِسی مضمون میں
قاتلوں کا بال بھی بینکا نہ ہو گا دوستو!
ان کے آقا ڈھونڈ لیں گے جھول کچھ قانون میں
اوفرنگی ! سُن تیری شیطانیت کی داستاں
اِک سادھی کہہ رہی ہے آج بھی رنگون میں
زندگی! کیسے حفاظت ہو تیرے ناموس کی
دھجّیاں کب تک سیئوں تیری پھٹی پتلون میں
ایسا تاجر ہے لگا دیتا ہے وہ لاشوں کے ڈھیر
چیز یہ بیچی نہیں اُس نے کبھی پر چون میں
ہاتھ مت اُس سے ملا لینا کہ اُس مکّار نے
زہر بھر رکھّا اپنے ہاتھ کے ناخون میں
تیرے دَر سے دولتِ صبر و قناعت مل گئی
بس دُعائے شکر ہے اپنے دلِ ممنون میں
اُس ستم گر کی ضیافت ہم نے ٹھکرا دی شبابؔ
روٹیاں جس کی ہیں تر محنت کشوں کے خون میں

سُرورانبالوی

(راولپنڈی)

اُس کی نگاہ سے جل اُٹھا ایک دیا بُجھا ہوا
میں نے بھی لا کے رکھ دیا ایک دیا بُجھا ہوا

جھونکا تمہاری یاد کا آیا ہے جس مقام پر
میں نے وہیں جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا

میں نے وفا و مہر کا اُس کو دیا جو واسطہ
اس نے مجھے دکھا دیا ایک دیا بجھا ہوا

آپ ہی خود بتایئے وقت سے مانگتے بھی کیا
وقت کے پاس ہے بھی کیا ایک دیا بجھا ہوا

جانے نگاہِ فکر میں سج گئیں کتنی محفلیں
مجھ کو رُلا رُلا گیا ایک دیا بجھا ہوا

اُس کو خموش دیکھ کر اشک منزہ پہ آ گئے
کہتا بھی مجھ سے اور کیا ایک دیا بجھا ہوا

وصل میں اور ہجر میں صرف یہی تو فرق ہے
ایک دیا جلا ہوا، ایک دیا بجھا ہوا

اب نہ وہ آئے گا اِدھر بیٹھے ہیں پھر بھی منتظر
ایک سُرورِ بے نوا، ایک دیا بجھا ہوا

○

غالب عرفان

(کراچی)

مجھے جو لکھنا ہے اُس کی ہی پیاس باقی ہے
فسانہ ختم ہوا اقتباس باقی ہے

اٹھے ہیں ہاتھ مگر اس گمان میں بھی ہوں
مری دُعاؤں میں روحِ سپاس باقی ہے

زمانے بھر کی تو میں سیر کر چکا پھر بھی
حصارِ ذات کے کچھ آس پاس باقی ہے

میں اپنی عمر کے آخر میں یہ سوچتا ہوں ابھی
بقائے زیست کی تھوڑی سی آس باقی ہے

خود اپنے لوگوں میں واپس ہوا تو یہ دیکھا
نہ سر پہ چھت ہے نہ تن پر لباس باقی ہے

لکیر ہاتھ کی قسمت بنا نہ پائی تو کیا؟
سکونِ دل کو ستارہ شناس باقی ہے

میں عرصے بعد ملا اُس سے تو ہوا محسوس
نہ اُسکا رنگ ہے نہ اس کی باس باقی ہے

وہ شک کا فائدہ لے کر رہا ہوا لیکن
مرے شعور میں کچھ اقتباس باقی ہے

عجیب دہشتیں طاری تھیں شہر میں ہنوز
تمام چہروں پہ خوف وہراس باقی ہے

رہِ حیات میں عرفانؔ روز و شب کے لیے
کدورتوں کا دلوں سے نکاس باقی ہے

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(۲۰۱۲ء کی آخری غزل)
(دہلی، بھارت)

اپنی چاہت کے لیے ڈھونڈ شہوالہ کوئی
دہر سرا میں کہاں چاہنے والا کوئی

چھوٹ جاتے ہیں سبھی، جانتا ہے تُو، میں بھی
راز سر بستہ نہیں ، حیف نہ سمجھا کوئی

رات آتی ہے گزر جاتی ہے، جیسے تیسے
وقت کی صلیب پر ٹنگا ہے تنہا کوئی

سسکیاں لے لے کر وہ آج بھی رویا شب بھر
زہرِ ماضی، موجود میں، بوتا رہا کوئی

پُوچھ لیتے ہیں از راہِ کرم جو حال میرا
جاگ اُٹھتا ہے مجھ میں تھکا، اونگھتا کوئی

بھاگتا پھرتا رہا تُو، کوئی تو ملے جو
دہر کی دلدل سے نکالے خدارا کوئی

راتوں میں اُٹھ اُٹھ کر کرتا ہے دعائیں اکثر
مرے مولا، تیرے در کا مل جائے سہارا کوئی

اور پھر دن میں از سرِ نو زندگی تشنہؔ
ڈھونڈنے لگتی ہے جینے کا اشارہ کوئی

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

جب تک نہ ہو عمل میں یقیں کی شمولیت
بے روح، بے سُرور ہے طرزِ عبودیت

ہے رنگ و نسل سے بھی زیادہ تباہ کن
مسلک کا اختلاف، عقیدے کی عصبیت

جو اس کا ہو رہا وہ رہا اس کی بات پر
اہل رضا برتتے نہیں خود ارادیت

نقشہ سمجھ میں آ نہ سکا کائنات کا
کیا ہے، سمجھ میں آ نہ سکی اپنی ماہیت

ممکن نہیں زباں سے غمِ عشق کا بیاں
لفظوں سے کیا ادا ہو غمِ دل کی کیفیت

زندہ دلوں کو اپنی عیادت کی ہے طلب
مردہ دلوں کی کرتے نہیں لوگ تعزیت

نفرت گناہ سے ہو گناہگار سے نہ ہو
ہو جائے نہ تُو خود ہی گرفتارِ معصیت

جہلِ خرد نے لاکھ سکھائے ہنر تجھے
تعلیم کر سکی نہ مگر تیری تربیت

جنسِ ضمیر بیچ دی ہم اہلِ شرق نے
اپنا کے اہلِ مغرب کی طرزِ جمہوریت

اب اس سے اپنا حال بھی ہوتا نہیں بیاں
آیا تھا مجھ سے پوچھنے جو میری خیریت

اہلِ ادب کی اپنی جگہ حیثیت مگر
بے انکسار بنتی نہیں کوئی شخصیت

صدقہ ہے یہ کسی کا کہ نغمہ سرا ہوں میں
معلوم ہے خیالؔ مجھے اپنی حیثیت

ڈاکٹرفریادآزر
(دہلی، بھارت)

وہ ایک خواب کی صورت ہوا تھا حائلِ شب
پھر اپنے آپ سلجھتے گئے مسائلِ شب

ہم اہلِ شہر کی آنکھیں نہ دیکھ پائیں کبھی
طلوعِ صبح کی باہوں میں حسنِ زائلِ شب

اگرچہ صبح ضرورت تھی وقت کی لیکن
زمانہ غور سے سنتا رہا دلائلِ شب

کسی کے اشک کسی کو نظرنہیں آتے
کہیں کہیں بڑے اچھے لگے شمائلِ شب

قصیدے رات بھی پڑھتی ہے دن کے مصلحتاً
بیان کرتا ہے دن بھی کبھی فضائلِ شب

ہے چاند، رات کے ماتھے کا خوبرو جھومر
ستارے کیا ہیں کہ گویا کوئی حمائلِ شب

نہ جانے کیسے اجالے سے آنکھ ٹکرائی
نگاہ ہونے لگی خود بخود ہی مائلِ شب

تمام رات یوں ہی جاگتی رہیں آنکھیں
خیال آیا تھا اپنا دمِ اوائلِ شب

○

حمیدہ معین رضوی
(لندن)

چاہا تھا جس نے میرا مقدر نہیں ہوا.
جوساتھ میرے تھامرا ہمسر نہیں ہوا

دکھ کی تھیں نسبتیں میں کہاں بھولتی اسے
جذبہ مگر مرا کبھی خودسر نہیں ہوا

اخلاص میں کمی تھی بتا حسنِ بے مثال
میرا درونِ دل جو منور نہیں ہوا

دنیا کی حرص ہم نے نہیں کی خدا کا شکر
جھکتا پھرے جو در پہ مرا سر نہیں ہوا

لے کر صلیبِ درد اصولوں کی چل پڑے
بہتر نہ ہوسکا تو یہ، بد تر نہیں ہوا

افسوس میرا خواب نہ ہو پایا اسکا خواب
کوزہ میں رہ گیا وہ، سمندر نہیں ہوا

تھا اطمنانِ قلب و نظر مطمح نظر
اس واسطے کسی کا کبھی ڈر نہیں ہوا

اک دشتِ بے اماں میں بھٹکتے رہے سدا
رہبر جو خود سے بن گیا، رہبر نہیں ہوا

کرگس صفت، جو دیتا ہے دولت پہ جاں سدا
وہ شخص میری فکر کا محور نہیں ہوا

○

انوار فیروز
(راولپنڈی)

یہ زمیں مٹی کی ہے اور آسماں مٹی کا ہے
مجھ کو لگتا ہے کہ جیسے کل جہاں مٹی کا ہے

جانتا ہوں فرق ہے جو تیرے میرے درمیاں
تیرا گھر مرمر کا ہے، میرا مکاں مٹی کا ہے

روشنی کے خواب ہم نے بو دیئے ہیں ہر جگہ
کیا وہ اب تعبیر دے، یہ امتحاں مٹی کا ہے

کوئی تودہ ہی نہ یکدم گر پڑے
اب ہمیں خطرہ یہاں پر ناگہاں مٹی کا ہے

پھر تمازت میں سفر درپیش ہے صحراؤں کا
راہ میں بس ریت ہے اور کچھ نشاں مٹی کا ہے

موت کو بھولے ہوئے ہیں زر پہ انکو ناز ہے
خوف اس دنیا میں ان کو اب کہاں مٹی کا ہے

جاگتا ہوں اس لئے انوؔار ساری رات میں
بارشیں ہیں زور پر اور یہ مکاں مٹی کا ہے

○

تشنہ بریلوی
(کراچی)

میں جو یاد آؤں تو بہکے گی نظر تھوڑی سی
زُلف مغرور بھی جائے گی بکھر تھوڑی سی

دل میں فردوس اُتر آئی مگر تھوڑی سی
آج مجھ پر بھی پڑی اُن کی نظر تھوڑی سی

بادۂ وصل کی لذّت کا بھلا کیا کہنا!
ہاں مجھے اُس نے پلائی ہے مگر تھوڑی سی

خود پہ عاشق ہوئی جاتی ہے ذرا دیکھو تو
تیرے عارض کی جھلک لے کے سحر تھوڑی سی

مری رودادِ جنوں سُن کے ہنسو خوب ہنسو
میں سُناتا ہوں تمہیں بارِ دگر تھوڑی سی

پہلی ہی بار شبستاں میں ترے آیا ہوں
پھر بھی مانوس لگی راہگزر تھوڑی سی

ستمِ تازہ کا پیغام ہو شاید تشنؔہ
اُس نے جو لُطف کی ڈالی ہے نظر تھوڑی سی

○

ڈاکٹر پنہاں

(امریکہ)

رقص شرر ہی رقص شرر ہے رقص شرر سے آگے بھی
رشتۂ خاک و نور سلامت حدِ نظر سے آگے بھی

اور زمیں ہو اور فلک ہو شمس و قمر سے آگے بھی
محوِ سفر ہے وحشتِ ہستی خواب نگر سے آگے بھی

زخم ہرے سب داغ کھرے سب دیدۂ بینا جیسے ہیں
دل کے سوا ہے کون جو دیکھے فکر و نظر سے آگے بھی

جان لیا پہچان لیا اس دل نے کہ دنیا ایسی ہے
دیواروں کے پیچھے بھی اور کھلتے در سے آگے بھی

اب نیندوں میں خواب نہیں اور خوابوں میں نیند نہیں
روز و شب کے وہی جھمیلے شام و سحر سے آگے بھی

دیواروں پر خون کے دھبے اپنی زبان میں کیا کیا لکھے
کھیل یہ کیسا کھیل رہا ہے سودا سر سے آگے بھی

تازہ تر زخموں کی خوشبو رکھتی ہے شاداب ہمیں
ہم نے خود کو روشن رکھا داغِ جگر سے آگے بھی

منزل چوم کے قدموں کو خود پیچھے ہٹتی جاتی ہے
شوقِ سفر جب راہ نکالے راہ گزر سے آگے بھی

زہر دیا سقراط کو جس دنیا نے اس کو کیا کہیے
ناقدری ہی پائے گی پنہاںؔ اپنی ڈگر سے آگے بھی

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

پیار کیا ٹھہرے گا جب شکایت نہ ہو
اس طرح کی بھی ہر اِک حلاوت نہ ہو

جیسے ہم تُم ہوں باہم بہت ہی ملے
سو یہ ہم میں تو ہرگز تفاوت نہ ہو

دوستی دوستی ہی ہو اور کچھ نہیں
گویا جھوٹوں بھی تو پھر شماتت نہ ہو

جیسے بن جنگوں کے بھی تو کیا زندگی
جب کہ حق کے ہوں اور کچھ شہامت نہ ہو

جیسے بے صوتِ خوش فکر کیا حُسن دے
سو ہیں صحرا سے ہم گر ندامت نہ ہو

محتسب ہوں گے کیا وہ اگر سوچیں ہم
جن کی ہر بات میں کچھ بجُھارت نہ ہو

○

جاوید زیدی
(امریکہ)

دوستو چل نہ سکے وقت کی رفتار کے ساتھ
رابطہ کوئی نہ رکھا کسی سرکار کے ساتھ

جن مکانوں میں رہے اُن کو کبھی گھر نہ کیا
ساری ہی عمر کٹی سایۂ دیوار کے ساتھ

غمِ ہستی کا بھی اِک رنگ تھا اور اپنا تھا
نشّہ کچھ بڑھ گیا مشروبِ غمِ یار کے ساتھ

یہ بھی کیا کم تھی کسی اہلِ قلم کی اُجرت
سزا ملتی رہی ہر جرأتِ اظہار کے ساتھ

نوحۂ غربتِ دُنیا نہ سُنے گا کوئی
اہلِ دولت بنو وابستہ ہو دربار کے ساتھ

جو ملا پیار سے اس عہدِ ریا میں زیدیؔ
ہم نے تلوار بھی رکھ دی وہیں دستار کے ساتھ

○

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

داستاں اُس کی دل پذیر نہیں
غمِ دوراں کا جو اسیر نہیں

اُس کو کس نام سے کریں ہم یاد
مشکلوں میں جو دستگیر نہیں

زندگی کا وقار اُن سے ہے
زندگی میں جو بے ضمیر نہیں

وہ کہ ہم سے خفا سا رہتا ہے
پھر بھی اُس کی کوئی نظیر نہیں

کس طرح تُم اُسے مٹاؤ گے
دل ہے سرحد کی یہ لکیر نہیں

اُن کو دعویٰ ہے حق پرستی کا
جو رہِ حق کے راہ گیر نہیں

دنیا محور بدلتی رہتی ہے
زندگی ریت کی لکیر نہیں

مفلسوں سے نہ ایسے پیش آؤ
دل شکستہ ہیں یہ حقیر نہیں

عرشؔ جور و جفا کی دنیا میں
کیا وفا کا کوئی سفیر نہیں

اب تھانہ چل پڑے گا

آنند لہر
(جموں کشمیر)

شولہ پور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو اس بات کے لیے مشہور ہے کہ یہاں کی لڑکیوں کے جسم ننگے ہیں گو اُنھوں نے کپڑے پورے پہنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہاں پر کپڑے کی مل بھی ہے اور پولیس کا ہیڈ کوارٹر بھی مگر اس کے باوجود یہاں کا ہر نوجوان جرم کرتا ہے۔ چونکہ اس گاؤں میں پولیس ہیڈ کوارٹر ہے اور لڑکیوں کے بدن بھی ننگے نظر آتے ہی ہیں اس لیے تمام سیاسی و قانونی میٹنگیں بھی اسی گاؤں میں منعقد ہوتی ہیں۔

مگر ایسا کیوں ہے اس بات کو بوڑھا بتاتا ہے جس کی آنکھوں کے اندر دیکھنے کی طاقت ہے مگر دیکھ نہیں سکتا، جو ہزاروں میل کا سفر طے کر چکا ہے مگر ایک قدم بھی نہیں چل سکا۔

ایک دن اُس نے خود بخود یہ کہانی یوں سنانی شروع کی۔

''بجلی گری۔ اچھری مری''۔

سورج نے ابھی منہ نکالا ہی تھا کہ آسمان پر بادل چھا گئے۔ محسوس یہ بھی ہو رہا تھا کہ یہ آسمان کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بارے میں لوگوں کی مختلف رائیں تھیں۔ ایک نے کہا۔

''آج سورج چونکہ اپنی شادی کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے بادلوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔''

ایک بوڑھی نے تو یہ بھی کہا۔

''سورج چھپ کر اپسراؤں سے پیار کرتا ہے اس لیے بادل آئے ہیں''۔

ایک نے کہا۔

''بادل سورج کا غرور توڑنا چاہتے ہیں۔ اُسے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ جو روشنی بھیج رہا ہے وہ دھرتی پر نہیں پہنچ رہی ہے''۔

مگر اچھری کی بات دوسری ہے اُس نے کہا۔

''بھگوان پر مصیبت ہے''۔

''وہ کیسے؟''

ایک بچے نے اچھری سے پوچھا۔

''کیونکہ آسمان پر مصیبت ہے اور آسمان ہی بھگوان ہے''۔

اچھری نے کہا۔

یہ جاننے کے بعد لوگ اچھری کے گرد جمع ہو گئے اور آسمان کے متعلق جاننے لگے۔ اچھری نے یہ بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''آسمان میں سورگ ہے، دیوتاؤں کی سواری ہے اور فرشتوں کی کہانیاں ہیں یہاں تک کہ پریاں آسمان میں ہی رہتی ہیں۔''

''پریاں پیار بھی کرتی ہیں''

ایک نوجوان لڑکی نے اچھری سے پوچھا۔

''پیار کرتی ہیں مگر اُن سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا''۔

''وہ کیوں؟''

''کیونکہ پریوں کے پَر انہیں کہیں ٹھہرنے نہیں دیتے۔ وہ ہمیشہ اُن کو اُڑائے رکھتے ہیں۔ کوئی اُن سے پیار کرے تو کیسے کیونکہ اُن کا نہ کوئی گھر ہے اور نہ ٹھکانہ، آج یہاں تو کل وہاں''۔

وہ لڑکی چپ ہو گئی اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

''تم آسمان کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟''

اچھری نے جواب دیا۔

''ان پڑھ ہوں، زمین کی زبان نہیں سمجھ سکتی اور آسمان کی چونکہ کوئی زبان نہیں ہے اس لیے جانتی ہوں''

اچھری جب یہاں آئی تو تھوڑی سی جوان تھی۔ ایک درخت کے نیچے رہنے لگی۔ لوگوں نے وہاں پر گھاس پھوس و کپڑے پھینکے۔ وہ اچھری کا جھونپڑا بن گیا یعنی کہ وہ لوگوں کی تھی۔ پورے گاؤں والوں کی تھی۔ جس گھر میں روٹی بچ جاتی وہ اچھری کی ہو جاتی، جس گھر میں شادی ہوا اچھری ضرور جاتی مگر اچھری کو بُلاتا کوئی نہیں۔ کیونکہ اچھری گھر کی تھی اس لیے گھر والوں کو کوئی تھوڑا بُلاتا ہے۔ پھر بھی کوئی شادی اچھری کے بغیر مکمل نہ ہوتی کیونکہ اچھری گاتی، ناچتی، کودتی اور کبھی کبھی اُس کی آنکھوں سے آنسو آجاتے۔ اُس نے لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ اسے آنکھوں کی بیماری ہے۔ وہ لڑکی والوں کے ہاں بھی گیت گاتی اور لڑکے والوں کے ہاں ٹوکا ٹا کی بھی کرتی۔ اگر بیاہ شادی میں کوئی کم بھاجی دے تو اچھری ضرور اعتراض کرتی۔ اچھری جب سچ بولتی تو لوگوں کو کچھ دیر کے لیے بُری لگتی۔ اگر کوئی بہو ساس سے لڑتی تو کہتی۔

''نکال دو گی تو پھر کیا ہوا۔ اچھری کا جھونپڑا تو ہے''

کئی بار تو یہاں تک کہا جاتا۔

''جا! چلی جا۔ تجھے اچھری کے جھونپڑے میں بھی جگہ نہ ملے گی''۔

کوئی بچہ جب ماں باپ سے لڑتا تو اچھری کے جھونپڑے میں چُھپ جاتا۔

گاؤں میں اگر کوئی مر جائے تو اچھری ضرور روئے گی۔ پچھلے برس کرن کی ماں مر گئی۔ بیوی شہر کی تھی رونا جانتی نہ تھی۔ وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی

جلدی میں تھی کیونکہ اس کی بیوی کا فیشن ڈیزائننگ کا کورس شروع تھا مگر کرن کی خواہش تھی کہ اُس کی ماں کے مرنے پر کوئی ضرور روئے۔ اس لئے اچھری کو گاؤں سے وہاں لے جایا گیا۔ اچھری روئی۔ تب معلوم ہوا کہ کہ اس گھر میں کوئی مرا ہے۔

اُس روز اچھری خوب روئی۔ جب کوئی ہنسنے کے لیے کہے تو اچھری رو پڑتی ہے اور جب کوئی رونے کے لیے کہے تو اچھری کیسے روتی ہوگی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پھر ایک دوسرا واقعہ بھی ہوا۔ گنیش کی بہن کی شادی ہو رہی تھی تو گیت گانے والا کوئی نہ تھا کیونکہ گنیش اور رانی کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے اور اُس کی تائی جائیداد کے جھگڑے کی وجہ سے شادی میں نہ آئی تھی اس لیے اچھری نے جب گیت گائے تو سبھی کو معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں شادی ہے۔ سلسلہ چلتا رہا۔

اُس روز بادلوں نے آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ چند روز پہلے حکومت کے حکم کے مطابق ایک پولیس چوکی اُس گاؤں میں کھلی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہاں پولیس چوکی کی ضرورت تھی بلکہ اس لیے کہ گاؤں میں پولیس چوکیوں کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہر گاؤں میں پولیس چوکیاں کھولنے کا پروگرام حکومت نے بنایا تھا۔ ایک آدھ اکھڑ تجربہ کار حولدار کے ساتھ تین سپاہیوں کو وہاں بھیج دیا گیا۔ اوپر کے آفیسروں نے اُس کو ہتھ کڑیاں پہنانے کے لیے اور ڈنڈے مارنے کے لیے دیے تھے اور اس یقین کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ ضرور پولیس چوکی کا کام وہاں چلائے گا۔

حولدار کان چند ایک ظالم پولیس والا تھا۔ وہ حولدار کے نام سے اتنا مشہور تھا کہ اگر اُسے ایس پی بنایا جاتا تو لوگ اُسے حولدار کے طور پر ہی جانتے۔ مگر پچھلے دو مہینے سے کان چند بھی ناکام ہو چکا تھا۔ وہ پولیس چوکی نہ چلا سکا تھا۔ کوئی بھی گاؤں والا رپورٹ دینے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کان چند نے اپنے آفیسر سے کہا تھا کہ اگر دوسرے تھانوں سے کمایا ہوا کچھ اُسے نہ دیا گیا تو یہ تھانہ بند ہونے کا خطرہ ہے۔ گو وہ ایک پولیس چوکی تھی مگر چونکہ کان چند وہاں کا انچارج تھا اس لیے اِسے تھانہ ہی کہا جاتا تھا۔

کان چند نے گاؤں کے لوگوں کو کافی حد تک قانون سکھانے کی کوشش کی تھی اور یہاں تک کہا تھا کہ ہر واقعہ پولیس کو بتایا جائے مگر اُس گاؤں میں کوئی واقعہ ہی نہ ہوتا تھا۔ کئی لوگوں کو معلوم تھا کہ کان چند کے پاس قانون کی پانچ سو پچاس دفعات ہیں اور وہ کئی بار تنگ آ کر اُن پر کوئی بھی دفعہ لگا سکتا ہے۔ آخر کان چند نے یہاں تک کہا کہ اگر لوگ جرم نہ کریں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قانون اپنا کام نہیں کرے گا۔

اب لوگ اچھری کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔ وہ اب پولیس کے بارے میں سوچنے لگے تھے حالانکہ تھوڑی سی کوشش کرنے پر اُنہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ اچھری چند میلوں کی دوری سے آئی تھی۔ وہ بھی کبھی خوبصورت تھی، جوان تھی مگر ایک دن نمبر دار کے لڑکے کے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ نمبر دار نہیں چاہتا تھا کہ اچھری کی شادی اُس کے لڑکے سے ہو۔ مگر اُس کے لڑکے نے اچھری کو گھوڑے پر بٹھایا اور اسے دوڑانے لگا۔ گھوڑے نے دھوکا دیا اور اچھری کو گرا دیا اور خود نمبر دار کے لڑکے کو لے کر دوسرے نمبر دار کے گھر چلا گیا۔ لوگوں کے لیے اچھری مر گئی کیونکہ اچھری نے وہ گاؤں چھوڑ دیا اور اس گاؤں میں آ گئی۔ نمبر دار نے دوسرے نمبر دار کی لڑکی سے شادی کر لی اور سارا الزام گھوڑے پر لگا دیا جسے اُس دن نمبر دار نے خوب چارہ کھلایا تھا۔

اُس روز بادلوں نے آسمان کو گھیرا۔ پھر بجلی گری۔ اچھری مر گئی۔ گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوئے۔ وہ خوب روئے، بچے بھی روئے، بوڑھے بھی۔ لگا کہ گاؤں کی آتما زخمی ہو گئی ہے۔ لوگوں نے اچھری کو جلانے کے لیے کفن اور لکڑیوں کے لیے روپے اکٹھے کئے۔ ایک شخص نے کہا کہ اسے جلانے سے پہلے پولیس کو رپورٹ کرنی چاہیے۔ لوگوں نے ہاں میں سر ہلایا اور تھانے کی طرف گئے۔

کان چند خوش ہوا اور اسے لگا کہ اچھری مری نہ ہو بلکہ پیدا ہوئی ہو۔ وہ کرسی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ ایک شخص نے کہا۔

''لکھو صاحب! بجلی گری اچھری مری''۔

''اچھری مری۔ بجلی گری۔'' کان چند نے لکھا اور کہا۔

''ہمارا چائے پانی؟''

سب حیران ہو گئے۔ اُس شخص نے پھر اپنی بات دُہرائی۔

''نہیں صاحب! بجلی گری اچھری مری''۔

اس پر دوسرے سپاہی نے کہا۔

''اچھری مری بجلی گری یا بجلی گری اچھری مری مگر ہمارا چائے پانی ہر حالت میں قائم رہتا ہے''۔

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک طرف اکٹھے ہو گئے۔ ایک بوڑھے نے کہا۔

''لکڑیوں کے پیسوں میں سے چائے پانی دے دو''

''نہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے''۔

دوسرے بوڑھے نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

پہلے بوڑھے نے پوچھا۔

''کیونکہ اگر اچھری کی نعش پوری نہ جل سکی تو چڑیل بن کر گاؤں میں گھومے گی اور اس کا انجام تم سب جانتے ہی ہو''

سب گاؤں والے حیران ہو گئے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے کہا۔

''ایک ترکیب ہے''۔

باقی صفحہ۱۱۲پر ملاحظہ کیجیے

دانش ورہ

فرخندہ شمیم

(راولپنڈی)

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب لوگ مجھے دانش ور کہہ کر بُلانے لگیں گے۔شعور کی دنیا میں دانش وری کی کیا اہمیت ہے۔یہ بات مجھے ابا سے اس وقت معلوم ہوئی جب ریڈیو سے نشر ہونے والے ایک پروگرام کوسُن کر ابا جھومتے چلے جارہے تھے اور بار بار کہتے تھے۔

واللہ یہ اس دور کا سب سے بڑا دانش ور ہے۔ذرا اس کی گفتگو تو سنو۔

تب میں نے ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی اُس آواز پر اور بھی کان دَھرا لیکن میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔بس اتنا سا احساس ضرور ہوا کہ جیسے کوئی بڑا سا فرشتہ کسی بہت اونچی پہاڑی سے خطاب کر رہا تھا اور نیچے کھڑے ہوئے ابا جیسے بونے لوگ اچک اچک کر اس کی بات سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ابا کو اتنا مرعوب دیکھ کر میں چپ نہ رہ سکی۔

ابا یہ کیا کہہ رہے ہیں؛

تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا بیٹا،تم ابھی چھوٹی ہو۔ابا نے میرے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

لیکن اس لمحے دو باتیں میرے دماغ کے مقناطیس سے چپک گئی تھیں۔

دانش وری......اور......فرشتہ

میں بھی بڑی ہو کر دانش ور بنوں گی اور فرشتے کی آواز میں خطاب کروں گی میں نے دل ہی دل میں ٹھان لیا تھا۔

میں جوں جوں بڑی ہوئی علم کے میدان کی شہہ سوار ثابت ہوتی گئی ایک سال میں دو جماعتیں پاس کرنا میرا امتیاز بن گیا۔سکول سے کالج اور پھر یونیورسٹی،یوں سرپٹ بھاگی تھی جیسے حکمران رضیہ سلطانہ جس کا دماغ اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے تیز دوڑتا تھا۔ابا نہال ہوئے جاتے اور اماں سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

''آخر اس میں کوئی لچھن لڑکیوں والے بھی ہونے چاہیں یا نہیں؟ کل پرائے گھر جا کر کیا کرے گی؟ چولہا،چوکی تو ہر صورت میں کرنی پڑتی ہے لڑکیوں کو''وہ اونچی اونچی آواز میں ابا کو سناتیں۔

یہ تو عام سے کام ہیں رشیدہ۔۔۔سب ہی لڑکیاں کرتی ہیں لیکن جو کام اتنی چھوٹی عمر میں تمہاری بیٹی کر گئی وہ کتنوں نے کیا ہے۔اتنی سی عمر میں ہماری بیٹی دانش ور بن گئی ہے پتہ ہے تمہیں؟

لیکن اماں کو ان اعزازات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔وہ صرف اتنا جانتی تھیں کہ میری عمر شادی کی باﺅنڈری لائن کراس کرنے والی ہے اور ذیابطیس کا حملہ بس کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔

''اے اللہ میری زندگی میں اس کے ہاتھ پیلے کر دے''وہ زیرلب بولتی تھیں لیکن ابا نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''جب تک کوئی لڑکا میری بیٹی کے ہم پلہ نہیں آئے گا،میں اسے رخصت نہیں کروں گا''

آخر کیسا لڑکا چاہیے آپ کو؟

میری بیٹی جیسا دانش ور۔۔۔صاحبِ علم اور نامور۔۔۔میری بیٹی ایک شہرت یافتہ Social Scienctist ہے۔سماج کا پورا ڈھانچہ بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے،یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے سمجھی تم؟

مجھے ابا کے الفاظ پر فخر ہوتا۔شادی وادی میرے نزدیک زندگی کے ناگزیر چیپٹر Chapter نہیں تھے۔میں ایک بہت بڑے تحقیقی ادارے میں ماہر سماجیات کی حیثیت سے ایک اعلیٰ عہدے پر کام کر رہی تھی۔میرے دن رات تحقیقی مقالوں میں صرف ہوتے تھے۔ڈاکٹر ایچ۔ایم کے نام سے میں ایک پاور فل ماہر سماجیات تھی۔ابا ریٹائرمنٹ اور اپنی طبعی عمر دونوں پوری کر چکے تھے۔کارروانِ زیست سے علیحدہ ہوتے وقت انہوں نے میرا ہاتھ اماں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میں آج بھی اپنے بیان پر قائم ہوں رشیدہ۔تمہاری بیٹی ایک طاقتور لڑکی ہے۔اس کا خیال رکھنا''اور آنکھیں موندلی تھی۔

میں اپنی اماں کے ساتھ اپنے خریدے ہوئے فلیٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔ہماری خدمت کے لیے بھاری مشاہرہ پر ایک نوکرانی مخصوص تھی۔میں اس نوجوان شادی شدہ لڑکی کو ملازمہ کی بجائے نوکرانی کہہ کر اس لیے بلا رہی ہوں کہ وہ تھی ہی نوکرانیوں جیسی۔۔۔ملازمہ کے عہدے پر ہوتی تو سلجھی ہوئی ہوتی۔عام نوکرانیوں کی طرح وہ سارا دن باتیں کرتی رہتی،کبھی فیشن کی کبھی زیورات اور فلموں کی اور کبھی اپنے ساس سسر اور شوہر کی میرے کتب خانے میں صفائی کرنے آتی تو کتنی ہی کتابیں ریک سے ضرور گراتی۔مجھے اس کی اول جلول البتہ عادتوں سے چڑ تھی البتہ اماں کی اس سے خوب چھنتی تھی۔وہ اماں کو طرح طرح کے قصّے خوب مصالحے لگا لگا کر سناتی جو رہتی تھی۔

لیکن ایک روز تو حد ہو گئی۔

میں آفس سے آئی تو وہ دوپہر کا کھانا لگا رہی تھی۔مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''باجی کبھی آپ کا دل نہیں چاہا کہ آپ بھی کسی کے لیے کھانا لگا تیں؟'' میں سٹپٹا گئی۔

کیا مطلب؟ میں نے ترشی سے پوچھا۔

میرا مطلب ہے۔۔۔اپنے صاحب کے لیے۔۔۔اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

میرے اندر غصّے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔لیکن یہ میرا مرتبہ نہیں تھا کہ میں ایک نوکرانی سے بحث کرتی۔ آخر وہ کوئی دانش ور عورت تو نہیں تھی جس کا دماغ ہوتا میں نے کچھ نہیں کیا۔بس شام کو اُسے نوکری سے نکال دیا۔

ان دنوں ملک میں تھنک ٹینک زور وشور سے کام کر رہے تھے۔اہل دانش اور اہل فکر حالات ہی کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ سوچ بچار ناگزیر تھی۔ سیاسی قلابازیوں کی وجہ سے معیشت کو دھچکہ لگا تھا، لاقانونیت نے جرائم کو ہوا دے رکھی تھی، دہشت گردی کا چلن تھا،تعلیم اور شعور تقریباً گروی تھے اوران سب کے نتیجے میں بدمعاشی کا دور دورہ تھا۔ ایسے میں اہلِ فکر و دانش کو معاشرے کی تیزی سے بڑھتی تنزلی پر تشویش تھی، کرپشن کے موضوع پر میڈیا بے تحاشا پروگرامز کر رہا تھا۔ ہر ٹی۔وی چینل لائق، صاحب الرائے اور بلند گفتگو کرنے والے ماہرین کو ہی اپنے پروگراموں میں مدعو کرنے کا خواہش مند تھا۔ٹی۔وی پر میری مصروفیات بے انتہا بڑھ گئیں۔میری تجاویز کو دوسرے ماہرین سے کہیں زیادہ سراہا جاتا تھا۔ پروگراموں کے اینکر زاکثر میرے تعارف میں ناظرین کو بتاتے تھے کہ میں ایک نظریہ ساز ماہر سماجیات ہوں۔جس طرح ایٹمی اور کیمیاوی سائنس دان لیبارٹریز میں نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں اسی طرح میں دانش کی تجربہ گاہوں میں نت نئے نظریات پر کام کرتی ہوں جو سوسائٹی کے لیے مکمل قابلِ عمل ہیں۔۔۔میری پہچان میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا اور میں ٹیلی ویژن پر سب سے زیادہ نظر آنے والی شخصیت بن گئی تھی۔۔۔مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ ایک دن ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

''میڈم آپ ٹی۔وی پر تھوڑا میک اپ کر کے آیا کریں اور کوئی اچھا ڈائی وغیرہ استعمال کریں'' ڈپارٹمنٹ میں میری ایک جونیئر ریسرچ سکالر نے اچانک مجھ سے کہا۔

کیوں؟ میں نے بمشکل غصّہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''میڈم۔آپ کا Intellect بہت اچھا ہے لیکن اس کا Reflection شخصیت پر بھی پڑنا چاہیے''

کیوں کیا میری شخصیت ان چیزوں کے بغیر نامکمل ہے؟ میں نے تڑخ کر سوال کر ڈالا۔

نوجوان لڑکی سٹپٹا گئی لیکن گھبرائی نہیں۔اعتماد سے بولی۔

''میڈم اللہ خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ انسان کو اپنا خیال رکھنا چاہیے تاکہ وہ اللہ کے سامنے جوابدہی کے وقت سرخرو ہو''

میں نے کنکھیوں سے اس بالشت بھر کی لڑکی کو دیکھا جو خود کو بڑی دانش ور سمجھ رہی تھی۔

''ذہانت ہار سنگھار کی محتاج نہیں ہوتی بی بی'' میں نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی مگر شام کو جانے کیسے میرے پاؤں مارکیٹ میں جا پڑے اور میں نے ہیر کلر، نئے جوتے، نئی تراش کا ڈریس اور میک اپ کا کچھ سامان خرید لیا، دوسرے دن ٹی۔وی سکرین پر میں خود کو زیادہ پراعتماد محسوس کر رہی تھی۔۔۔مجھے آہستہ آہستہ لگ رہا تھا میرے اندر ایک عورت بیدار ہو رہی ہے جو دوسری عورت سے زیادہ پرکشش نظر آنا چاہتی ہے۔ مجھے اس اندازِ فکر پر شرمساری بھی ہوئی۔ ایک دانش ور کا امیج تھا میرا۔۔۔جسے ایسی عامیانہ باتوں سے واسطہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔۔۔میں نے دوبارہ خود پہ کنٹرول کرنے کی کوشش شروع کر دی اگر میں ایسا نہ کرتی تو میرے امیج اور کیریئر کو ایک بڑا خسارہ دیکھنا پڑتا۔۔۔لیکن یہ خواہش اب اکاس بیل کی طرح میرے اندر پلنے لگی تھی جسے میں ایک مقام سے کاٹتی تو دوسری جگہ سے پھوٹ پڑتی حتّٰی کہ جب ''تیسری دنیا میں سماجی برائیوں کی روک تھام'' کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کا دعوت نامہ ملا تو میں نے بہت سی آرائشی تیاریاں کر لیں۔ بہت بڑی کانفرنس تھی جس میں بلایا جانا میرے لیے ایک اعزاز تھا۔۔۔میں نے موضوع کے بارے میں پوری تیاری کی۔ براعظم ایشیا کا وہ ایک امیر ملک تھا جس نے خطے کی لائق ترین عورتوں کو کانفرنس میں بلایا تھا۔ باضابطہ تقریب سے پہلے وہ ایک غیر رسمی ہلکی پھلکی شام تھی جب میز بان ملک کا ہوسٹ مختلف ممالک کی مندوبین کا تعارف کرا رہا تھا۔ اچانک اس نے ایک نوجوان مندوب کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے مہذب مگر والہانہ انداز میں کہا۔ان سے ملیے۔مسز این۔جتنی ذہین اتنی حسین۔تمام مندوب خواتین نے انجوائے کیا لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوسکا۔جانے کیوں یہ صرف نظر آ رہی ہیں اصل میں ہیں نہیں۔میرے اندر کا لاوا پہاڑ توڑ کر باہر آ گیا۔

محفل پر سکتہ چھا گیا۔

کیا یہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟ میرے اندر کا اضطراب تھم نہیں رہا تھا۔مندوب خواتین نے خاموش سمندر کی طرح کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کیا البتہ عالمی میڈیا اگلی صبح میری دانش وری کا خوب مذاق اڑا رہا تھا۔

''زندگی''

وہ زندگی جینے کے ہرگز لائق نہیں جسے انسان نے عقل کی کسوٹی پر، پرکھا اور جانچا نہ ہو۔

(سقراط)

بیک ڈور

مہتاب عالم پرویز

(جمشید پور، بھارت)

ان دنوں میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہی ہوں......

''غلطیاں انسان سے ہوتی ہیں اور کُچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جسے خُدا معاف کر دیتا ہے۔اور جب خُدا معاف کر دیتا ہے تو بندوں سے ایسی اُمیدیں کی جاسکتی ہیں۔میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔''

''تم اپنی ان فلسفیانہ باتوں کو اپنے ہی دائرے حدود میں رکھو، ویسے جس روز میں نے اپنی حدوں کی سرحدیں پار کر لیں اُس روز تم لوگوں کے پاس کہنے کے لئے کُچھ بھی نہیں رہ جائے گا اور تمہاری آنکھیں حیران رہ جائیں گی اور تم سبھی یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاؤ گے کہ واقعی میرا گُناہ کیا ہے۔''

''اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ ابھی تم سبھی لوٹ جاؤ اور آئندہ جو بھی ہوگا میں تم لوگوں کو اپنی ساری باتیں بتاؤں گی اور تب تم لوگوں کو احساس ہوگا کہ زندگی کتنی تلخ شئے ہے۔یا کتنی حرامزادی ہے۔

اور......اُس کے بعد میرے سبھی ساتھی کالج لوٹ گئے.......

اور میں یہ سوچنے پہ مجبور ہوگئی کہ واقعی میرا قصور کیا ہے۔یہی نا کہ اُس پروفیسر نے مجھے اپنے تشدد کا نشانہ بنانا چاہا اور خود ہی اُس کا شکار ہوگیا۔

تعلیم کے نام پہ تعلیم کی جتنی سیڑھیاں آج کی بیٹیاں پھلانگ رہی تھیں اُن کے لباس اُتنے ہی تنگ ہوتے جا رہے تھے۔

اور ازابند کے پھُندنے کسی گرم سلاخ کی طرح عقل کے چولہے پر آگ برسا رہے تھے۔

لیکن میں اُن میں سے نہیں تھی۔

''برطانیہ کے ایک اسکول میں لڑکیوں کے اسکرٹ پہننے پر پابندی'' جیسی خبریں جب میری سماعت سے ٹکرائیں تو میں یہ سوچنے پہ مجبور ہوگئی کہ آج بھی دُنیا اس لئے قائم اور دائم ہے۔

لندن (ایجنسی) دی ڈیلی میل کی رپورٹ کے مطابق برطانیہ کے ایک اسکول نے لڑکیوں کو لڑکوں کے جنسی تشدد سے بچانے کے لئے اسکرٹ پہننے پر ستمبر سے پابندی عائد کر دی ہے۔ماؤلٹن اسکول اینڈ سائنس کالج نارتھم پٹنشیر نامی اس اسکول میں ۱۱ سے ۱۸ سال کی تقریباً ۱۳۰۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔اس اسکول نے پابندی کے بعد صرف ڈھیلا ڈھالا کالا ٹراؤزر پہننے کی اجازت دی ہے۔ہیڈ ماسٹر ٹریور جون نے بتایا کہ یہ اہم فیصلہ لڑکیوں کو جنسی تشدد سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔اسکول انتظامیہ نے سخت رُخ اپناتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ جو لڑکی اس فیصلے کو ماننے سے انکار کرے گی، اس کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔اسکرٹ پہننے کی سزا کے طور پر پُرانا کپڑا پہننے کے لئے دیا جائے گا۔یا اسے بدلنے کے لئے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ہیڈ ماسٹر جون نے کہا کہ لڑکیوں پر نظر رکھی جائے کہ کون سی لڑکی ہاف اسکرٹ ران یا اس کے اوپر تک پہن کر آتی ہے اور ضابطہ کی مخالفت کرنے والی لڑکی کے خلاف کاروائی کی جائے گی۔''اسکرٹ پہننے والی لڑکیوں کو اسکول اور نائٹ کلب کا فرق سمجھنا چاہیئے، ایسی لڑکیوں کے لئے اسکول سے زیادہ مناسب جگہ نائٹ کلب ہی ہے۔ہیڈ ماسٹر نے مزید کہا کہ اسکول میں چند گھنٹے پڑھنے لکھنے اور سیکھنے میں گذارنا چاہیئے، اسکرٹ پہننے سے لڑکیوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس سے وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ظاہر ہے وہ ایسی حالت میں پڑھائی لکھائی پر مطلوبہ توجہ نہیں دے سکتیں۔''

لیکن میں اس خبر کو سُن کر بے حد خوش تھی۔اور میں خوش کیوں نہ ہوتی مجھے تو ایک سبیل مل گئی تھی۔ایک راستہ مل گیا تھا ایک ایسا راستہ جس کے ذریعے میں اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی۔

میں نے جس کالج میں ایڈمیشن لیا تھا وہ شہر کے پُرسکون ماحول میں بسا ہوا تھا جہاں پڑھائی پہ خاص توجہ دی جاتی تھی اور میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں اعلی سے اعلی تعلیم حاصل کر سکوں اور ایک اچھے عہدے پہ فائز ہو جاؤں۔

میں کالج میں نئی نئی شامل ہوئی تھی اس لئے کالج کے سارے نظام اور ضابطے سے لاعلم تھی۔

اسکول سے کالج تک کے اس سفر میں میں نے جن پُر خار راہوں کا سفر طئے کیا تھا وہ راہیں وہ سڑکیں وہ شاہراہیں آج بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑے ہی حُسن اسلوبی سے گذار لیا تھا لیکن اس کالج کی سرحدیں، کالج کے اندر اور کالج کے باہر کے نظم و ضبط میں کافی نشیب و فراز تھا جیسے سب کُچھ تضاد کا شکار ہو۔

اور..........

وہ پروفیسر جسے ہر لمحہ اپنی بڑھتی عمر کا احساس ستائے رہتا تھا۔اور خود کو کلین شیو رہنا پسند تھا جس کے بالوں کی گاڑھی سیاہی اب ملگجے میں بدلنے لگی تھی۔

لیکن وہ اپنی اس NATURAL تبدیلیوں کو موقع کی نزاکت اور اپنے خواہش کے حساب سے کئی رنگوں میں رنگ دیا کرتا تھا خوشبو اور لباس اُس کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔

کالج کے شروع کے ہی دنوں میں مجھے اُس پروفیسر کے پاس جانا پڑا تھا جسے دُنیا وشال ورما کے نام سے جانتی تھی۔
کالج کے پرنسپل اُن دنوں آؤٹ آف اسٹیشن تھے میں جیسے ہی اُن کے چیمبر میں داخل ہوئی ایک لمحے کے لئے میرا سراپا وجود کسی سنگ تراش کے ہاتھوں تراشے ہوئے سنگ مرمر کے نیوڈ میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ صرف اس لئے کہ اُس کی باوقار آنکھیں میرے جسم کے نشیب و فراز پہ اس طرح رینگ رہی تھیں جیسے کسی درخت کی شاخوں پہ رینگتا ہوا سانپ اپنے شکار تک پہنچ جانے کی سعی میں مصروف ہو۔
میں گھبرا کر لوٹ جانا چاہتی تھی کہ اُس نے فارم میرے ہاتھوں سے لے لیا تھا۔ فارم پہ سائین کرتے وقت بھی اُس کی نگاہیں میرے نشیب و فراز کو ٹٹول رہی تھیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی آنکھیں میرے وجود سے چپک گئی ہوں۔
اُس کمرے میں اے۔سی ہونے کے باوجود بھی میں پسینے میں شرابور ہوتی جارہی تھی۔
ابھی میں اپنے آپ میں سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ اُس نے کہا۔ کافی ذہین معلوم ہوتی ہیں آپ، اور مجھے اپنے کالج میں ایسی ہی ذہین لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔
''سر اب میں جاؤں۔؟''
''کیوں نہیں، پر جانے سے پہلے آپ اپنا نمبر اس موبائیل میں سیو کر دیں تا کہ جب مجھے آپ کی کبھی ضرورت پڑے تو میں آپ کو کال کر سکوں۔؟'' اُس نے اپنا موبائیل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
میری ضرورت۔؟ میری کیا ضرورت پڑ سکتی ہے سر آپ کو۔؟
اب ضرورت کا کیا ہے۔؟ وہ کہتے کہتے بالکل خاموش ہو گئے تھے پر اُن کی آنکھیں بول رہی تھیں.........
میں اُن کے موبائیل میں اپنا نمبر سیو کر رہی تھی جہاں موبائیل کے ڈسپلے پہ ایک نیم عُریاں لڑکی کی تصویر آویزاں تھی۔ میں کسی طرح اپنا نمبر سیو کر کے اُن کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔
اور خود کو سنبھال لینے کی کوشش میں مصروف ہو گئی تھی کہ میرا موبائیل وبیریٹ کرنے لگا تھا ایسے میں، میں ایک دم گھبرا گئی تھی۔
وبیریٹ اس لئے کہ میں نے اپنے موبائیل کو کالج کے احاطے میں وبیریٹ موڈ میں کر دیا تھا۔
اور جب میں نے کال ریسیو کیا تو میں اور بھی حیران ہو گئی۔
''مس مونا آپ بہت خوبصورت ہیں، اور ہاں میں فون نہیں کرتا لیکن مجبوراً فون کرنا پڑا وہ یہ کہ آپ اپنا پرس اور پن یہاں جاتے وقت بھول گئی ہیں اور میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے آپ کے نمبر کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور وہ ضرورت ابھی ابھی پڑ گئی آپ آ کر اپنا پن اور پرس لے جائیں۔''
ایک لمحے کے لئے میرے گال تمتما اُٹھے تھے لیکن میں نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا ورنہ یہاں کالج کے اس ماحول میں کہانیاں اور افسانے بنتے دیر نہیں لگتی ہے اس بات کا احساس مجھے تھا اور میں کوئی کہانی بننا نہیں چاہتی تھی کوئی افسانہ بننا نہیں چاہتی تھی۔
میں نے او کے کہہ کر موبائیل آف کر دیا تھا۔
اور جب کافی دیر گئے میرے اندر وہ ہمت یکجا ہوئی تو میں وہ پرس اور پن وہاں سے لے آئی تھی۔
میں کالج برابر اٹینڈ کیا کرتی تھی۔
کالج کے شروع کے ہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ وشال ورما جس کی بڑی بڑی باوقار آنکھیں میرے جسم کے نشیب و فراز کو ٹٹولا کرتی ہیں اور صرف ٹٹولا ہی نہیں کرتیں بلکہ رینگتی بھی ہیں اور ایسے میں نہ جانے کیوں میرے اندر ایک ہلچل سی ہونے لگتی تھی اور جب میں نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا تو احساس ہوا اور سہیلیوں کی کہی ہوئی وہ باتیں بھی یاد آ گئیں کہ مونا تم واقعی اسمارٹ لگتی ہو اور تمہارے اندر ایک عجیب سی کشش ہے جو ہر کسی کو اپنی طرف کھینچنے پہ مجبور کرتی ہے۔ میں نے شرما کر اپنے شگفتہ چہرے کو اپنے ہاتھوں کے چلمن میں چھپا لیا اور اپنے ہی وجود میں سمٹتی چلی گئی۔
میں نے اسکول کے زمانے کی اُن سہیلیوں کو جو میرے سنگ اس کالج میں آئی تھیں جب یہ ساری باتیں بتائیں تو وہ کہنے لگیں۔
''وشال ورما ہیں تو کافی اسمارٹ اُن کی باوقار آنکھیں ہر لمحہ بولتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کی ان اوچھی حرکتوں سے ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص کریکٹرلس بھی ہے۔ کل کالج کی کُچھ لڑکیاں اسی پروفیسر کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں کر رہی تھیں اس میں کہاں تک سچائی تھی ان ساری باتوں سے میں بھی بالکل نہ آشنا تھی۔''
میرے ذہن میں ڈھیر سارے سوالات اور طرح طرح کے خیالات جنم لینے لگے تھے۔ وشال ورما میری خوبصورتی سے اتنا امپریس ہوئے تھے کہ میری زُلفوں کے اسیر ہو گئے تھے اور پھر مجھ سے ملنے کے نئے نئے بہانے تلاش کرنے لگے تھے۔
اور.........
شاید میں بھی اگر اُنہیں ایک پل نہ دیکھوں مجھے چین نہیں ملتا تھا نہ جانے کیوں میں اُن کی طرف کھنچتی ہی چلی جارہی تھی۔ یا پھر اُن کی کشش مجھے خود بخود اُن کے سحر میں مبتلاء کرنے لگی تھی۔
وہ برسات کا موسم تھا۔
کالج آجانے کے بعد سے ہی ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا آکاش بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ بجلیاں کوند کوند کر

ماحول کو اور بھی ڈراؤنا بنا رہی تھیں، اور ہوائیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ کالج کی زیادہ تر لڑکیاں موسم کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکی تھیں۔ میرا آخری کلاس ابھی باقی تھا اگر میرا یہ آخری کلاس نہ ہوتا تو میں بھی جا چکی ہوتی۔

ابھی میں ان ہی ساری باتوں میں گھری ہوئی تھی کہ میرے موبائیل نے وبیریٹ کیا۔ میں ایک دم چونک پڑی۔

اور جب میں نے کال ریسیو کیا تو میں ششدر رہ گئی۔

''مونا آپ وہاں کھڑی ہو کر کیا کر رہی ہیں۔؟

''بس یوں ہی بارش کی پھواروں سے کھیل رہی ہوں اور بارش کی پھواروں کو میں اپنے اندر محسوس کر رہی ہوں۔''

''میں یہاں اپنے کیبن سے باہر کے سارے منظر کو دیکھ رہا ہوں۔ میں یہ بھی اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ آپ اس وقت بالکل فری ہیں اور آپ کا آخری کلاس تقریباً ساڑھے سات بجے سے شروع ہوگا اور اس وقت سات بج رہا ہے۔ آپ آ جائیں باہر بارش ہو رہی ہے اور ایسے موسم میں آپ کے ساتھ کافی پینے کو دل کر رہا ہے۔''

''کافی پینے کا تو میرا بھی دل کر رہا ہے اور کالج کا کینٹین بھی بند ہو چُکا ہے۔ آپ کافی پی لیں سر یہاں میں اپنی ڈھیر ساری سہیلیوں میں گھری ہوئی ہوں۔''

''اتنی ساری سہیلیوں میں گھر کر بھی آپ اپنے آپ کو تنہا ہی محسوس کر رہی ہوں گی۔''

''وہ تو ہے۔''

''آپ اتنی ذہین ہو کر بھی اس طرح کی باتیں کر رہی ہیں۔؟ آپ بہانے بنا کر تو یہاں آ سکتی ہیں۔''

''روز روز میں اور کتنے بہانے بناؤں۔؟ ویسے بھی میری سہیلیاں جب بھی مجھے آپ کے سنگ باتیں کرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو آپ کے متعلق ڈھیر ساری باتیں کرتی ہیں اور میرے پاس سوائے خاموشی کے کُچھ بھی تو نہیں رہتا ہے۔''

''آپ جن ڈھیر ساری سہیلیوں کی باتیں کر رہی ہیں میں اُن تمام میں سے زیادہ تر سہیلیوں کے روم روم سے واقف ہوں۔ دراصل آپ کی ساری سہیلیاں آپ کی خوبصورتی سے جلتی ہیں آپ کی شان وشوکت سے حسد رکھتی ہیں۔ اور رہی باتیں بنانے کی تو آپ کی اُن سہیلیوں کے پاس رہ ہی کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ اب کسی پُرانے قصّے کہانیوں کی طرح آپ کے اور ہمارے ان رشتوں کو بھی اپنے اندر گُم کر کے کسی نئی کہانیوں کو جنم دیں گی اور کہانیاں تو ایسے ہی معاشرے میں جنم لیتی ہیں۔ دیکھئے آپ انکار نہ کریں ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سہیلیوں سے بہانے بنا کر اُن کے چیمبر میں داخل ہو گئی۔

چیمبر میں داخل ہوتے ہی اُنہوں نے ڈور اندر سے لوک کر دیا تھا کافی پینے کا تو ایک بہانا تھا۔

کافی پینے کے دوران میں اُس چیمبر سے باہر کے سارے مناظر کو بہ آسانی دیکھ رہی تھی۔ چیمبر کے سامنے کھلنے والی بڑی کھڑکی میں کالے اور موٹے گلاس کا استعمال کیا گیا تھا۔ اور اس گلاس کی یہ خوبی تھی کی کمرے کے اندر سے باہر کی تمام چیزوں کو بآسانی دیکھا جا سکتا تھا لیکن کمرے کے اندر کے ہونے والی ساری حرکتوں کا لوگوں کو علم نہیں ہوتا تھا۔

میں نے کافی پی کر جیسے ہی کپ ٹیبل پہ رکھا اُنہوں نے مجھے پیچھے کی طرف سے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''سر یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔؟ میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں جیسا آپ مجھے سمجھ رہے ہیں۔''

''یہ ڈائیلاگ میں اتنی بار سُن چُکا ہوں کہ یہ الفاظ اب اپنے معنی کھو چکے ہیں یا میں ان ساری باتوں کا عادی ہو گیا ہوں۔''

میں بارش کی پھوہار سے پہلے ہی بھیگی ہوئی تھی اُن کی بانہوں میں آ کر اور بھی بھیگنے لگی...... بھیگتے ہی کئی رنگ کینوس پر آئے اور آپس میں گڈ مڈ ہو گئے۔

باہر بارش زور وشور سے ہونے لگی تھی ہوائیں تیز تیز چلنے لگی تھیں اور بجلیاں کوندر ہی تھیں اور میں اُن کی بانہوں میں سماتی جا رہی تھی کہ میرے اندر کے سانپ نے پھن کاڑھ لیا تھا۔ جیسے ہی اُن کی نگاہ اُس پھن کاڑھے ہوئے سانپ پہ پڑی وہ نیچے سے اوپر تک مجھے دیکھتے ہی رہ گئے اور اُن کی آنکھیں پھیلتی ہی چلی گئیں.........

اُنہوں نے بیک ڈور کھول دیا تھا اور سانپ بیک ڈور سے رینگتا ہوا جا رہا تھا..........

اور فرنٹ ڈور کے کی ہول سے باہر کی آنکھیں پرنٹ آؤٹ لے رہی تھیں.......

۔ امن کی نوید ۔

اقوام متحدہ میں پاکستان اور بھارت کے مستقل مندوبین عبداللہ حسین ہارون اور ہردیپ پوری سنگھ کی باہمی کوششوں سے ہندوستان کے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی سالگرہ مشترکہ طور پر منائی گئی۔ دونوں طرف کے مقررین نے مہاتما گاندھی کو مشترکہ اثاثہ اور عظیم لیڈر تسلیم کرتے ہوئے اُنھیں خراج تحسین پیش کیا۔

آبگینہ

شاہین خان

(جمشید پور،بھارت)

نشرح چلو بیٹا دیر ہو رہی ہے۔کوئی چوتھی بار ماما نے پکارا تھا۔

بس دس منٹ۔نشرح کے جواب بھی چار بار پہلے والے ہی تھے۔

نشرح.........اس بار ماما کی آواز میں غصہ صاف جھلک رہا تھا۔پر پھر بھی وہ لپ اسٹک کا فائنل ٹچ دے کر ہی اتری تھی۔

سوری سوری ماما بس چلئے۔وہ جلدی جلدی معصوم سے انداز میں کانوں کو پکڑ کر بولی تھی۔پر ردیہ امتیاز کی نظریں اس کے وجود میں گڑ کر رہ گئی تھی۔آف وائیٹ شیفون کے سوٹ کی فیٹنگ کچھ ایسی تھی کہ اس کہ جسم کے نشیب وفراز پوری طرح سے عیاں ہو رہے تھے۔اس پر سے اس نے نہایت ہی باریک دوپٹے کو ایک طرف شانوں پر لٹکا لیا تھا۔براؤن گھنے خوبصورت سلکی بال بھی شانوں پر ہی کھلے تھے۔اور ڈارک میک اپ نے اسے پوری طرح سے شعلہ بنا دیا تھا۔

چلئے ماما۔ردیہ امتیاز کی نظریں محسوس کر کے وہ کچھ گڑبڑا کر بولی تھی۔اور جلدی سے پورچ کی جانب چل پڑی۔

نشرح جاؤ بیٹا کپڑے بدل کر کوئی اچھا سا جوڑا پہن لو میں ویٹ کرتی ہوں۔انہوں نے بہت سکون سے کہا تھا اور سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔نشرح کی شکل رونے والی بن گئی تھی۔نجانے ماما ایسا کیوں کرتی ہیں ہر بار ہر بار اس کی خوشیوں کو ایسے ہی میٹھی چھری سے ختم کر دیتی تھی۔وہ آنسو پونچھتی دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔اور صرف ۱۰ منٹ بعد گرین کلر کے فل سلیولیس سوٹ میں منہہ دھو کر بالوں کی سیدھی چوٹی بنا کر وہ سادے سے چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ردیہ امتیاز مسکرا دی۔نشرح نے بے حد شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔ماما کیا میری سوتیلی ماما ہے۔ہمیشہ کی طرح اس نے یہ بات سوچی تھی اور سست قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑی تھی۔

نشرح.........نیلی نے کہنی مار کر متوجہ کیا۔

کیا ہے۔وہ چڑ کر بولی۔

وہ دیکھو پرنس چارلس تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔نیلی نے باہر کھڑے ہینڈسم سے لڑکے کی طرف نظر کروائی تھی۔

تو کرنے دو میں کیا کروں۔اس کے مزاج آسمان پر تھے۔کل رات کی پارٹی اسے اچھے سے یاد تھی۔اس کی ساری کزنز ایک سے ایک ماڈرن ڈریس اور خوبصورت سے میک اپ کر کے آئی تھیں۔ان سب کے بیچ میں اسے اپنا آپ پینڈو جیسا لگ رہا تھا۔اس نے کتنی سرگوشیاں بھی سنی تھی۔نشرح کو دیکھا ہے کیسی گنوار بن کر آ گئی ہے۔اور تب سے ہی اسے شدید صدمہ تھا۔اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ماما نے تو ہمیشہ اسے ڈی گریڈ کیا تھا۔کاش میں ان کی بیٹی نہ ہوتی.................

نشی کیا ہوا ہے۔اس بار نیلی نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی تھی۔

کچھ نہیں اب چلو۔وہ منہہ بناتی گیٹ کی طرف بڑھ گئی،کیونکہ وہ جانتی تھی کالج آف ہونے کے ٹھیک دس منٹ بعد گھر اسے ہر حال میں پہنچ جانا ہے۔

نشرح پلیز ایک منٹ کیلئے بات سنو...........جیسے ہی وہ اس کے قریب سے گذری وہ دوڑ کر آیا تھا۔پر وہ اپنے وہی پرانے انداز میں پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی اور کار آگے چل پڑی،اور تشادرضا بھی ہمیشہ کی طرح صرف کار سے اڑتی دھول کو دیکھتا رہ گیا۔

ماما شادی وہ بھی صرف دو ماہ بعد آپ....................نشرح کی زبان حیرت کی زیادتی سے رک گئی تھی۔

ہاں تو کیا ہوا شادی تو ہونی ہی ہے پھر تابش تمہارا کزن ہے۔تم اسے جانتی ہو لاکھوں بار ملی ہو۔تمہیں ایسے بھی ماسٹر کرنا نہیں ہے۔تو پھر پرابلم کیا ہے۔وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھی۔اور نشرح امتیاز پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی جس نے بچپن سے اس کے وجود پر اپنی مرضی چلائی تھی اور اب کسی اور کے حوالے بھی اپنی مرضی سے ہی کر رہی تھی اور اس سے پوچھنا تک ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میں تیار نہیں ہوں۔آپ خالا امی کو منع کر دیجئے۔کچھ دیر بعد وہ بولی تھی۔

میں تمہاری رائے جاننے نہیں آئی ہوں۔ردیہ امتیاز نے کہا۔

ہاں جانتی ہوں آپ کبھی مجھے جان ہی نہیں سکتیں کیونکہ آپ میری ماں ہی نہیں ہیں۔ماں تو بیٹی کی من کی ہر بات جان لیتی ہے۔اور آپ نے شروع سے مجھے تڑپایا ہے۔ہر چیز پر پابندیاں،کہیں آنے جانے پر،سہیلیاں بنانے ،کپڑے پہننے ہر چیز ہر چیز آپ کی مرضی سے ہو اس پر ہی نہیں آپ کا بس چلتا تو میری سانسوں پر بھی پابندی لگا دیں۔میں کیسے چلتی ہوں،کن کن لوگوں سے ملتی ہوں ہر ایک چیز کی آپ کو تلاش رہتی ہے۔کیوں کرتی ہے آپ ایسا اور اب شادی بھی اپنی مرضی سے نو نیور ماما میں یہ شادی ہرگز نہیں کروں گی۔پہلی بار نشرح نے زبان کھولی تھی اور اپنے اندر کا سارا زہر ردیہ امتیاز پر ڈال دیا پر انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔بس چپ چاپ سے چلی گئی تھی۔اور نشرح بیڈ پر گر کر رونے لگی تھی۔

نشرح پلیز بات سن لو نا۔تشادرضا اس کی راہ روکے کھڑا تھا۔ایک

شاندار مرد جس کے پاس وجاہت اور دولت دونوں کی فراوانی ہے۔ وہ نشرح امتیاز پر مرتا ہے۔ یہ سوچ ہی اس کی گردن اکڑانے کے لئے کافی تھی پر ماما کی ڈر کی وجہ سے وہ آج تک اسے اگنور کر رہی تھی پر آج نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ بولی تو ایک پل کیلئے تشاد بھی ششدر رہ گیا۔

چاہتے ہو نا مجھے تو بولو کرو گے مجھ سے شادی؟ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی اور وہ جانتا تھا یہ فیصلے کی گھڑی ہے اس لئے بلا توقف بولا تھا۔ہاں۔

تو ٹھیک ہے چلو۔ نشرح بولی۔

واٹ! مطلب ابھی؟ وہ حیران ہوا۔

ہاں ابھی۔۔ وہ بولی۔

پر ابھی کیسے۔ وہ بولا۔

ابھی نہیں تو کبھی نہیں آئندہ میری راہ میں مت آنا۔ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ جب وہ سامنے آ گیا۔ نشرح یہ فیصلے جلد بازی میں نہیں ہوتے ہیں پر تم میری چاہت ہو اس لئے میں تم سے کوئی سوال کئے بنا ابھی تم سے شادی کرنے کیلئے تیار ہوں اب ٹھیک ہے۔ وہ کہہ رہا تھا اور نشرح امتیاز جس نے آج تک ہر بات اپنی ماں کی مرضی سے کی تھی آج اتنا بڑا اقدم ان کے خلاف اٹھانے کیلئے تشاد رضا کی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔

تشاد مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی تم نشرح سے شادی کرو گے اس لڑکی سے جو تمہاری طرف دیکھتی تک نہیں تھی۔ اسد حیرانی سے بول رہا تھا۔ اس وقت وہ لوگ اسد کے فلیٹ میں تھے۔ نشرح کو اندر بیٹھا کر وہ دونوں لاؤنج میں باتیں کر رہے تھے۔

پاگل ہو نشرح سے شادی کون کر رہا ہے۔ اس لڑکی میں غرور بہت تھا۔ تین سال سے اس نے لٹکایا ہوا تھا۔ اور اب ہاتھ لگی ہے تو میں چھوڑنے والا نہیں۔ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی نہیں تھی، میری طرف یعنی تشاد رضا کی طرف جس کی وجاہت اور امارت کی وجہ سے لڑکیاں اپنا دل لئے پھرتی ہے، اس پر اس کی یہ ادا تھی۔ بہت بے عزتی محسوس کروائی ہے اس نے، اور پھر نشرح امتیاز تو میرے لئے چیلنج بن گئی تھی۔ اور آج میں جیت گیا ہوں۔ آج ایسا سبق سکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھیگی.....تین سال سے سارے کالج کے سامنے میری انسلٹ کر کے رکھی تھی، میں پیچھے بھاگتا تھا اور یہ نظر اٹھا کر دیکھتی نہیں تھی، اور اب یہی ہوگا نشرح امتیاز میرے پیچھے ہوگی اور میں نظر اٹھا کر نہیں دیکھونگا۔ تشاد رضا اپنے گھناؤنے عزائم بتا رہا تھا اور دیوار پار کھڑی نشرح کانپ کر رہ گئی تھی۔ ماما کی ضد میں اس نے اتنا بڑا اقدم اٹھا لیا تھا۔ یہ دنیا گدھ اور بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے، اس لئے تو ماما میری اتنی حفاظت کرتی تھیں اور میں سمجھتی تھی وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں، اے اللہ بس ایک بار مجھے بچالے......نشرح نے اپنے آنسوں پونچھے تھے اور بھاگ کر بیڈروم میں آ گئی تھی، ڈور لاک کر کے وہ کھڑکی کی طرف بھاگی تھی، تھرڈ فلور سے کودنا خود سے مرنا ہی تھا پر عزت کے بدلے موت کا سودا براہر گز نہیں تھا۔ وہ بلا سوچے سمجھے کھڑکی پر چڑھ گئی تھی، سلائیڈنگ ونڈو تھے، پانی کے پائپ دیوار پر تھے، جیسے بھی سہی پر نشرح نیچے اتر ہی گئی تھی اور بنا رکے وہ بس بھاگتی رہی جیسے اس کے پیچھے آسیب لگا ہوا اور اسے ہر حال میں بس ماما کی پناہوں میں پہنچنا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ سارے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے گئے تھے، ملگجا سا اندھیرا پورے گھر میں تھا۔ ردیہ امتیاز نے ایک بھی لائیٹ نہیں جلائی تھی۔ پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ گیٹ کو تک رہی تھی، آج ابھی تک ان کی چڑیا گھر نہیں لوٹی تھی۔ تب ہی گیٹ کو ڈھکیل کر وہ دوڑتے قدموں سے اندر آئی تھی اور سیدھے ماما کے قدموں میں گر گئی تھی اور بے تحاشہ رونے لگی۔ ردیہ امتیاز اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی، بال بے ترتیب سے، جابجا وجود پر زخموں کے نشان وہ حال سے بے حال تھی۔ ماما آپ ٹھیک کہتی تھیں یہ دنیا بہت چالاک ہے مجھے تو کوئی سمجھ نہیں تھی بس آپکی نیکی اور آپ کی احتیاط مجھے آج بچالائی ہے۔ وہ بے تحاشہ روتے ہوئے سب کچھ بتا رہی تھی۔ ردیہ امتیاز نے ساری باتیں سکون سے سنی تھیں اور اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ اور پھر اس کے آنسوں پونچھتے ہوئے بولی تھی۔ ہاں نشرح یہی بات ہے بیٹی کی ذمہ داری معمولی نہیں ہوتی ہے، اور جسے تم روک ٹوک سمجھتی تھی وہ تمہاری بھلائی کیلئے ہی تھی، مجھے سمجھ نہیں آتا وہ کیسی مائیں ہوتی ہیں جو ماڈرن ازم کے نام پر اپنی بچیوں کو بے راہ روی کا سبق دیتی ہیں، خود سے انہیں ایسے کپڑے پہنا کر محفلوں میں لیجاتی ہیں جو ہوس پرستوں کی ہوس کو بڑھاتی ہے اور جب کوئی لڑکی کسی کا شکار بنتی ہے تو واویلا کرتی ہیں۔ عورت کے تو معنی ہی ہیں چھپانے کی چیز پھر بھلا اسے عریاں کیوں کیا جائے، اس لئے بیٹا میں نے ہمیشہ تمہاری حفاظت کی تھی۔ اور یہ تمہاری پہلی غلطی تھی شاید اس لئے خدا نے تمہیں بچالیا۔ جانتی ہو نشرح بیٹی تو آبگینہ ہوتی ہے جس میں ہلکی سی بھی دراڑ اگر پڑ جائے تو وہ بدنما لگنے لگتی ہے اس لئے تو لڑکی کے کردار میں کوئی جھول نہیں ہونا چاہئے۔ صورت کی بدصورتی قابل قبول ہے پر کردار کی نہیں۔ ان ننھی منی کلیوں کی آبیاری کھلی آنکھوں سے کرنی چاہئے تاکہ وہ مرجھائے نہیں۔ اور تم تو میرا ایک ہی نایاب آبگینہ ہو بھلا میں تم سے غفلت کیسے برت سکتی تھی۔ بس چپ ہو جاؤ جو ہونا تھا ہو چکا ہاں ایک بات اور تم کہتی تھیں نا ماما مجھے ہر جگہ پینڈو بنا کر لیجاتی ہو پر دیکھو نشرح اسی پینڈو لڑکی کو خاندان کے سب سے ہینڈسم لڑکے نے پسند کیا جانتی ہو کیوں اس لئے کے مرد جتنا بھی لبرل ہو جائے پر عورت میں اسے حیا ہمیشہ سے اپیل کرتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو تابش تمہیں نہیں بلکہ ان فیشن پرست لڑکیوں کو پسند کرتا۔ بس نشرح بہت ہو گیا۔ اور نشرح امتیاز نے آج وہ سبق ذہن نشین کر لیا جو پچھلے ۲۰ سالوں سے سمجھ نہیں پائی تھی، اسے پتا چل گیا تھا اسکی ماما اس سے کتنی محبت کرتی ہیں اور آج سے اسے بھی یہی سبق اپنی آنے والی نسلوں کو دینا تھا کہ بیٹیاں تو نازک آبگینہ ہیں۔

صدیوں کی آواز

پروفیسر انوار احمد زئی
(حیدرآباد، سندھ)

یہ آواز پہلے کبھی سنی نہ تھی، مگر اتنی نامانوس بھی نہ تھی!
لائبریری میں میرے سوا کوئی اور نہ تھا، مگر آواز ''موجود'' تھی!!
میں نے پھر غور کیا، غور سے سنا۔۔۔آواز ''موجود'' تھی!!!
اب مجھے آواز کے ساتھ اپنا ''مخاطب'' بھی ''موجود'' نظر آ رہا تھا۔
حیرت میں اضافہ ہوا۔
اس کی آواز بھی ہوتی ہے کیا۔۔۔کبھی سنی نہ تھی، کبھی سنا نہ تھا۔
پھر خیال آیا ہو سکتا ہے۔۔۔ہو بھی سکتا ہے، جب دیواروں کے کان ہو سکتے ہیں تو کتاب کی زبان بھی ہو سکتی ہے۔ کتاب زبان ہی تو ہوتی ہے۔
ہاں، مگر بے آواز زبان۔۔۔پڑھی جانے والی زبان اور سنی جانے والی زبان کا فرق مٹ گیا کیا؟۔۔۔شاید مٹ ہی گیا۔۔۔
یہ آواز۔۔۔اس فرق کو مٹا ہی تو رہی ہے۔۔۔یہ بول رہی ہے، میں سن سکتا ہوں۔۔۔میں سن رہا ہوں۔
مجھے ایک لفظ کے معنیٰ کی تلاش تھی۔۔۔میں نے لغت کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔۔اور وہ بولنے لگی۔
''تم مجھ میں لفظ کے معنی کب تک تلاش کرو گے؟ کب تک، تم اپنی پختہ علمی جہالت کی ناپختہ روایت سے کب باہر آ ؤ گے۔ تم اس حقیقت کو کب پاؤ گے کہ مجھ میں معنیٰ ڈالے کس نے ہیں؟ تم نے۔۔۔تم نے نا۔۔۔میں کورے کاغذ کی بکھری روایت ہوں، اسے تم نے، تم بولنے والوں نے، معنیٰ دے کر مجھ بکھری روایت کو سمیٹا تھا، مربوط کیا تھا، مضبوط کیا تھا۔۔۔اب کیا ہو گیا؟ تم مجھ پر اپنا تکیہ کرنے لگے، اپنے بولے پر اعتبار کھو دیا، مجھ پر اتنا تکیہ۔۔۔سوچو یہ تکیہ، اتنا تکیہ۔۔۔غالب کرتا تو کیا وہ غالب بن سکتا تھا۔۔۔فیض کا قاتل دیکھا ہے تم نے، اس نے کہا تھا۔۔۔میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو۔۔۔کیا قاتل کو دلدار مجھ میں دیکھو گے۔۔۔پھر ہمیں قتل ہو آئیں۔۔۔چلو جاناں چلو۔۔۔مجھ میں ایک بار کے مقتول کو پھر سے آمادۂ قتل کہاں پاؤ گے۔۔۔کہاں چلے آئے ہو؟''

لغت مسلسل بول رہی تھی۔۔۔اس نے پھر کہا۔۔۔''تم نے امرتا پریتم کو پڑھا ہے؟''
امرتا پریتم نے مجھے بہت سنبھالا ہے، بہت آسودہ کیا ہے۔ اس کی نظم کا ایک حصّہ سنو گے۔ سنو، پھر میرے ایک سوال کا جواب دینا۔
نظم کا ٹکڑا سنو!

میں ہور کجھ نہیں جاندی
پر اینا جاندی آں کہ وقت جو وی کرے گا،
اے جنم میرے نال ٹرے گا،
اے جسم مکدا اے، تے سب مک جاندا اے۔۔۔
پر چیتیاں دے دھاگے۔۔۔
کائناتی کناں دے ہوندے۔۔۔
میں اوہناں کناں نوں چُناں گی
دھاگیاں نوں دلاں گی۔۔۔
تے تینوں میں فیر ملاں گی۔۔۔

امرتا کو سنا۔۔۔سمجھے بھی۔۔۔اب بتاؤ اس کے مطلب ڈھونڈنے کے لیے اگر تم اِدھر آ ؤ گے تو تمہارے اُدھر کا سب مال تو رہزن لے جائیں گے نا۔ تم نہ اِدھر کے رہو گے، نہ اُدھر کے۔
مجھے تم لکھنے والے، بولنے والے، آسودہ کرتے ہو نا، مجھے نیا پن دیتے ہو۔

مجھ صدیوں کی عمر رسیدہ کو ہمہ وقت، ہمہ عہد جوان رکھتے ہو
مگر تم اب اس آسودگی سے دست کش ہوتے جا رہے ہو۔
ہوتے جا رہے ہو نا۔۔۔سو، مجھے آج بولنا پڑا، وقت کو تولنا پڑا۔
مجھے تم سن رہے ہو!! لغت خاموش ہو گئی۔

اور میں جو خاموش تھا، قوتِ گویائی سے محروم، اب قوتِ سماعت سے بھی گیا۔

''پت جھڑ کے موسم''

پروازؔ انبالوی

(انبالہ، بھارت)

پانی نہیں ہُوں، آگ نہیں ہوں تو کیا ہُوں میں
چہرہ نہیں ہُوں، جسم نہیں ہُوں خلا ہُوں میں

دروازہ ہر کسی کا جو دیتی ہے کھٹ کھٹا
پت جھڑ کے موسموں کی وہ پاگل ہوا ہُوں میں

دنیا کے سارے آئینے شب رنگ ہوگئے
جب سے خود اپنے سامنے آ کر کھڑا ہُوں میں

یوں دُور دُور رہتا ہے مجھ سے مرا نصیب
جیسے کسی فقیر کی اِک بد دُعا ہُوں میں

سایہ بھی جل بُجھا مرا اِک جسم ہی نہیں
خود سے بچھڑ کے آگ میں ایسی جلا ہُوں میں

جس دن سے اُس نے مان لیا بے وفا تھا وُہ
میرا وجود بول اُٹھا بے وفا ہُوں میں

پروازؔ کس کو ڈھونڈتے رہتے ہو رات دن
انساں نہیں ہوا ہے وُہ، یہ کہہ چکا ہوں میں

پروفیسر ڈاکٹر سید رضی محمد

(میر پور خاص)

ڈھا کر فصیلِ شرم، نگاہیں نکل پڑیں
سمجھایا غیر کو نہیں چاہیں، نکل پڑیں

دیکھے تھے آسمان کو سب منکرانِ عشق
اور آسماں سے پیار کی راہیں نکل پڑیں

چپ تھا ہرن تو گھیرے رہے اس کو بھیڑیے
بولا تو آسماں سے پناہیں نکل پڑیں

انساں کی بے بسی تو محبت میں دیکھیے
ہم روکتے ہی رہ گئے، باہیں نکل پڑیں

اک حد ہے اپنے آپ پہ بھی اختیار کی
آنسو جو ہم نے روکے تو آہیں نکل پڑیں

احساسِ قرب سے تھا کھڑا میرا قصرِ جاں
تم چھوڑ کے چلے تو کراہیں نکل پڑیں

گھر میں تھی زیست بندگلی کی طرح رضیؔ
نکلا تو میرے ساتھ ہی راہیں نکل پڑیں

ایم زیڈ کنول

(لاہور)

نامہ بر نے مجھے کیا خاموش
درد کی پھر چلی ہوا خاموش

سارے ناطے ہی پل میں ٹوٹ گئے
زندگی کا ہوا دِیا خاموش

دم بخود کائنات کو کر کے
ضبطِ غم نے کیا گِلہ خاموش

رات پچھلے پہر چلی پُروا
صبحدم ہو گئی صبا خاموش

میری آنکھوں میں آ گیا بادل
قلبِ مضطر بھی ہو گیا خاموش

○

سیفی سرونجی

(سرونج، بھارت)

انسانیت کا دم میاں بھرتے ہو کس لیے
نفرت ہر اک شخص سے کرتے ہو کس لیے

اسلاف کے تمام اصولوں کو بھول کر
نام و نسب پہ دوستو مرتے ہو کس لیے

شاید دلوں میں اب نہیں ایمان کی رمق
ہر پل تم اپنی موت سے ڈرتے ہو کس لیے

اتنا بھی دوستو گیا گذرا نہیں ہوں میں
رستے میں مجھ سے بچ کے گذرتے ہو کس لیے

خیرات میں نہیں ملا عزت کا مجھکو تاج
جل کر حسد کی آگ میں مرتے ہو کس لیے

کرتے ہو سارے فیصلے چہروں کو دیکھ کر
سچ بات منہ پہ کہنے سے ڈرتے ہو کس لیے

○

جہانگیر اشرف

(برمنگھم)

گلی گلی میں دار سجی ہے، نئے نئے ستم ایجاد ہوئے
ہم پر ہی الزام لگیں، ہم ہی تو برباد ہوئے

ہر گلی ہر کوچے میں، ہر سُو لاشیں بکھری ہیں
کسی کے ہیں وہ دل کے ٹکڑے، کسی کے لیے اعداد ہوئے

ہم نے باغ لگائے ہیں، ہر سُو پھول کھلائے ہیں
اپنی ہے یہ تیرہ بختی، کانٹے ہی ہمزاد ہوئے

ہم تو اُنکے صید ہیں ہمدم، کب تک جان بچائیں گے
جب دیر و حرم اہلِ ہنر، اپنے سب صیّاد ہوئے

شیش محل میں شاہِ دوراں لمبی تان کے سوئے ہیں
زنجیرِ عدل ہلا کر ہم، درماندہ فریاد ہوئے

گاؤں گاؤں میں، شہر شہر میں جشن منائے جاتے ہیں
قُفل کھُلے ذہنوں کے، نہ ہی ہم آزاد ہوئے

سچ کہنا اور منہ پہ کہنا جہانگیر اتنا آسان نہیں
اِسی لیے ہم مجرم ٹھہرے، اِسی لیے برباد ہوئے

○

فرزانہ جاناں

(راولپنڈی)

ہم سفر ''رہے، رہے نہ رہے''
کوئی گھر رہے، رہے نہ رہے

کچھ صبا مکالمہ تو کرے
پھر سحر رہے، رہے نہ رہے

سیپ کو تلاش کر بھی تو لو
اب گہر رہے، رہے نہ رہے

مطربہ سناؤ گیت کوئی
پھر اثر رہے، رہے نہ رہے

کشتیاں جلا ہی دیں آخر
آبِ زر رہے، رہے نہ رہے

بیٹھ جائے گا کہیں پہ ھُما
کوئی سر رہے، رہے نہ رہے

جام میرا بھر ہی دو ساقی
کل سحر رہے، رہے نہ رہے

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

رستے میں پاؤں کے چھالے پکارتے ہیں
منزل سے روشنی کے ہالے پکارتے ہیں
بازار تو ہے لیکن ہیں بند سب دُکانیں
سنسان رہ گزر ہے تالے پکارتے ہیں
مانا کہ منتظر اب کوئی نہیں ہے لیکن
مجھ کو پرانے گھر کے جالے پکارتے ہیں
سنتا ہوں سسکیوں کی آہوں کی دل صدائیں
شاید مجھے کسی کے نالے پکارتے ہیں
کشتی جلا چکا ہوں پھر کیوں سروشؔ مجھ کو
دریا کے پار بستی والے پکارتے ہیں

مراق مرزا
(ممبئی، بھارت)

اک معجزہ ہیں، فلسفۂ کُن فکاں ہیں
سوچیں تو اپنی ذات میں ہم آسمان ہیں
رشتہ نہ جنکا بن سکا شاہوں کے تاج سے
ایسے بھی اِس جہاں میں کئی شایگان ہیں
کل تھی بساطِ خاک پہ جن کی زباں کی دھوم
کیوں لوگ وہ زمانے میں اب بے زبان ہیں
ہے آزمائشوں کے سفر میں ہر اک حیات
اِس رہگزر میں روز نئے امتحان ہیں
کس پر کریں چمن کی حفاظت کا اعتبار
مشکوک عصرِ نو کے سبھی سائبان ہیں
اردو ہے دل کو جوڑنے والی زباں کا نام
ویسے تو اِس زمیں پر ہزاروں زبان ہیں
دل ماننا نہ چاہے تو وہ کچھ نہیں مراقؔ
مانو تو اُس کے ہونے کے لاکھوں نشان ہیں

شہاب صفدر
(ڈیرہ اسمٰعیل خاں)

آزاد بھی کتنا جو گرفتار نہیں ہے
ہر غم ہے ترے غم سے اگر پیار نہیں ہے
اک آگ نے دہکائے ہوئے ہیں جگرو دل
کہتے ہیں محبت کوئی آزار نہیں ہے
دے لعل کہ انگارہ عنایت پہ کرو شکر
گر عشق ہے گنجائش انکار نہیں ہے
نکتہ یہ بتایا تری دوری نے مسیحا
اچھا ہے وہی جو ترا بیمار نہیں ہے
دل اس لیے کرتا ہے زمانے سے اپیلیں
آپ اپنی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے
اٹھ جاتا ہے پودہ تو نظر آتا ہے کچھ کچھ
اوجھل سہی ایسا بھی پُر اسرار نہیں ہے
دینی ہے تو دے دو سبدِ تہمت و دشنام
اک پھول سا زخم اتنا کوئی بار نہیں ہے
ہاں قافلہ بنتے مجھے کچھ دیر لگے گی
تنہا ہوں کہ رستہ ابھی ہموار نہیں ہے
وہ بھی ہے شہابؔ اُس گُل عارض کے اثر میں
جو عارضی دنیا کا طلب گار نہیں ہے

○

عارف شفیق

(کراچی)

جب زباں کو تجربوں کا ذائقہ مل جائے گا — شاعرِ خوددار کو لہجہ نیا مل جائے گا

چاہتوں کی رہگذر میں آج بھی تنہا اداس — اک پرندہ پیڑ پر بیٹھا ہوا مل جائے گا

میں بھی پیاسا ہی کھڑا ہوں اب لبِ نہرِ فرات — میرے سینے میں بھی دشتِ کربلا مل جائے گا

تیرے دل میں بھی اگر کھِل جائیں چاہت کے گلاب — پھول کی خوشبو کو فوراً راستہ مل جائے گا

رتجگے آنکھوں میں ہیں تو خود ہی آ کر دیکھ لے — تجھ کو میرے گھر کا دروازہ کھلا مل جائے گا

پتھروں کے دیس میں تھا مجھ کو تنہائی کا غم — کیا خبر تھی راستے میں آئینہ مل جائے گا

پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے کیوں مرا نام ونسب — سوچ لیں پیغمبروں سے سلسلہ مل جائے گا

تم نے ہر اک راستے پر کیوں لگا رکھے ہیں بند — دیکھنا دریا چڑھا تو راستہ مل جائے گا

دھوپ کے صحرا میں رہتا ہے ترا عارف مگر — چاندنی راتوں میں اکثر جاگتا مل جائے گا

حفیظ انجم کریم نگری

(کریم نگر، بھارت)

میں یاد کر رہا ہوں کچھ نام تھا بھلا سا — اب یاد آ رہا ہے مجھکو ذرا ذرا سا

حیرت سے تک رہی تھیں آنکھیں مری اُسی کو — تھا نیند کا بھی جھونکا آنچل ڈھلا ڈھلا سا

اب کسکو دوش دیں ہم، کس سے کریں شکایت — ماحول ہو گیا ہے سارا ڈرا ڈرا ۔۔۔ سا!

کانوں میں ہو رہی ہیں سرگوشیاں یہ کیسی؟ — یہ کون دے رہا ہے آ کر مجھے دلاسا

اب کس پہ گیت لکھوں اب کِسکا گیت گاؤں — کوئی نہیں پیاسا، کوئی نہیں پیاسا

یہ کون روبرو ہے، یہ کون ماہ وش ہے — ہے کسلئے تنفّس میرا رُکا رُکا سا

گل سا حسین چہرہ، سونے پہ ہے سہاگا — بالوں میں ہے لگائے اِک گُل بھی خوشنما سا

دولت کی بھوک ہے یہ شعلے نگل رہی ہے — ہر شخص لگ رہا ہے مجھکو بِکا بِکا سا!!

کیا بات ہو گئی ہے کچھ تو ضرور ہوگا — انجم غزل ہے تیری لہجہ خفا خفا سا!!!

شگفتہ نازلی

(لاہور)

اَیسی بد نظمی کہ شمار نہیں — اِس لئے ہی کہیں قطار نہیں،

ڈھے گئی وہ دیوار عرصے کی — اَب کسی پہ بھی اعتبار نہیں،

بے یقینی کی دُھند پھیلی ہوئی — اَگلے پَل کا بھی اختیار نہیں،

ہر طرف ہے دُھواں مسائل کا — لمحہ بھر کو بھی تو قرار نہیں،

حادثہ کچھ بھی ہو کِسی کے ساتھ — کوئی ذی ہوش بیقرار نہیں،

کب کھلیں سُوکھی ٹہنیوں پہ پھُول — کیا کسی رُت پہ اِنحصار نہیں!

زاہدہ عابد حنا
(لاہور)

ہم رسم و رہِ شہر سے انجان بہت ہیں
سو، اپنے بھٹک جانے کے امکان بہت ہیں

سنتے ہیں کہ غیروں کو بھی ارمان بہت ہیں
اس دل پہ تو اپنوں ہی کے احسان بہت ہیں

جو زخمِ تمنا سے بھی گھبرانے لگے ہیں
ہم ان کی تمناؤں پہ حیران بہت ہیں!

جز اشک نہیں زادِ سفر دامنِ دل میں
اس راہ میں تو دشت و بیابان بہت ہیں

اندھوں میں جو کرتے رہے تقسیم ستارے
لگتا ہے کہ اب وہ بھی پشیمان بہت ہیں

اس قحطِ جنوں پیشہ زمانے میں نہ پوچھو!
کیا شہر کہ اب دشت بھی ویران بہت ہیں

کہتی ہے یہ آندھی کہ مخالف جو چلو گے
ہے فائدہ گر ایک تو نقصان بہت ہیں

ہم لوگ حنا اب بھی اسیرانِ دُعا ہیں
باتوں سے بہل جائیں گے نادان بہت ہیں

ایم جاوید اقبال
(راولپنڈی)

پیڑ سے ٹُوٹ کے سُوکھے ہوئے پتّے کی طرح
دوش پر کوئی ہَوا کے مَیں سہارا ڈُھونڈوں

وصل میں جو بھی مچلتا رہا دل میں میرے
مَیں جُدائی میں وہ ٹُو ٹا ہُوا تارا ڈُھونڈوں

ایک نایاب سے گوہر کے لیے ڈُوبوں مَیں
عجب انسان ہُوں دریا نہ کنارہ ڈُھونڈوں

چند لمحوں کی ملاقات نے دِیوانہ کِیا
ایسے لمحات کو گلیوں میں دوبارہ ڈُھونڈوں

بعد تیرے مَیں بھلا جی کے کروں کیا جاوید
اپنے ہی ٹُوٹنے کا مَیں تو نظّارہ ڈُھونڈوں

سمیع نوید
(میانوالی)

کسی کا نام کہیں یوں ہی لکھ دیا ہو گا
یہ پیار ہم نے بھی شاید کبھی کیا ہو گا

تمہارے سامنے میں تو خموش بیٹھا ہوں
تمہارا نام کسی اور نے لیا ہو گا

ہمارے بعد کئی ہم سے اور بھی ہوں گے
وفا سے دیس تو خالی نہیں ہوا ہو گا

یہ تم جو مجھ سے یہاں چھپ کے ملنے آتے ہو
کسی نے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہو گا

تو مجھ کو یہ نہ بتا تو بدل بھی سکتا ہے
تجھے پتا ہے تو پھر مجھ کو بھی پتا ہو گا

جنوں میں عمر ذرا تیز ہی گذرتی ہے
سو دیکھنے میں وہ تم سے بہت بڑا ہو گا

خفا ہوں اس سے بہت میں تو کوئی بات نہیں
یہ مسئلہ ہے کہ وہ مجھ سے بھی خفا ہو گا

وہ خود کو حسن سے بہتر خیال کرتا ہے
نوید تم نے ہی ایسا اسے کہا ہو گا

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط.....۱۴

مستقبل کے خواب

کالج میں میرے ساتھ رشید، ریاض الدین اور سعید داخل ہوئے تھے۔ میں اور رشید پری میڈیکل اور ریاض اور سعید پری انجینئرنگ میں تھے۔ سعید میر پور خاص کے جانوروں کے ڈاکٹر کا بیٹا تھا۔ یہ پورے ضلع کے سب سے بڑے ڈاکٹر تھے اور انکا بنگلہ بڑا تھا جس کے احاطے میں کئی قسم کے جانور تھے۔ اس سے میری دوستی آٹھویں جماعت سے تھی۔ سعید گھوڑسواری بہت اچھی کرتا تھا اور اسنے ایک ضلعی مقابلے میں گھڑسواری میں اول انعام بھی لیا تھا۔ ہم شام کو عموماً ساتھ ہی وقت گذارا کرتے تھے۔ کبھی فروٹ فارم کی تفریح کو نکل جاتے تھے کبھی گھنٹوں ریلوے پلیٹ فارم پر پڑی بنچوں پر بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ زیادہ تر موضوع ہمارے مستقبل کے خواب اور خدشات ہوتے تھے۔ ایک ایسی اندرونی آگ، بے چینی اور بے کلی تھی کہ کب یہ ماہ وسال ختم ہونگے، کب ہم ''پریکٹکل لائف'' شروع کرینگے۔ ہم اس معاملے میں انتہائی سنجیدہ تھے اور ہمارا مصمم ارادہ تھا کہ ہم ترقی کی اس دوڑ میں ضرور کامیاب ہونگے۔ مگر ہمیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ ہمارا پس منظر، میر پور خاص کا عمومی تعلیمی ماحول اور پروفیشنل کالج کے اخراجات شاید ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ یہ خیال آتے ہی ایک خوفناک تھرتھری سی طاری ہو جاتی تھی۔ ان دو سالوں میں جتنا ہم نے اپنے مستقبل کے بارے میں بحث مباحثہ کیا ہے اور پروفیشنل کالج میں داخلے میں ناکامی کی صورت میں متبادل راستوں کو کھنگالا ہے اسکو سوچ کر اب بھی دل کی دھڑکن بے قائدہ ہو جاتی ہے کہ اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو ہم کیا کرتے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم چاروں دوست اپنے ارادوں میں کامیاب ہوئے۔ رشید میرے ساتھ ڈاکٹر بنا، اور ریاض اور سعید انجینئر بن کر پاکستان میں نہایت اعلیٰ عہدوں سے ریٹائر ہوئے۔

نجمہ شیخ۔۔ایک بار پھر

کالج شروع ہونے کے کچھ ماہ بعد موسم سرما میں کالج کے سالانہ مباحثے کے مقابلے ہونے تھے۔ میرے علاوہ اسلم اعوان، ریلوے کا ایک اور لڑکا اظہر سلیم، چندر نوتانی اور چند دوسرے لڑکے اس میں شریک ہو رہے تھے یہ صرف ہمارے کالج کے بین الجماعتی مقابلے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کالج کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک لڑکی بھی ان مقابلوں میں شامل ہو رہی ہے۔۔ یہ کون ہو سکتی تھی سوائے نجمہ شیخ کے!!۔ اس وقت تک ہمارے درمیان تعلیمی مقابلہ عروج پر تھا اور اسکی وجہ سے مجھے لگتا تھا کہ ہمارے درمیان کچھ کشیدگی ہے۔ وہ اس مقابلے کو سنجیدہ لے رہی تھی اور کبھی کبھی اپنی ہار پر جھنجلاہٹ کا اظہار کرتی تھی۔ دیکھتی تو اب بھی وہ میری جانب تھی مگر اب ان آنکھوں میں تجسس سے زیادہ کچھ ناراضگی ہوتی تھی۔ آپس میں ملنے جلنے یا کھل کر باتیں کرنے کا تو رواج ہی نہیں تھا۔

ادھر ہمارے کالج میں ایک دستور چلا آ رہا تھا کہ نئی آنے والی کلاس کے لڑکے اپنی کلاس فیلو لڑکیوں اور اساتذہ کو شرارت میں نام دیا کرتے تھے۔ یہ نام ایک نوٹس کی شکل میں کالج کے نوٹس بورڈ کے ساتھ اور لڑکیوں کے کامن روم کی دیوار پر رات کو چپکا دیئے جاتے تھے۔ کالج کی انتظامیہ کو یہ سب معلوم تھا مگر وہ اس سے درگذر کرتی تھی۔ ہماری کلاس کے کچھ لڑکوں نے، میں ان میں ایک مشیر کی طرح شامل تھا مگر اس کا رنگ لیڈر نہیں تھا، نے بھی یہی حرکت کی۔ ایک لڑکی جو یوں تو بہت پختہ رنگ کی تھی مگر تھی خوش مزاج، پرکشش اور ہمیشہ مسکراتی تھی اسے خطاب دیا گیا تھا ''کالا گلاب''، نقاب پوش قاتل کا تو تذکرہ کر ہی چکا ہوں۔ نجمہ شیخ کو اپنی شخصیت کی وجہ سے ''چراغ محفل'' کا خطاب دیا گیا تھا یہ تھا بھی صحیح کیونکہ وہ کلاس کی رونق تھی۔ پھر اسی دن اردو کی کلاس میں میں نے اٹھ کر ایک شعر جس میں کسی کی تعریف کے لئے چراغ محفل کی اصطلاح استعمال کی گئی تھی سنایا اور بہت معصومیت سے پروفیسر مسعود صاحب سے اسکی وضاحت کرنے کو کہا۔ نجمہ تو اپنی جگہ جل بھن گئی۔ ان حرکتوں سے وہ مجھ سے بہت جلی ہوئی تھی۔ ہماری کلاس کی ایک لڑکی سعید کی بڑی بہن کی دوست تھی اس نے بتایا کہ لڑکیاں بہت ناراض ہیں اور سمجھتی ہیں کہ فیروز عالم ان حرکتوں کا ذمہ دار ہے اور رنگ لیڈر ہے۔ میں تو ویسے ہی لڑکیوں سے ڈائرکٹ بات کرنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا یہ بہت اچھا موقعہ ہے کہ اس موضوع پر بات کر کے صلح صفائی کی جائے۔ ایک دن کلاس ختم ہونے پر رشید نے لڑکیوں کے پاس جا کر بات شروع کی اور یہ دیکھ کر کہ لڑکیاں بات کرنے پر تیار ہیں چند ہی سیکنڈ بعد میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ رشید نے یہ ذمہ داری میری محبت میں اس لئے اٹھائی تھی کہ اگر لڑکیاں ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیں یا شور مچائیں تو میں بہر حال محفوظ رہوں گا۔ اگر وہ بات چیت کرنے پر تیار ہوں تو میں بھی شریک ہو جاؤنگا۔ بہر حال کچھ گلے شکوے ہوئے۔ مگر نجمہ شیخ کو مجھ سے شکایت ہی رہی کہ میں ہر معاملے میں اسکی کاٹ کرتا ہوں اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ان معاملات کے پس منظر میں جبکہ ہمارے درمیان ایک سرد جنگ جاری تھی یہ مباحثے منعقد ہوئے۔

خوشگوار تبدیلی

یہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہیگی۔ موسم سرما کی ایک کہرآلود شام

تھی۔کالج کے ہال میں لڑکے اور لڑکیاں، شہر کے عمائدین، تمام پروفیسر اور کچھ طلبہ کے والدین بھی موجود تھے۔ایک عجب جادوئی ماحول تھا۔میں نے ہلکی سرمئی رنگ کی پتلون پہنی تھی۔اپنی منہ بولی بھابی کا بُنا سفید اور فاختئی رنگ کی آمیزش کا سوئٹر پہنا تھا اور سفید قمیض پر سیاہ بند کیوں والی ٹائی لگائی تھی۔اسٹیج پر صدرِ محفل کے علاوہ سارے مقررین کی کرسیاں تھیں، خوش قسمتی سے میری کرسی نجمہ کے بالکل برابر تھی۔تقریریں شروع ہوئیں میں موضوع کی مخالفت میں بول رہا تھا۔گرماگرم تقاریر تھیں اور مقابلہ سخت تھا۔کالج کی سینئر کلاسوں کے لڑکے چھائے ہوئے تھے اور انکی حمایت بھی خوب خوب تھی۔مگر جب انعامات کا اعلان ہوا تو مجھے پہلا انعام ملا۔نجمہ بھی بہت اچھا بولی۔وہ اپنے اسکول میں کئی انعامات جیت چکی تھی لیکن اس کو کوئی انعام نہیں ملا تھا۔مگر مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ اس نے میرا نام پکارے جانے پر نہ صرف پرجوش تالیاں بجائیں بلکہ اس نے جھک کر مجھے بہت اپنائیت سے اور مسکرا کر مبارکباد بھی دی۔نہ صرف یہ بلکہ جب مجھے بار بار اسپیشل انعامات کے لئے بلایا جاتا تھا، اور کچھ مزید کپ دئے جاتے تھے تو میں اپنے کپ اسے پکڑا دیتا تھا اور وہ انہیں مسکرا مسکرا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔تقریب ختم ہونے پر رخصت ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مجھے مبارکباد دی۔میں ایک سرور کی کیفیت میں گھر آیا اور اس رات سونے سے پہلے مجھے پہلی دفعہ زندگی میں ایک ایسی مسرت کا احساس ہوا جسکا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اک اجنبی احساس کی خوشبو

بس اس دن کے بعد ایسا لگا کہ نجمہ کا خیال مجھ میں اس طرح پیوست ہو گیا ہے کہ چاہوں بھی تو اسکو ذہن سے جھٹک نہیں سکتا۔رات کو سونے سے پہلے صبح کا انتظار صرف اس لئے ہوتا تھا کہ ایک نئی صبح کے ساتھ پھر نجمہ کو دیکھنے کا موقعہ ملے گا، اسکی آواز سنوں گا اور اس کو اپنی جانب دیکھتا ہوا پاؤں گا۔پھر بھی میں خود سے جھگڑ رہا تھا اور مجھے اپنے جذبات اور خیالات پر بڑی حد تک قابو تھا۔پھر میں جس عمر میں تھا، اور میں جس قدر اپنی پڑھائی میں سنجیدہ تھا اور اپنے مستقبل کے معاملے میں فکرمند تھا اس کو دیکھتے ہوئے میں کسی قسم کے فلمی رومان میں الجھنے کے لئے تیار نہ تھا۔ادھر میری جیسی تربیت ہوئی تھی اس میں بھی یہی سکھایا گیا تھا کہ اس قسم کی حرکتیں صرف آوارہ لڑکے کرتے ہیں اور میرا کنبہ ان تمام چیزوں سے بہت بلند ہے۔مگر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ اس نے کم از کم یک طرفہ طور پر مجھے نجمہ کی ایسی محبت میں گرفتار کر دیا جس کے لئے شیفتہ نے کہا ہے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ایک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

میں جنوری ۱۹۶۲ء میں بیمار پڑ گیا۔بخار تھا کہ ٹوٹنے پر نہیں آتا تھا، شاید ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا اس لئے میں دس دن کالج نہ جا سکا۔میری اس زمانے میں رشید غوری اور ریاض سے گہری دوستی تھی۔یہاں تھوڑا سا جاری موضوع بدل کر کچھ اسکا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔رشید اور ریاض نے بھی میٹرک فرسٹ ڈویژن میں کیا تھا۔مگر اس کے بعد رشید سانگھڑ چلا گیا تھا اور نہ اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا نہ ہی وہ کالج کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔اس پر ہمیں تشویش ہوئی۔ہم دونوں اس سے ملنے سانگھڑ گئے تو معلوم ہوا کہ اس کے کنبے کے مالی حالات ایسے نہیں کہ وہ ہاسٹل میں رہ کر اپنا خرچہ برداشت کرے اس لئے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ پڑھائی چھوڑ دے گا۔میں اور ریاض خود بمشکل سولہ سال کے تھے مگر ہمارے دل پر ایک چوٹ لگی انہیں معلوم تھا کہ رشید ایک بیحد ذہین لڑکا ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اسکو برباد ہونے سے بچائیں ہم نے وہیں اپنے گھر والوں سے پوچھے بغیر یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم رشید کو ساتھ لیکر آئینگے اور وہ ریاض کے یہاں رہیگا اور کھانا میرے یہاں کھائیگا۔جب ہم اسکو لیکر آئے تو ہمارے گھر والوں نے ہمارے اس فیصلے کو بہت سراہا۔حالانکہ ریاض کا گھر بہت چھوٹا تھا اور اسکے پہلے ہی پانچ بھائی تھے مگر وہیں اسکا بھی ایک کھٹولہ ڈال دیا گیا۔اسی طرح ہمارے اپنے حالات بھی اچھے نہ تھے مگر میری امّاں نے کہا جہاں اللہ نے ہمارا رزق اتارا ہے وہیں دو روٹیاں اسکی بھی فراہم کریگا۔

ہم تینوں دن کا زیادہ وقت ساتھ گذارتے تھے اور ریاض کے گھر کے پیچھے لگے درخت کے نیچے رات دیر گئے تک باتیں کرتے تھے، وہی باتیں کہ ہم کب اس طرز زندگی کو بدل کر غربت کے بھنور سے نکلیں گے۔ایک رات جب میں صحت یاب ہو چکا تھا اور دوسری صبح مجھے کالج جانا تھا ہم ریاض کے صحن میں کھٹولوں پر لیٹے ہوئے تھے اور میرپورخاص کی خوبصورت اور خنک رات سے لطف اندوز ہو رہے تھے، میرپورخاص کا آسمان رات کے وقت تاروں سے اس طرح بھر جاتا تھا جیسے کسی حسینہ کے خوبصورت سیاہ دوپٹے پر روپہلی کامدانی کا کام۔میں خاموشی سے آسمان کو تک رہا تھا کہ رشید نے کہا فیروز میں نے اور ریاض نے ایک بات نوٹ کی ہے کیا تمہیں بتا دیں۔مجھے کچھ تشویش و تجسس ہوا۔میرے پوچھنے پر ان دونوں نے کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ نجمہ کو تم سے محبت ہو گئی ہے۔مجھے تو ایک جھٹکا لگا۔اس پر انہوں نے مجھے بتایا کہ میری غیر حاضری میں کس کس طرح اس کی آنکھوں نے مجھے تلاش کیا ہے اور وہ کلاس میں کیسی بجھ سی گئی ہے۔اب وہ کسی سوال کا جواب دینے کی بھی کوشش نہیں کرتی اور بس چپ رہتی ہے۔ہر صبح شاید وہ یہ امید لیکر آتی ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ نظر آؤ گے مگر تمہیں نہ دیکھ کر وہ ہمیں عجیب نظروں سے دیکھتی ہے، جیسے سوال کر رہی ہو مگر پھر اس میں ہمت نہیں ہوتی۔پھر لیکچررز کے پوچھنے پر کہ تم کیوں نہیں آئے یا اب تک بیمار ہو وہ ہماری طرف دیکھتی ہے۔اب تم دیکھنا کل سے اسکا وہی چونچال پن واپس آ جائیگا۔ہم ہی نے نہیں کلاس کے تمام لڑکوں اور ٹیچرز نے بھی اسے محسوس کیا ہے۔

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں اس وقت صرف سولہ سال کا تھا، قدرتی عوامل کے تقاضے اپنے عروج پر تھے۔جنس مخالف سے کسی قسم کے رابطے کا

پہلا پہلا تجربہ تھا، ایسی حالت میں رشید اور ریاض کا یہ بیان تو جلتی پر تیل کا کام کر
گیا۔ میں تو ویسے ہی اسکے متعلق سوچا کرتا تھا مگر خود پر کنٹرول کیے ہوئے تھا۔ ان
الفاظ نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ میں مکمل طور پر اس بہاؤ میں بہہ گیا اور اسکے سحر میں
گرفتار ہو گیا اور میرا ذہن جاگتے وقت کے ہر لمحے صرف اور صرف اسکے خیال
میں محو ہو گیا۔ اٹھتے بیٹھتے صرف اسکا خیال آتا تھا۔ ایک بیقراری تھی، دل چاہتا تھا
کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کروں، اب دوستوں کے ساتھ فروٹ فارم
یا دوسرے باغات کی سیر میں دل نہیں لگتا تھا بس یہی خیال رہتا تھا کہ وہ میرے
ساتھ کیوں نہیں ہے، ان دوستوں کے بجائے اُسے میرے ساتھ ہو نا
چاہئے۔۔ مگر میر پو خاص کے ماحول میں اور میری اپنی اخلاقی قدروں اور
پابندیوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں آج بھی اس دور کو سوچتا ہوں تو خیال آتا
ہے کہ میں کیسا اس سحر میں جکڑا ہوا تھا کہ لگتا تھا جیسے مجھ پر کسی جن یا آسیب کا سایا
ہو گیا ہو۔ یہ سب صرف سوچیں یا پاگل خواہشیں تھیں ورنہ حقیقت میں کچھ بھی نہیں
بدلہ تھا مجھے تو اب بھی اس سے دو باتیں کرنے کا نہ تو موقعہ ملتا تھا نہ ہی مجھ میں اسکی
ہمت تھی۔ ان دنوں حسرت موہانی کا یہ شعر بار بار میرے ذہن میں گھوم تا تھا

وہ تو ملتا پر اے دلِ کم ظرف
تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

فرسٹ ائر سائنس کا باقی دور اسی کشمکش میں گذرا، اسکے خیال نے
میری پڑھائی پر بھی خراب اثر ڈالا تھا، وہ اب بھی میرے مقابلے پر ڈٹی
تھی۔ اگلے چند مہینوں میں اس نے دو دفعہ مجھے کیمسٹری میں ایک دفعہ زولوجی اور
ایک دفعہ بوٹنی میں شکست دی۔ لوگ اب بھی ہمارے مقابلے کو دلچسپی کی نگاہ سے
دیکھتے تھے۔ وہ مجھے دیکھتی تو اب بھی توجہ اور ایسی نظروں سے تھی جو لگتا تھا کہ
صرف میرے اور میرے لئے ہیں مگر میں انکا مفہوم نہیں سمجھتا تھا اور اس سے کسی
قسم کی قربت یا براہ راست گفتگو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ادھران چند ماہانہ
امتحانات میں شکست کھانے کے بعد مجھے بھی کچھ ہوش آ گیا تھا اور مجھے اس بات
کی فکر لگ گئی تھی کہ اگر میں نے خود کو نہیں سنبھالا تو انٹر سائنس میں ایسے نمبر نہیں آ
ئینگے کہ میں وظیفے پر میڈیکل کالج میں داخل ہو سکوں۔

یہی سوچتے ہوئے میں نے خود پر قابو پایا اور ذہن کو جھٹک کر دوبارہ
پڑھائی کی طرف توجہ دی۔ دل اب بھی مسوستا تھا، جاگتی آنکھیں اب بھی خواب
دیکھتی تھیں مگر ذہن میرے قابو میں تھا۔ میں نے باقی مہینے بیحد محنت کی اور فرسٹ
ائیر سائنس کا امتحان دیا۔ امتحان کا نتیجہ آیا، میرے بہت اچھے نمبر تھے مگر ایک بار
پھر مجھے اس تجسس نے پریشان کیا کہ کلاس میں کون اول آیا ہے، کیا نجمہ؟؟ کالج
کھلنے پر تو یہ معلوم ہو ہی جاتا مگر کالج کو تو چھ ہفتے بعد کھلنا تھا اور میری بیقراری اپنے
عروج پر تھی۔ ایسے میں میرے دونوں دوستوں ریاض اور رشید نے پھر
میر پور خاص جیسے چھوٹے شہر کو دیکھتے ہوئے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے
کہا ہم نجمہ کے گھر جا کر اس سے خود پوچھ کر آ ئینگے کہ اس کے کتنے نمبر آئے
ہیں۔ یہ سراسر احمقانہ اور خطرے سے بھر پور قدم تھا۔ اس دور کے میر پور خاص
میں کسی جوان اور غیر لڑکی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس سے بات کرنے کا مطالبہ
کرنا قتل کرنے اور قتل ہو جانے کے برابر تھا۔ پھر نجمہ کا کنبہ تو سندھی تھا جو اپنی
ناموس پر کٹ مرنے پر تیار رہتے ہیں۔ نجمہ کا ایک پرانی حویلی نما گھر، جسکا
دروازہ بالکل قلعہ کی طرح تھا شاہی بازار کے پیچھے ایک کھلے تکون نما میدان کے
سامنے تھا کوئی رات کو آٹھ بجے رشید اور ریاض نے اسکا دروازہ کھٹکٹایا، دروازہ
کھلنے پر ملازمہ سے کہا ہم اسکے کالج سے آئے ہیں اور اس سے بات کرنی ہے۔
نجمہ دروازے پر آئی تو انہوں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے فرسٹ ائر میں کتنے
نمبر ہیں اس کے بتانے پر انہوں نے خوش ہو کر اس سے کہا فیروز کے نمبر تم سے
زیادہ ہیں۔ اس نے منمنا کر کہا ہاں مجھے اس کا اندازہ ہے۔ انہوں نے گھر آ کر
مجھے مبارکباد دی۔ میں جیت گیا تھا مگر مجھے نہ جانے کیوں اس جیت کی خوشی نہیں
ہوئی مجھے احساس ہوا کہ کاش میں ہار جاتا۔

دوسرا سال

میں نے کالج کا دوسرا سال یعنی انٹر سائنس جولائی ۱۹۶۲ میں
شروع کیا۔ میرا حوصلہ بہت بلند تھا میں نہ صرف پوری کلاس میں اول تھا بلکہ
میرے نمبر پورے سندھ (حیدرآباد بورڈ) میں سب سے زیادہ تھے اسی حوالے
سے کلاس میں مجھے ''ایک'' رول نمبر دیا گیا تھا۔ جن طلبہ کو پروفیشنل کالج میں
داخلہ ملتا تھا ان کے لئے کالج کا یہ آخری سال تھا۔ میری کارکردگی کلاس میں
بہت اچھی تھی اور اب بھی نجمہ سے یوں تو کبھی کبھار جھڑپیں ہو جاتی تھیں مگر اب
وہ مجھ سے بہت پیچھے رہ گئی تھی پھر بھی وہ کلاس میں دوسرے نمبر پر تھی اور اس میں
کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ میڈیکل کالج کے داخلے میں یقیناً کامیاب ہو جائیگی۔
میں اب بھی یہ خواب دیکھتا تھا کہ اگر وہ اور میں میڈیکل کالج میں ساتھ داخل ہو
ئے تو ہمارے پاس مزید پانچ سال ہونگے اور میڈیکل کالج کا ماحول شاہ لطیف
کالج سے مختلف ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ہماری دوستی ہو جائے اور مستقبل ایک
نئی کروٹ بدل لے۔ کیا پتہ یہ دوستی تمام زندگی کا ساتھ بن جائے۔

میں حسب دستور تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ غیر نصابی میدان میں
بھی فعال تھا مجھے بزم ادب کا سکریٹری بنایا گیا اور اس سال جب ہمارے کالج
میں کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثہ ہوا تو میں اس میں قائد ایوان تھا۔ اس کے
علاوہ میں نے ''دیواری مجلّہ'' بھی جاری کیا۔

دیواری مجلّہ ''فانوس''

ہمارے کالج میں انگریزی کے شعبہ میں ایک نئے لیکچرر کراچی
یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے۔ انکا نام بوگھیو تھا۔ یہ سندھی تھے مگر
ایک تو بیحد ہینڈسم تھے پھر نہایت اچھے تراش خراش کے کپڑے پہنتے تھے۔ پھر
بہت ہی اسٹائلسٹ تھے اور انگریزی اس قدر خوبصورت لہجے میں بولتے تھے کہ
لگتا تھا ابھی ابھی آکسفورڈ سے آئے ہیں۔ لڑکیاں تو لڑکیاں (خاص طور سے بی

اے کی لڑکیاں) لڑکے بھی ان پر فدا تھے۔انہوں نے انگریزی میں ''دیواری مجلّہ'' جاری کیا۔ہم نے اسکا نام بھی نہیں سنا تھا۔دراصل یہ ایک سیاہ مخملیں گتے کے چاروں طرف لکڑی کا ایک خوبصورت مقفل فریم تھا جس میں شفاف شیشہ جڑا تھا۔اس میں ہر ہفتے طلبہ کی انگریزی نگارشات چسپاں کی جاتی تھیں۔یہ فوری طور پر نہایت ہردلعزیز ہوگیا اور اسکی دھوم مچ گئی۔اس پر میں نے اردو کے پروفیسر مسعود صاحب سے کہا کہ ہم بھی اردو میں ایسا ہی دیواری مجلّہ شروع کریں۔انہوں نے کہا انگریزی میں تو ٹائپ کرنا آسان ہے، یہ ہر ہفتے ایسا کر سکتے ہیں اردو میں ہم کیا کرینگے۔میں نے ضد کی کہ میں اپنے ہاتھ سے طلبہ کے مضامین سیاہ روشنائی سے کتابت کر کے اس میں چسپاں کرونگا۔انہوں نے کہا تمہارا آخری سال ہے اس سے تمہارا بہت وقت ضائع ہوگا مگر میں نے اسکا بیڑا اٹھالیا۔اورانہیں راضی کرلیا۔

میں نے اس مجلّہ کا نام ''فانوس'' رکھا اور اسکے ٹائٹل پر فانوس کی تصویر کے ساتھ یہ شعر لکھا

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

پہلی ہی اشاعت کے لئے کئی مضامین آئے۔ہم نے پہلا شمارہ دیوار پر آویزاں کیا۔کئی رات دیر گئے بیٹھ کر میں نے تمام مضامین، نظمیں، مختصر کہانیاں، ادب عالیہ سے اقتباسات خوش خطی کے ساتھ سیاہ روشنائی سے لکھے تھے۔ پہلے ہی شمارے سے کالج میں ایسی دھوم مچی کہ ہم نے چند ہفتوں میں انگریزی دیواری مجلّے کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا۔حالانکہ شاید نجمہ کا بھائی یا اسکی بڑی بہن جو کالج میں بی اے میں تھی انگریزی کا مجلّہ ترتیب دیتے تھے مگر نجمہ صرف میرے مجلّے میں اپنی تخلیقات شامل کرتی تھی۔پورے سال میں نے یہ مشقت کی جو سائینس کے کورس کے ساتھ یقیناً مشکل تھی مگر بقول شخصے ''شوق دا کوئی مول نی''۔میرے کالج چھوڑنے کے بعد میرے قریبی دوست افسر فاروقی نے اسے اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ وہ بی ایس سی پاس کر کے کالج نہیں چھوڑ گیا۔

موسیقی کا مقابلہ

یہ وہ زمانہ تھا جب کالجوں میں موسیقی کے مقابلے، ڈرامے اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے مظاہرے ہوتے تھے۔جیسا میں اپنے ہائی اسکول کے ذکر کے دوران لکھ چکا ہوں، اللہ نے مجھے قدرتی طور پر گانے کی صلاحیت عطا کی تھی مگر میں نے اسے سنجیدہ نہیں لیا تھا۔مگر جب ٹنڈو جام کے ایگریکلچرل کالج نے کل سندھ بین الکلیاتی موسیقی کے مقابلے کا اعلان کیا تو ہمارے کالج سے ساز یئے (instrumental) میں مشتاق جو کمال کا ماؤتھ آرگن بجاتا تھا کو نامزد کیا گیا اور چونکہ گائیکی (vocal) کے لئے کوئی تھا ہی نہیں اس لئے پرنسپل صاحب نے مجھ سے کہا میں اس کے ساتھ ٹیم بناؤں۔ٹنڈو جام کالج نہایت سرسبز علاقے میں امریکنوں نے تعمیر کیا تھا اور میرپور سے تقریباً تیس میل دور تھا۔ میں رشید اور ریاض کے ساتھ ریل گاڑی میں وہاں پہنچا۔اس تقریب میں مشتاق کو پہلا اور مجھے تیسرا انعام ملا اور اس طرح ٹرافی ہمارے کالج نے جیتی۔دوسرے دن ماجد صاحب نے ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائی جسمیں ہم دونوں انکے ساتھ بیٹھے تھے اور ٹرافی کی شیلڈ درمیان میں رکھی تھی۔یہ تصویر سالوں میرے پاس رہی مگر پھر اتنی دفعہ گھر اور ملک بدلے کہ افسوس اب میرے پاس وہ تصویر نہیں ہے۔

اہالیانِ کوفہ کی مثال

میں اپنی کلاس میں اسقدر ہردلعزیز تھا کہ ہر لڑکا مجھ سے کہتا تھا کہ تم ہمارے کلاس کی نمائندگی کا الیکشن لڑو۔ مجھے سیاست سے ہمیشہ سے نفرت ہے۔میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اس سال لڑکوں کے علاوہ لڑکیوں نے بھی کہا کہ آپ انتخاب میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔۔۔آپ تو بلا مقابلہ ہی منتخب ہو جائینگے۔ ادھر کچھ میرے اساتذہ نے بھی میری ہمت افزائی کی بلکہ پرنسپل ماجد صاحب نے بھی کہا کہ ہمیں پیشہ ور طالب علم لیڈر نہیں بلکہ اچھے سلجھے ہوئے رہنما چائیں۔بقول میرے دوستوں کے کہ میں بھی جھنڈے پر چڑھ گیا۔میرا ابھی یہی خیال تھا کہ میں تو بلا مقابلہ ہی منتخب ہو جاؤنگا مگر اسی سال ہماری کلاس میں ایک لڑکا نواب شاہ سے آیا تھا اسکا نام قاسم تھا اور اسکے ابا پولس کے ایس پی تھے۔وہ ایک بالکل ہی گمنام، خاموش اور عام سا لڑکا تھا۔اتنے مہینوں میں بھی اسے شاید ہی کوئی جانتا ہو مگر اس نے میرے مقابلے میں نام داخل کر دیا۔میرے پاس تو اپنے کارڈ یا پوسٹر چھپوانے کے بھی پیسے نہیں تھے ادھر اس نے بڑے بڑے پوسٹر چھپوائے اور دن بھر کینٹین میں لڑکوں کے لئے مفت کیک، پیسٹریز اور پیٹیز کا اکاؤنٹ کھلوا دیا۔مگر سارے لڑکے مجھ سے یہی کہتے رہے کہ یار ہم تو اسکا مال مفت میں کھا پی رہے ہیں۔تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارے سوا ہم ووٹ کسے دے سکتے ہیں۔بہرحال ووٹنگ کا دن آیا بڑے ڈھول تاشے تھے، مجھے پھر بھی سب یہی یقین دلا رہے تھے کہ تم ہی جیتو گے مگر جب نتیجہ نکلا تو قاسم بڑی واضح اکثریت سے جیتا تھا۔اسکے کیک اور دوسرے لوازمات کام آ گئے، میں افسردہ تو بہت ہوا مگر اس سے مجھے ایک سبق ضرور مل گیا۔اب جب پاکستان کے الیکشن ہو تے ہیں تو مجھے اسکا احساس ہوتا ہے کہ ہماری قوم کا کردار ہی یہ ہے کہ ''پیسہ بولتا ہے'' اور لوگ ارزاں قیمت پر بک جاتے ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قسم کے جہلا ہماری اسمبلیوں میں نہیں بیٹھے نظر آتے۔

دلچسپ واقعہ اور ایک سبق

ہمارے انٹر سائینس کے فائنل امتحانات میں چند ہی مہینے باقی تھے کہ ہمارے فزکس کے انچارج راحت حفیظ مرزا صاحب کا ٹرانسفر ٹھٹہ، جو سندھ کا ایک بہت چھوٹا شہر ہے، ہوگیا۔راحت صاحب لڑکوں میں بہت ہردلعزیز تھے۔اسکی وجہ سے تمام لڑکوں کو بڑی تشویش ہوئی کہ امتحانوں کے اتنے نزدیک اس ٹرانسفر سے ہمارے امتحانات پر اثر پڑیگا۔پھر سنا تھا کہ کمال صاحب جو انکی جگہ آ رہے تھے اچھی شہرت نہ رکھتے تھے۔پہلے تو ہم نے اپنے پرنسپل سے کہا کہ وہ اس

تبادلے کوامتحانوں کے بعد تک ملتوی کروادیں انہوں نے عذر پیش کیا کہ انکے ہاتھ میں کچھ نہیں۔انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم خود حیدرآباد جا کر بااختیار افسروں سے مل کر یادداشت پیش کریں۔اس کے لئے دولڑکوں کے ساتھ مجھے منتخب کیا گیا اور ہم ریل گاڑی سے حیدرآباد گئے۔ہم سب سے بڑے افسر سے ملے، نہ ہی کمال صاحب میر پور آنا چاہتے تھے نہ ہی راحت صاحب جانا چاہتے تھے اس لئے ہماری نظر میں معاملہ بالکل سیدھا تھا۔افسر نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ یقیناً ہماری مدد کریگا مگر دوسرے دن پرنسپل نے ہم سے کہا کہ اس افسر کا فون آیا ہے کہ فوراً تبادلے پر عملدرآمد کیا جائے۔اب راحت صاحب کو دوسرے ہی دن میر پورخاص چھوڑنا تھا۔لڑکوں کی فرمائش پر میں نے اتنے کم وقت میں انکی الوداعی پارٹی کا انتظام کیا۔کلاس میں متفقہ فیصلہ ہوا کہ ہرلڑکے سے دو دو روپے چندہ لیا جائیگا مگر تقریباً سارے ہی لڑکوں نے کہا کہ ''اتنی بڑی رقم'' تو فی الوقت انکے پاس نہیں مگر وہ ہر حالت میں کل مجھے پیسے دیدینگے مشکل یہ تھی کہ پارٹی تو اسی شام ہونی تھی۔لڑکوں نے پھر مجھ پر دباؤ ڈالا کہ تمہاری شہر میں بڑی جان پہچان ہے تم ہی اسکا انتظام کرو۔میں میر پورخاص کی سب سے اچھی ریسٹوران ''کیفِ حیات'' گیا اور ان کو پارٹی کے لئے لوازمات کا آرڈر دیا۔میرے کنبے کی ساکھ اور عزت بہت اچھی تھی اس لئے میری ضمانت پر وہ مان گئے کہ حساب دوسرے دن بے باق کردیا جائیگا۔شام کو کالج کے لان میں بہت شاندار پارٹی ہوئی جو سب کو سالوں یاد رہی۔مگر دوسرے دن جب میں لڑکوں کے پاس گیا تو چند ایک کے سوا سب نے کہا ہمارے والدین نے پیسے دینے سے انکار کردیا ہے۔کوئی ساڑھے تین سو روپے کا بل تھا۔یہ رقم اس زمانے میں کلکٹر کی پورے مہینے کی تنخواہ کے برابر تھی۔اس کے بعد کئی ہفتے لڑکوں نے مجھے رلایا۔بار بار گھر کے چکر لگواتے تھے کہ شام کو آنا صبح کو آنا مگر پیسے نہیں ملتے تھے۔ان روپوں کو وصول کرنے میں شہر کی ایسی ایسی گلیوں میں جنکا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔مجھے پریشانی کے ساتھ اسکا خوف تھا کہ اگر ہوٹل والوں نے بتادیا تو میری اماں تو میری کھال اتار دینگی۔کچھ لڑکوں کے دئے روپوں سے ہوٹل کو تھوڑے بہت پیسے دئے پھر بھی بہت باقی رہ گئے تھے آخرکار ہم چند دوستوں نے خود کچھ انتظام کیا، کچھ میں نے اپنے محلے والوں سے مانگے اور چند بچے کھچے روپے میرے رونے پیٹنے پر ماموں جی، ہوٹل کے مالکان نے معاف کئے۔یہ واقعہ میں یا میرے قریبی دوست کبھی نہیں بھول سکتے۔اس سے مجھے یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ رقم کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے مگر میری فطرت ایسی ہی ہے اور انسانیت پر جو میرا اعتماد ہے میں اسے توڑنا نہیں چاہتا اور بار بار دھوکہ کھاتا ہوں۔اس پر میں'' کتاب'' لکھ سکتا ہوں مگر اسکی تفصیل یہاں بے موقعہ ہے۔

سالانہ امتحان

انہی ہنگامہ خیزیوں اور مصروفیتوں میں سال اختتام کو پہنچا اور ہمارے سالانہ امتحان منعقد ہوئے۔یہ امتحان بورڈ کے امتحان تھے اور پورے سندھ میں ایک ہی دن ہوتے تھے پرچہ بھی پورے صوبے میں ایک ہی ہوتا تھا امتحان کے دوران طلبہ پر نظر رکھنے کے لئے اساتذہ بھی دوسرے کالجوں کے ہوتے تھے۔ماحول بہت ہی کشیدہ ہوتا تھا اور نگہبان کی اس آواز پر کے stop writing ہر طالب علم کو قلم رکھنا ہوتا تھا۔سندھ میں ویسے بھی نظم وضبط بڑا سخت تھا اور کراچی کی طرح لڑکے دن رات پرچے نہیں پھاڑا کرتے تھے۔ہمارے مضامین انگلش، اردو، بوٹنی، زولوجی، فزکس اور کیمسٹری تھے۔میرے سارے پرچے بہت اچھے ہورہے تھے مگر جس دن کیمسٹری کا پرچہ تھا اس دن پرچہ کھول کر معلوم ہوا کہ ہمیں جو کورس بتایا گیا تھا اس پرچہ میں چھ سوالوں میں سے دو سوال کورس سے باہر تھے۔میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔کچھ ہی منٹ کے بعد معلوم ہوا کہ حیدرآباد کے مرکزی سینٹر میں طلبہ نے واک آؤٹ کیا ہے مگر ہم میں ایسی کوئی ہمت نہ تھی بہر حال پرنسپل صاحب نے آکر تسلی دی کہ بورڈ کو اسکا احساس ہوگیا ہے اور نمبر دیتے ہوئے اس کا ازالہ کیا جائیگا۔میں بھی بہت دل برداشتہ تھا بہر حال جیسے تیسے پرچہ حل کیا۔میں جب اسی دل گرفتہ حالت میں گھر پہنچا تو میرے رشتے کے ایک بزرگ ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔وہ اپنی سخت اور حوصلہ شکن فطرت کی وجہ سے خاندان میں مشہور تھے۔انکے لئے مشہور تھا کہ انہوں نے کبھی کسی کی تعریف یا دلجوئی نہیں کی۔انہوں نے مزید میری حوصلہ شکنی کی اور کہا کہ نالائقی تو طلبہ کی اپنی ہوتی ہے اور الزام ہمیشہ ممتحن کو دیتے ہیں۔ادھر میرا مستقبل تو پوری طرح اس امتحان پر منحصر تھا اس لئے میں انکے رویہ سے بہت دلگیر ہوا اور میرے دل پر یہ بات گولی کی طرح لگی افسوس میں یہ بات اب بھی کوشش کے باوجود نہیں بھلا سکا ہوں۔

ہمارے پریکٹکل بہت اچھے ہوئے اور مجھے یقین ہوگیا کہ اگر کیمسٹری کے پرچے میں کوئی کسر رہ بھی گئی ہے تو پریکٹکل اس کی کو پورا کردیگا۔اس وقت تک فصیح صاحب جا چکے تھے اور نور صاحب ہمارے نئے لیکچرر تھے۔انہوں نے میری خاص حوصلہ افزائی کی اور بیرونی ممتحن سے میرا بہت اچھا تعرف کروایا۔امتحان ختم ہوئے، چھٹیاں ہوگئیں مگر میرے ذہن پر امتحان، میرا مستقبل اور میڈیکل کالج کا داخلہ کچھ اس طرح سوار تھا کہ مجھے کسی چیز میں لطف نہیں آتا تھا۔بس شام کو فروٹ فارم جاتے ہوئے ایک نیم پختہ مسجد میں جسکا فرش کچا تھا اور جو اپنے ہینڈل والے پمپ کے انتہائی ٹھنڈے پانی کی وجہ سے پورے شہر میں مشہور تھی میں مغرب کے وقت نماز ادا کرتا تھا اور سجدے میں گر کر خدائے ذوالجلال سے دعا کرتا تھا کے اتنے اچھے نمبر آئیں کہ نہ صرف داخلہ یقینی ہو بلکہ میں پانچ سال کے لئے میرٹ اسکالرشپ کا بھی حقدار قرار پاؤں۔

مگر اسی کے ساتھ دل کے کسی گوشے سے یہ صدا بھی ابھرتی تھی کہ کیا اب کبھی پھر نجمہ کو دیکھنے کا موقعہ ملے گا؟ کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انٹر سائنس کے بعد اسکے کیا ارادے ہیں۔

☆

''وصل کی شب''

نند کشور وکرم

(دہلی، بھارت)

خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔اُن کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت میں دہلی چھوڑ کر فیض آباد آئے اور محلّہ مغلپورہ میں سکونت پذیر ہوئے۔آتش کی ولادت بھی یہیں ۱۷۶۸ء میں ہوئی۔(''تذکرۂ ماہ وسال'' از مالک رام) ابھی انھوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔صغر سنی میں یتیم ہو جانے سے وہ تعلیم سے محروم رہ گئے اور شہر کے بانکوں کی بُری صحبت میں پڑ کر ان کے مزاج میں بانکپن اور شوریدہ سری آ گئی، تاہم اُن کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے وہ فنِ جنگ میں بڑے ماہر ہو گئے۔نوجوانی میں انہوں نے اُردو فارسی میں شاعری شروع کر دی جس سے فیض آباد کے مشہور نواب مرزا محمد تقی خان تقی بڑے متاثر ہوئے۔اُنھوں نے انھیں اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔نواب غازی الدین حیدر کے دورِ حکومت میں وہ نواب تقی کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے جہاں ان دنوں مصحفی اور انشا کے زوردار مقابلے ہو رہے تھے۔یہاں پہنچنے پر ان کا تعارف مصحفی سے کرایا گیا اور وہ ان کے شاگرد بن گئے۔

نواب تقی کے انتقال کے بعد ان کے گزر اوقات کا مستقل سہارا ختم ہو گیا مگر انھوں نے اُس دور کے دوسرے شعرا کی طرح اپنے کو دربار اودھ سے کبھی وابستہ نہیں کیا اور نہ ہی انھوں نے دستِ طلب کسی کے سامنے پھیلایا۔محلّہ علی خاں کی سرائے میں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان تھا جس میں غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے وہ کسی امیر یا نواب کی خوشامد نہ کرتے تھے۔شاگرد کبھی کبھی خود اُن کی مدد کر دیتے تھے مگر انہوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔بادشاہ کی جانب سے انہیں اسّی روپے ماہوار ملتے تھے اور اسی پر قناعت و توکل سے زندگی گزارتے تھے۔

آتش تکلف و تصنع سے کوسوں دور تھے۔وہ عاشق مزاج، حسن پرست اور آزاد طبع تھے۔سپاہیانہ لباس پہنتے اور تلوار باندھتے تھے۔مشاعروں میں بھی ایسے ہی لباس میں جاتے تھے۔آخری دنوں میں اُن کا مصحفی سے بگاڑ ہو گیا تھا لہٰذا اصلاح لینی بند کر دی تھی اور خود ہی اپنی غزلوں پر نظرِ اصلاح ڈال لیتے تھے۔ناسخ ان کے ہم عصر تھے اور ان دنوں کا لکھنؤ ناسخ اور آتش کے حواریوں میں تقسیم تھا اور دونوں اساتذہ میں نوک جھونک رہتی تھی۔

جیسے مصحفی نے کہا کہ:

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب
بو مسلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

اس کے جواب میں آتش نے کہا:

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب
جس نے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

اس طرح کے ہنگاموں اور نوک جھونک کے باوجود آتش اپنے حریف ناسخ کا بڑا احترام کرتے تھے۔چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ناسخ کی وفات کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ناسخ کے انتقال کے آٹھ نو برس بعد ۱۳/جنوری ۱۸۴۷ء بمطابق چہارشنبہ ۲۵/محرم ۱۲۶۳ھ کی صبح کو لکھنؤ میں ان کی بھی وفات ہو گئی۔(''تذکرۂ ماہ وسال'' از مالک رام)

آتش کا کلام تکلف اور تصنع اور ابتذال سے پاک صاف ہے۔اُن کے شعروں میں فضول تمثیلیں نہیں۔سادہ اور سہل الفاظ کا بڑے عمدہ انداز سے استعمال کیا گیا ہے اور اکثر اشعار میں روانی موسیقی کی حد تک جا پہنچتی ہے۔محاورات کا استعمال بھی بڑا برمحل اور با موقع کرتے ہیں۔جذبات نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں ادا کرتے ہیں۔زبان ثقیل الفاظ سے پاک اور روزمرہ کی ہے۔شعر کافی بلند ہوتے ہیں مگر آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔اگر چہ ان میں میر ایسی تڑپ بھی نہیں تاہم میر اور غالب کے بعد متقدمین میں سے اُن پر ہی نظر ٹھہرتی ہے۔بعض افراد کا کہنا ہے کہ علمی استعداد کم ہونے کی وجہ سے کلام میں پختگی اور بلندی نہیں اور وہ غلط العام الفاظ جوں کے توں باندھ دیتے ہیں لیکن ایک طرح سے انھوں نے اچھا ہی کیا۔اس لفظی چھان بین نے زبانِ شعر کو عربی فارسی کے ثقیل الفاظ سے کرخت اور بے لوچ بنا دیا تھا۔آتش کے اجتہاد سے زبان میں لوچ اور لچک پیدا ہوئی۔

ناسخ اور آتش دونوں ہی اپنے زمانے میں بڑے شاعر تھے مگر ناقدین آتش کو ناسخ پر ترجیح دیتے ہیں۔مرزا غالب نے ایک خط میں تحریر کیا ہے:''آتش کا کلام بہت مؤثر ہے۔'' دراصل بندش کی چستی، الفاظ کی حلاوت مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر فوقیت حاصل ہے۔ناسخ نے ثقیل الفاظ اور مشکل تشبیہات سے اپنے اشعار کو بے مزہ بنا دیا تھا۔اس کے برعکس آتش کے شعر نیچرل ہیں اور ناسخ کے مقابلے میں اُن کے اشعار میں بے تکلفی اور تڑپ زیادہ ہے۔نیز اُن کے اشعار بہت رفیع ہیں اور ان میں تصوف بھی ہے۔

نواب واجد علی شاہ، رند، صبا، دیا شنکر نسیم، نواب مرزا شوق، آغا مجو شرف اور خلیل ان کے مشہور شاگرد ہیں۔اُن کی کلیات دو اُردو دواوین پر مشتمل ہے۔دوسرا اُن کی موت کے بعد مرتب ہوا۔فارسی کلام ناپید ہے۔ذیل میں آتش کے کلام سے مختصر انتخاب درج ہے۔

اے صنم جس نے تجھے چاندسی صورت دی ہے
اُسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے
تیغ بے آب ہے نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے، کچھ موت نے فرصت دی ہے
کوئی اکسیر ، غنی دل نہیں رکھتی ایسا
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے
فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے
یادِ محبوب فراموش نہ ہووے اے دل
حسنِ نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے
گوش پیدا کیے سننے کو تیرا ذکرِ جمال
دیکھنے کو ترے آنکھوں میں بصارت دی ہے
لطفِ دل بستگیِ عاشقِ شیدا کو نہ پوچھ
دوجہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے
کمرِ یار کے مضمون کو باندھو آتش
زلفِ خوباں سے مرے تم کو طبیعت دی ہے

☆

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے
پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
مری طرح سے مہ ومہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے
ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہے آخر سیاہ مو کرتے
یہ کعبہ سے نہیں بے وجہ نسبتِ رخِ یار
یہ بے سبب نہیں مردے کو قبلہ رو کرتے
وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے
نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

☆

فصلِ گل ہے لوٹئے کیفیتِ مے خانہ آج
دولتِ ساقی سے مالامال ہے پیمانہ آج
بادشاہِ وقت ہے اپنا دلِ دیوانہ آج
داغ سودا ہم کو دیتا ہے جنوں نذرانہ آج
دولتِ دُنیا سے مستغنی ہوں میں دیوانہ آج
گنج اُگل دیتا ہے میرے واسطے ویرانہ آج
تیرے کوچے کا ہے اے خانہ خراب افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے برہمن بت خانہ آج
جلوۂ حسنِ پری دِکھلا رہی ہے فصلِ گل
عقلِ کُل کہیے اُسے جو کوئی ہے دیوانہ آج
خوب رُو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسف نہ تھی جو ہے ترا بیعانہ آج
وصل کی شب ہے اندھیرے کا ہے وعدہ یار سے
شمع کا ہونا نہیں ممکن کہاں پروانہ آج
وہ پری پیکر کرے جو ناز زیبا ہے اُسے
شہر آباد اُس کے دیوانوں سے ہے ویرانہ آج
نزع کی حالت ہے کوئی آشنا اپنا نہیں
دیکھئے جس کو نظر آتا ہے وہ بیگانہ آج
آمد آمد اس سراپا نور کی ہے بزم میں
شمع اُڑ جاوے جو ہاتھ آویں پرِ پروانہ آج
ہم نشیں کہتے ہیں ذکرِ عیش نصفِ عیش ہے
میں کہوں تو سن جمالِ یار کا افسانہ آج
امتیازِ خوب و زشت اپنے زمانے میں نہیں
ایک سا ہے آہوئے مست و سگِ دیوانہ آج
جان سے بیزار ہوں اِک شمع رو کے عشق میں
ساتھ لے کر مجھ کو کر دے آگ میں پروانہ آج
تلوے سہلاتی ہیں پریاں خانۂ زنجیر میں
وقت کا اپنے سلیماں ہے ترا دیوانہ آج
مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج
نقشِ آسیبِ پری ہے صورتِ زیبا تری
ہوش میں آتا ہے تجھ کو دیکھ کر دیوانہ آج
زلف کو لٹکاتے ہیں رخسار پر سو سو طرح
آئینہ اُن کا مصاحب ہے مقرب شانہ آج

کل ہمارا اور اس کا امتحاں ہوجائے گا
آشنائی کا ترے دم تو بھرے بیگانہ آج
میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کر نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج
وصل کی شب ہے کہاں ساقی تکلف برطرف
میں تمھیں پیمانہ دوں تم مجھ کو دو پیمانہ آج
دیکھوں تو کیوں کر پری ہوتی نہیں شیشے میں بند
بعد مدت ہوش میں آیا ہوں میں دیوانہ آج
مال ہے اپنا جو یوسف آ گیا بازار میں
ہے زرِ قیمت کمر میں ہاتھ میں بیعانہ آج
عرش پر ہے اِن دنوں میں اہلِ دُنیا کا دماغ
کون سا گھر ہے نہیں جس میں ہے بالاخانہ آج
چشمِ وحدت میں اپنی نیک و بد دونوں ہیں ایک
گرگ و یوسف سے برابر ہے یہیں یارانہ آج
خالِ مشکیں کو ترے ارزاں سمجھ کر مول لوں
قیمتِ خرمن بھی کردے گر ملے یہ دانہ آج
نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر ہمّتِ مردانہ آج

☆

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے
زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
تمھارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے
عجب کیا چھٹا روح سے جامہ تن
لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے
تپِ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جدا پوست سے استخواں کیسے کیسے
نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر ، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے
توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے
دل و دیدۂ اہلِ عالم میں گھر ہے
تمھارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے
غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
تیری کلک قدرت کے قربان آنکھیں
دِکھائے ہیں خوش رو جواں کیسے کیسے
کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

☆

خشمگیں آنکھیں تمھاری آفتِ جاں ہوگئیں
برچھیاں عاشق کشی کرنے کو مژگاں ہوگئیں
تم جو جا نکلے نسیمِ نو بہاری کی طرح
پھول کھل کھل کر گل و لالہ کی کلیاں ہوگئیں
اے صبا دامن ہے تیرا اور مجھ مجنوں کا ہاتھ
اُس پری رُو کی اگر زلفیں پریشاں ہوگئیں
سامنے رہنے لگا رخسارۂ زیبائے یار
صورتِ آئینہ آنکھیں اپنی حیراں ہوگئیں
راستی سے نیزۂ ترکاں بنا بالائے یار
وہ بھویں اپنی کجی سے تیغِ عریاں ہوگئیں
خانۂ دل میں تصور خوش جمالوں کا رہا
گاہ حوریں، گاہ پریاں اپنی مہماں ہوگئیں
کوچہ گردی میں دِکھائی تیغِ قاتل نے بہار
بسملوں سے شہر کی گلیاں گلستاں ہوگئیں
اے مرادِ دل، ترے کوچے میں رکھتے ہی قدم
حسرتیں جو کچھ کہ تھیں گردِ پریشاں ہوگئیں
یہ کھلا آتش عناصر سے دلِ دیوانہ کو
چار دیواریں اکٹھی ہوکے زنداں ہوگئیں

کرشن گوتم کی سحر نگاری

سید تقی عابدی
(کینیڈا)

کرشن گوتم کے گلشن کی سیر کے دوران جب سبد قرطاس پر ''کلیاں بہار کی'' پیش کی گئیں تو ہر کلی نے یوں نغمگی کے ساتھ صبح کا سلام بھیجا کہ نسیم صبح نظم کا ترنم ہو گئی۔ کرشن گوتم کی خوبصورت نظم ''صبح کا سلام'' ایک عمدہ تخلیق ہے جس سے قاری اور سامع کی توجہ ایک پل کے لیے بھی ہٹنے نہیں پاتی کیوں کہ اس کا داخلی عمل تسلسل کے ساتھ احساسات کے رنگوں سے ذہن کے اسکرین پر نئے نئے رنگی پیکر ابھارتا اور مٹاتا جاتا ہے اور اس تاثیر کے تاثر سے جذبات میں ہل چل کبھی تیز تو کبھی سست پیدا ہوتی رہتی ہے چنانچہ یہ تمام واردات قلبی جو کبھی جمالی کبھی جلالی اور کبھی سماجی کیفیات کے حامل ہیں جب اخلاقی اقدار سے ہم کنار ہوتے ہیں تو زندگی کے نیلگوں آسمان پر قوس قزح بن کر نمودار ہوتے ہیں اور اسی کو بڑی شاعری کہتے ہیں۔

''صبح کا سلام'' یوں تو آزاد نظم ہے لیکن اس کے مصرعے تغزل کی چاشنی سے بھرے پڑے ہیں۔ نظم کی بحر میں قدرتی چشمہ کی روانی اور نغموں سے لبریز لفظوں کی صف آرائی شاعر کی کہنہ مشقی اور مہارت کی دلیل ہے۔ اچھا شاعر الفاظ کو نظم کے رشتے میں پرونے سے قبل ان کے اندرونی آہنگ کو تول لیتا ہے اسی لیے ایک دو مصرعوں ہی میں پڑھنے یا سننے والے کا ذہن نظم سے آہنگ سے ٹیون (Tune) ہو جاتا ہے جیسا کہ اس نظم میں یہ عمل مطلع اور مقطع تک یعنی سلام سے انجام تک جاری و ساری ہے۔

نظم کا آغاز غزل کے مطلع کی طرح متحرک اور موثر ہے۔ شاعر نے صنعت حسن تعلیل سے مصرعوں کے اثر کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ روایت کو جدیدیت میں گھول دیا گیا ہے۔ قدیم حکایتوں میں سورج کے چہرے پر ہنسی، چاند کے ماتھے پر شرم و حیا، تاروں کی آنکھوں میں شوخی اور اشاروں کے احوال کا پتہ چلتا ہے چنانچہ انہی تاروں اور ستاروں کے اشاروں پر بادبان اپنے سفر کی سمت تعین کرتے ہیں۔ نظم کا آغاز ہماری گفتگو کا ثبوت ہے۔

آسمان سے کرنیں پھیلا کر مجھے
ہنس کے سورج نے کہا صبح کا سلام!
چاند نے شرما کے دیکھا پیار سے
شوخ تاروں نے اشاروں نے تبھی
مجھ پہ نظروں سے کمندیں ڈال دیں۔

صفت حسن تعلیل میں شاعر کسی طبعی حالت کو شاعرانہ ادا میں اس طرح بدل دیتا ہے کہ پڑھنے والا مجاز کو حقیقت پر فوقیت دیتا ہے جیسا کہ یہاں شاعر نے بادصبا کے جھونکوں سے جو شاخ گل جھوم رہی ہے اس کے نازنین انداز کو بیان کیا ہے اور چونکہ ہوا ہی آواز کی سواری بھی ہے اس لیے اسی بادصبا سے کانوں میں نغموں کا رس بھی گھول دیا ہے۔

جھوم کر بادصبا نے ناز سے
اپنے دلکش نازنیں انداز میں
میرے کانوں میں ترانے بھر دیے۔

کرشن گوتم کی اس نظم کا محور ایک بیساختہ اور باطنی صدا ہے جو دل کے جوار سے نکلی ہے اور یہی ضمیر اور وجدان کی آواز ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو انسان کو اس کا صحیح مقام، صحیح راستہ اور اشرف المخلوقات کی عظمت کا راز بتاتی ہے کہ یہ گلشن ایجاد آدمی کے سواگت کے لیے سجایا گیا ہے یہ سورج چاند اور تارے سب اسی کے لیے روشن رکھے گئے ہیں۔ یقیناً جمادات، نباتات، حیوانات یعنی تمام کہکشاں کے مخلوقات انسانی توجہ کے محتاج ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

اور اک آواز تب دل سے مرے
اٹھ کر پھیلی ساری کائنات میں
جس کو سن کر انجم و شمس و قمر
واہ وا کرتے رہے کرتے رہے
دل کی اس بے ساختہ آواز سے
جس نے بخشی حُسن کو ناز و ادا
جس نے پردے زندگی اور موت کے
چشم انساں سے اٹھا کر رکھ دیے
جس نے بخشی زندگی کو زندگی
جس نے ہمت دی کسی کو پیار میں
جان بھی اپنی نچھاور کر سکے۔
دل کی اس بیساختہ آواز سے
کائنات بیکراں کی وسعتیں
مری آنکھوں کے شعاع نور میں
آ کے سمٹیں سامری انداز میں
میں نے دیکھا ساری کائنات کے
سب خزانے کھولے اپنا اپنا منہ
میرے قدموں میں بصد عجز و نیاز
گر کے یوں فریاد کرتے ہیں کہ میں

چھو کے اپنے گرم ہاتھوں سے انھیں
کوئی اہمیت کوئی پہچان دوں

گوتم نے کتنا سچ کہا ہے کہ یہ سونا چاندی لعل یاقوت اور الماس سب دھاتیں اور پتھر ہیں۔ انہیں انسان ہی نے اپنے ہاتھوں سے بیش قیمت گلوبند اور انگشتری بنا رکھا ہے یا دوسرے لفظوں میں انھیں چھو کر ان کو نام دام اور مقام سے نوازا گیا ہے۔

گوتم کی اس آفاقی نظم کا کینوس ان کی خوب صورت دنیا کی خیالی تصویر سے ہٹ کر فوراً ایک وحشت زدہ درد بھری دنیا کی حقیقی صورت سے رنگین اور آتشین ہو جاتا ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے مشاہدات اور خارجی معاملات اور حالات کو دل کے الاؤ میں پگھلا کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ یہ منظر احساساتی اور درد ناک اور انسانیت کے لیے شرمناک بھی ہے۔ شاعر نے صرف چند ہی مصرعوں میں ملکوں اور زمینوں کی تقسیم مذہب، قوم اور زبان کے جھگڑے، راکٹ بم اور بارود کے حملے، ظلم و جبر اور نفرت کے مسائل کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قطرہ میں دجلہ نہ صرف خود دیکھا بلکہ دوسروں کو دکھایا ہے۔

مڑ کے لیکن میں نے جب دیکھا، لگا
ٹکڑے ٹکڑے تھی ہماری سرزمیں
خاک وخوں میں سسکیاں لیتی ہوئی
ہر طرف دہشت گری خوف و ہراس
بم دھماکے قتل وخوں آتش زنی
اب دھرم تو اب زباں کے نام پر
اب کسی کی مانگ کا اجڑا سیندور
اب کسی ماتا کی چھاتی پھٹ گئی
برگ وگل پر خون کے چھینٹے پڑے
خوشبوؤں کو ہیں نگلتے جا رہے

پھر شاعر نے لوگوں کو دو دن کی زندگی اور دو گز کی قبر سے آگاہ کیا ہے یہاں شاعر کا لہجہ پند و خطابت کا نہیں بلکہ فکر و حقیقت کا ہے۔ نفس امّارہ کی سرکشی ملاحظہ کیجیے۔

خوشبوؤں کا شوق ہے دل میں لیے
زہر سی بارود کی بدبو مگر
ہر طرف تیزی سے ہے پھیلا رہا
کائنات بیکراں کو چھوڑ کر
اس کے استقبال سے منہ موڑ کر
دھنس رہا ہے قبر میں لالچ کی جو
صرف دو گز سے زیادہ کچھ نہیں

شاعر نے اس نظم میں بنی نوع انسان سے ایک سوال کیا ہے جو اس نظم کا اوج یا (Climax) ہے۔ یہ سوال اس نظم کا مقطع بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہر ذی شعور انسان جو رنگ، مذہب، ملت اور وطن کے رنگ سے بے رنگ ہے اور ان دیواروں سے جس کا قد بلند ہے وہ ہی دے سکتا ہے اور اسی جواب میں اس کے نفس آتما اور ضمیر کی پاک سازی بھی دکھائی دیتی ہے۔

میرے دل نے مجھ سے پوچھا یہ سوال
کیا ہوا لوگوں کو آخر کیا ہوا
اک طرف تو کائنات بیکراں
بھر کے اپنی جھولیاں ہے بے قرار
عزم آدم کے سواگت کے لیے
پیار سے پیدا ہوا ہے یہ مگر
آگ نفرت کی اگلتا جا رہا
ہے کسی امید کا غنچہ مگر
یاسیت کے خار بوتا جا رہا
حضرت آدم کا سرمایہ ہیں کیا
آرزوئے انجم وشمس وقمر
اشرف المخلوق، نائب اب کے
کیا تمہارا بس یہی انجام ہے

اس نظم میں محاورے روزمرّہ، ضرب المثل اور دیگر محاسن زبان صنائع معنوی اور لفظی کی طرف ہم نے طوالت کو پیش نظر رکھ کر توجہ نہ کی اس کے علاوہ اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جو محسوس کی جا سکتی ہیں لیکن بیان نہیں ہو سکتیں۔ ہم نے کرشن گوتم کے صحیفہ سے صرف ایک رقعہ لے کر مرقع بنانے کی کوشش کی ہے۔ ملٹن نے اچھی شاعری میں سادگی خلوص اور صداقت کا ہونا لازمی بتایا ہے۔ کیا ''صبح کا سلام'' یہ تینوں اقدام سے مزین نہیں؟

نظم کے ہر لفظ میں خلوص اور صداقت ہے۔ ساری نظم اگرچہ منتخب پُر شکوہ الفاظ سے منور ہے جو خود شاعر کی زبان دانی اور قادر الکلامی کی پہچان ہے مگر ان فارسی عربی اور اردو الفاظ کے ساتھ ہندی کے رسیلے شبدوں کی مٹھاس نظم کی حلاوت کو بڑھا رہی ہے۔ اس نظم میں دھرم، سیندور، ماتا، سواگت کے ساتھ ساتھ مصرعوں میں انجم، شمس، قوم، کائنات، بیکراں، اشرف المخلوق، حضرت آدم نائب رب کا سرمایہ ہیں۔

آخر میں ہم یہی کہیں گے کہ فکر اعلیٰ کی تصویر کشی نہیں کی جا سکتی البتہ کسی حد تک تفہیم ہو سکتی ہے چنانچہ ''کلیاں بہار کی'' جو ایک قدرتی پُر زور حکمراتی چشمۂ سخن ہے ہم نے صرف اپنا ساغر بھر کر نوش کیا تا کہ تشنگی کسی حد تک رفع ہو سکے۔ اگرچہ کرشن گوتم نے ''کلیاں بہار کی'' میں بقول فیضؔ

پیئو کہ مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید

''قرطاسِ اخضر''

انتظار

ڈاکٹر تحسین فراقی
(لاہور)

(۱)

ہماری منتظر آنکھیں تو پتھر ہو گئیں
اور سر ہمارے۔۔۔ برف کے گالے
مگر اب تک سمندِ برق پیما پر سوارِ خضر صورت
گرد میں گم ہے
ابھی اس نجمِ دُور افتادہ کی کوئی کرن
ہم تک نہیں پہنچی

(۲)

یہاں بس اپنی دستاروں کے جھگڑے ہیں
ہمارے جوہرِ ذاتی کو سرطاں کھا چکا خود پروری کا
خود پرستی کا
اور اس پر یہ امیدیں ہیں
کوئی طارق، کوئی قاسم، کوئی ایوبیِ دوراں، کوئی سلطاں، کوئی فاتح
یقیناً اب بھی آئے گا
اِسی امیّد پر ہم نے کئی صدیوں گنوا دیں۔۔۔!
یہ سوچا ہی نہیں ہم نے
یہ سوجھا ہی نہیں ہم کو
یدِ بیضا، عصائے موسوی کا دَور کب کا ہو چکا۔۔۔!
وہ جس کے فیض سے ہاتھوں میں بے جاں اور بے آواز
پتھر بولتے تھے
اب نہ آئے گا
یہ سوچا ہی نہیں ہم نے
کہ برّ وں اور بُز غالوں کی دُنیا کس قدر کمزور دنیا ہے
جہاں سب شیر کچا ماس کھانے کے بجائے گھاس کو ترجیح دیتے ہوں
وہیں ایسے خیالِ خام پکتے ہیں
ہمارے دانت کب کے رُگر چکے ہیں
اور ہمارے پوپلے مونہوں کو
اب تک کچھ خبر ہونے نہیں پائی!

(۳)

کئی صدیوں سے، اپنی کشتیوں کو راکھ کر دینے کی رِیتیں۔۔۔
بیابانِ ہوس کی گرد میں گم ہو چکی ہیں۔۔۔!
ہمارے دستِ ناہنجار و ہرزہ کار و رعشہ دار سے
اب خنجر و شمشیر کب کے رُگر چکے ہیں۔۔۔
ہماری بے نکاحی، بے حمیت آرزوئیں
اَن گنت کشکول تھامے
غرب سے ''قرطاسِ اخضر'' کی گدائی کر رہی ہیں
یا کسی پوشیدہ ''ہریالے اشارے'' کی تمنائی!
خیالوں کے جنینِ ہفت ماہہ
اپنے، کشمکش کے برابر سر ہلاتے
اپنی پیلی سرد مُسکانوں کی کلیوں سے
ہمیں اب بھی لُبھاتے ہیں
یہ شش ماہے، یہ ستوانسے
ہماری کشتیوں کو، جن پہ سایہ ہے نہ کوئی بادباں ہے
بس ہنکائے جا رہے ہیں، اک سرابِ بے کرانی میں
ہمیں یہ بھولنا زیبا نہیں
ایسے سفینے
جلد یا پھر دیر سے لیکن بہ ہر صورت، بالآخر ڈوب جاتے ہیں
سرابوں سے جو بچ نکلیں تو پھر یہ ساحلوں پر ڈوب جاتے ہیں

''غبارے پھوٹ جاتے ہیں''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

دریچوں اور دروازوں پہ ہاتھی
ایستادہ ہیں
درونِ قصر
دربارِ شاہی جیسا منظر ہے
یہاں دربار لگتے ہیں
مگر شاہی محل ہے یہ نہ ہی دربارِ شاہی ہے
یہاں اقوامِ عالم کے نمائندے
بہم مل بیٹھتے ہیں اور
اپنے ملکوں کے اور عالم کے
مسائل پر
فروغِ مشورت کا اک ڈراما سا
رچاتے ہیں

بظاہر زندہ لفظوں، گرم لفظوں کے
غبارے
نمائندوں کے کھلے ذہنوں سے باہر
سقف تک پرواز کرتے ہیں
مگر ہر لفظ اوپر جاتے جاتے
سرد اور بے جان ہو کر نیچے گرتا
قومی ملکوں کے چیدہ، منتخب لوگوں کے بوٹوں کے تلے
نابود ہوتا ہے
غبارے پھوٹ جاتے ہیں

○

سو ہے یہ بھی آدمی

لکھتا'' نوائے وقت''میں گلزار چوہدری
عُنوان تھا عجیب ''سو ہے یہ بھی آدمی''
منظر کشی غضب کی تھی کالم نگار کی
مِرزا ادیب ،تاؔک، ندیم اور قتیؔل بھی
تحسین کئے بغیر کوئی بھی نہ رہ سکا

شہرِ زندہ دل میں مولانا صلاح الدین کو
ہم نے ہر موسم میں پایا خوش خراماں مال پر
میرے آداب عرض کہنے پر وُہ یُوں گویا ہوئے
کر کے لمبی واک تم ملتے ہو خاص و عام کو
پیارے صاؔبر، تم بھی ہو اہلِ طریقت جان لو
دل میں رکھتے ہو محبت اور خدمت کا مِشن
واقعی تم عصرِ حاضر کے ہو گڈ سمیرٹن'
ایسی فاضل شخصیت کو دیکھتا ہی رہ گیا
مجھ سے وُہ ''اردو کا پیدل آدمی'' کیا کہہ گیا

○

ضرورت

اقتدار جاوید

(لاہور)

لفظوں کو
شاعر کی ایسے ضرورت ہے
معنیٰ کو لفظوں کی جیسی!
حروفِ تہجّی نے جڑنا ہے
تو
لفظ بننا ہے
لفظوں نے جملے میں ڈھلنا ہے
جملے میں معنیٰ نکلنا ہے
معنیٰ نے
شاعر کے خوابوں میں
پہلا جنم لینا ہے!
جیسے
لمبے کناروں کی پٹّی
ضرورت ہے دریا کی
دریا
کناروں سے بھی لمبے رستے کا
راہی ہے
دریا کے پانی کو
کشتی کی جیسے ضرورت ہے
وہ
اس کے سینے کو چیرے
تلاطم بپا ہو
سمندر کی جانب لپکتا رواہو
لرزتی ہوئی روشنی کو
دیوں سے ابھرنے کی خاطر
دیوں کی ضرورت ہے
کہ
روشنی خود کو ارزاں کرے
روشنی سے خلا کو بھرے

سبز رستے کو
لوگوں کی جیسے ضرورت ہے
کہ
راستے کو وہ پامال کردیں
وہ پامال ہوتے ہیں
تب جا کے آباد ہوتے ہیں
بھرتے ہیں
لوگوں سے
لوگوں کی باتوں سے
باتوں کے رنگوں سے
دِل کی امنگوں سے!

اک دوسرے پر ہر ایک چیز کا منحصر ہونا
جیون کی پہلی ضرورت ہے
جیسے
کسی روح کو اک بدن کی
ضرورت ہے
مجھ کو
محبت بھری ایک لڑکی کی خاطر
تمناؤں سے خالی دِل کی
ضرورت ہے
لڑکی
مرے سُرخ دل کی طرح
خوبصورت ہے!!

معریٰ نظم

(حقیقت نگار منٹو)

غالب عرفان

(کراچی)

اک انقلاب تھا افسانہ کے جہاں میں مگر
فسانہ ہوتا ہے کیا یہ جہاں کو دکھلایا
نرالی سوچتی آنکھیں تھیں اس کے چہرے پر
تو سوچ سب سے الگ وقت سے کہیں آگے
اُسی کو جچتی تھی اس کے قلم کی بے باکی

اُسے سمجھنے میں ٹھوکر لگی زمانے کو
تو وہ زمانے کو ٹھکراتا آگے بڑھتا گیا
رواں تھا اُس کا قلم اور اسی روانی میں
قلم کو تیغ بنا کر جہاں سے لڑتا رہا
قلم کی نوک سے ریشم کے پردے چاک کئے
معاشرے کے سبھی زخم سب کو دکھلائے
کسی نے جنس زدہ کہہ کے اُس کو قید کیا
کسی نے بورژوا کا اُسے خطاب دیا
وہ سچّا آدمی تھا سچ لکھا تو لکھتا گیا
زمانے میں کہاں دم تھا کہ اس کا سچ سہتا

عجیب شخص تھا جس نے نفَس نفَس اپنا
فسانے کی طرح برتا تو پھر فسانہ ہوا
دراصل ایک حقیقت نگار تھا منٹو
جو اپنی ذات کے مانند تھا، نڈر بے باک

○

''طوفاں بدوش''

حسن عسکری کاظمی

(احمد فراز کی نذر)

(لاہور)

یہ تو نہیں کہا کہ پیمبر لگے مجھے
اوروں سے مختلف وہ سخنور لگے مجھے

حکمت کی سرزمیں پہ سکندر لگے مجھے
دل اس کا بحرِ غم کا شناور لگے مجھے

وہ جس نے زندگی کی حقیقت کو پالیا
فقر وغنا میں کیوں نہ قلندر لگے مجھے

موت وحیات پر ہے زمانے کی دسترس
کچھ بھی سہی زمانہ ہی داور لگے مجھے

جو ہو چکا ہے اس کی تلافی محال ہے
قسمت میں جو لکھا وہی بہتر لگے مجھے

چھینی گئی مکینوں کی آنکھوں سے روشنی
آسیب تیرگی میں گھِرے گھر لگے مجھے

گہرے کنوئیں میں مجھ کو گرائے گا ایک دن
بدلے ہوئے سے بھائی کے تیور لگے مجھے

دھندلا گئے ہیں چہرے پہ آنکھوں کے آئینے
رویا نہ تھا کہ اور بھی پتھر لگے مجھے

یہ زندگی خوشی سے عبارت کہاں رہی
طوفاں بدوش غم کا سمندر لگے مجھے

''میں کتنا خوبصورت ہوں''

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

میں کتنا خوبصورت ہوں
میں کتنا خوبصورت ہوں
مجھے افسانہ مت سمجھو، میں اک زندہ حقیقت ہوں
میں کتنا خوبصورت ہوں، میں کتنا خوبصورت ہوں
میرے نزدیک آؤ، غور سے دیکھو مجھے جانو!
مری آنکھوں میں جھانکو، دل میں اترو مجھ کو پہچانو
میں سر سے پاؤں تک دل ہوں، محبت ہی محبت ہوں
میں کتنا خوبصورت ہوں
میں جب آواز سنتا ہوں تمہاری جھوم جاتا ہوں
تمہیں محسوس کر کے زندگی کے گیت گاتا ہوں
میں شاعر ہوں کہ دیوانہ تمہاری ہی بدولت ہوں
میں کتنا خوبصورت ہوں
میں جب بھی دیکھتا ہوں تم کو یہ محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے میری نظروں میں کوئی موتی پروتا ہے
تمہارے حسن کا صدقہ ہوں، جلوؤں کی کرامت ہوں
میں کتنا خوبصورت ہوں
اگر تم ہو تو میں ہوں، تم نہیں تو کچھ نہیں ہوں میں
اگر تم خوبصورت ہو تو پھر سمجھو حسیں ہوں میں
مصور ہوں تمہارا میں، تمہاری ہی تو صورت ہوں
میں کتنا خوبصورت ہوں

O

جو ہوا آج نیویارک میں، وہ کاش نہ ہو!

جاوید زیدیؔ
(امریکا)

اب جو دامن میں لگی آگ
تو احساس ہوا
آخر ہم کون ہیں
یہ آج ہمیں سوچنا ہے
ہم وہی لوگ ہیں
جو اُنس کے لشکر لے کر
پار، دریائے نفرت کے اُتر جاتے تھے
کشتیاں اپنی جلا کر صاحب،
نئی دھرتی کے خس و خاک میں مل جاتے تھے
کیوں مقید ہیں ضرورت کی پناہ گاہوں میں
اور، ایمان لئے پھرتے ہیں بازاروں میں
دیکھئے، اُنس کی دیوار نہ گرنے پائے
نسلِ انساں کا احساس نہ مرنے پائے
آیئے مل کے کریں کچھ ایسا
کہیں محرومی کا احساس نہ ہو
دشتِ نفرت میں اُگی پیاس نہ ہو
جو ہوا آج نیویارک میں، وہ کاش نہ ہو!

O

(دشتِ ہجر، ساحلِ امریکہ پر، ایک انسانی المیہ کے بعد)

ماہیے

انوارفیروز
(راولپنڈی)

ہم نے تو نبھاہی ہے
تو نے دل میں
بس آگ لگائی ہے

کیا حال بنا ڈالا
بالم ہر جائی نے
ہم کو تو مِٹا ڈالا

اب چاندنی راتیں ہیں
تو دُور ہوا مجھ سے
پر تیری ہی باتیں ہیں

کب تک یوں رُلاؤ گے
بس اتنا بتا جاؤ
کب لوٹ کے آؤ گے

نہ ہم کو ستا ماہی
نہ اور جدائی دے
مکھڑا تو دِکھا ماہی

○

سائے

نورزمان ناوک
(تلہ گنگ)

میں نے اُسے چھوا نہ تھا
اُس نے مجھے چھوا نہ تھا

گزرے تھے بس قریب سے
ہم شومئی نصیب سے

سایوں کا اتصّال تھا
کیا لمحۂ زوال تھا

اک چشم اشتباہ میں
یوں نا گہاں راہ میں

نا معتبر سے ہوگئے
سائے ہمیں ڈبو گئے

○

ضبطِ گریہ

(بیگم کرشنا پال اور جوگندر پال جی سے ایک مختصر ٹیلی فونی مصاحبہ)

شہناز خانم عابدی

(کینیڈا)

میں جوگندر پال جی کے افسانوں کو ہمیشہ سے پسند کرتی آئی ہوں۔میرے شریکِ حیات عبداللہ جاویدان کو ایک حقیقت نگار کے طور پر بہت اونچا مقام دیتے ہیں مجھے ان کی تحریر کی شگفتگی بھی بہت اچھی لگتی ہے۔جوگندر پال جی کا کرشن چندر، منٹو، یہاں تک کہ بیدی سے الگ اپنا راستہ بنانا بھی حیرت انگیز ہے۔ایک دن عبداللہ جاوید کسی ادبی اجتماع کا ذکر کرتے کرتے جو سکھر سندھ میں ہوا تھا موضوع سے بھٹک کر مرزا ادیب کا ذکر کرنے لگے۔کہ ایک نشست کے بعد وہ مرزا ادیب سے ملنے کے لئے انہیں تلاش کرنے لگے۔تو پتہ چلا کہ شریکِ اجتماع میں سے کسی کو پتہ نہیں کہ وہ کہاں گئے ہوئے ہیں۔سکھر کا جڑواں شہر روہڑی تھا۔جاوید جب قریب کی ندی کی طرف نکلے تو حفاظتی فصیل کے باہر ندی کے قریب ایک چٹان پر مرزا ادیب اپنی دنیا میں مگن بیٹھے تھے۔جاویدان کے پاس پہنچ گئے۔بڑی شفقت سے ملے۔عمر کا بہت بڑا فرق ہونے کے باوجود وہ بڑی محبت کے ساتھ شعروادب کے موضوعات پر بزرگانہ انداز میں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتے رہے۔بعد میں جب خیال آیا کہ رات کسی کے ہاں چھوٹی سی نشست ہے جس میں ان دونوں کو بھی شریک ہونا ہے تو وہ یادگار ملاقات اختتام پذیر ہوئی۔مرزا ادیب کے بارے میں جاوید نے یہ بھی کہا کہ ابتدا میں بڑے عرصے تک ان کے نام کے ساتھ مرزا ادیب بی اے آنرز چھپا ہوتا تھا۔بعد میں اویس احمد ادیب کے نام سے تحاریر چھپنے لگیں تو ان کے نام کے ساتھ بی اے آنرز لکھا جانا بند ہو گیا۔دوسری باتوں کے علاوہ جاوید نے یہ بھی بتایا کہ جب جوگندر پال جی نے مرزا ادیب سے اپنی پہلی ملاقات میں اپنے افسانوں کی تعریف سنی تو اپنا سوئیٹر اتارا اور مرزا ادیب کو اپنے ہاتھوں سے پہنا دیا۔مرزا ادیب اتنے آدم بیزار اور نک چڑھے دکھائی دینے میں کامیاب تھے۔کہ جوگندر پال جی کی اس جسارت کی گنجائش نکلتی ہی نہ تھی۔جوگندر پال جی نیک کام کرنے میں جلدی کر گزرنے والے آدمی ہیں۔جوگندر پال جی کی یہ ادا جاوید صاحب کو بہت بھائی تھی۔اسی طرح ایک دن بقول کرشنا پال جی کے گھر کے سامنے چلتے چلتے ایک اخبار بیچنے والے لڑکے کے ہاتھ میں سو کا نوٹ دے دیا۔وہ حیران ہو کر پوچھنے لگا ''ساب کیا منگوانا ہے۔'' کہنے لگے ''جاؤ لے جاؤ'' وہ اس لڑکے کے چہرے پر وہ خوشی اور اس ری ایکشن کو دیکھنا چاہتے تھے جو اسے سو کا نوٹ ملنے سے حاصل ہوئی تھی۔وہ کہتے ہیں ''خوشیاں بانٹو، خوشحالی بانٹ کے کھاؤ۔

جیسا کہ میں نے کہیں اور بھی کہا ہے کہ وہ میرے گرو ہیں۔اگرچہ کہ انہوں نے میرے کسی افسانے میں کبھی کوئی اصلاح نہیں دی۔وہ لکھنے کے لئے تاکید کرتے رہے اور شاید ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ان معنوں میں وہ میرے ادبی رہنما اور گرو ہیں اور رہیں گے۔جب میں اپنے افسانوں کے مجموعے 'خواب کارشتہ' کے فلیپ پر ان کے الفاظ پڑھتی ہوں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے افسوس! ان سے ملنا نہیں ہو رہا ہے۔ٹیلی فون پر ان کی آواز سن کر خوشی بھی ہوتی ہے اور دکھ بھی۔درج ذیل عبارت قارئین چہارسو کی نظر ہے۔

اب کی مرتبہ خاصے طویل عرصے کے بعد میں نے فون ملایا۔ہمیشہ سکریتا جی فون اٹھاتی تھیں لیکن خلافِ توقع کرشنا پال جی دوسری جانب تھیں۔وہ بہت پیار سے بات کرتی ہیں۔سکریتا جی کے لئے بتایا وہ گھر پر نہیں ہیں بھوٹان گئی ہوئی ہیں۔جوگندر پال جی کو پوچھا تو انہوں نے بتایا ابھی کچھ دیر پہلے تھوڑی سی وہسکی لے کر سو گئے ہیں۔دو گھنٹے کے بعد اٹھیں گے۔میں نے جوگندر پال جی کی خیریت پوچھی تو کچھ دیر خاموش رہ کر بولیں ''میں ان کی حالت بیان نہیں کر سکتی۔ آئی ایم شارٹ آف ورڈس۔''

''آپ مجھ سے انگریزی میں بات کر سکتی ہیں اگر اردو میں مشکل ہو رہی ہو۔'' میں نے یقین دہانی کرائی۔

''میں جانتی ہوں تم ایک عرصے سے کینیڈا میں ہو، ہم انگریزی کو ذریعہ گفتگو بنا سکتے ہیں لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔''

''کوئی خاص رکاوٹ'' میں نے سوال کیا۔''

''سوچو شہناز! میں نے پال کے لئے اردو سیکھی۔میں نے اس کی کتابوں کو دیوناگری اسکرپٹ میں لکھا، اب میں یہ کیسے گوارا کر سکتی ہوں کہ ان کی ایک قدرداں سے اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں بات کروں۔''

''کرشنا جی نے میرے دل میں زبردست قدردانی ڈال دی تھی۔''

''کرشنا جی آپ کی باتیں سن کر میرا جی آپ کے پاؤں چھونے کو چاہ رہا ہے۔لیکن ٹیلی فونی رابطے کے دوران ایسا ممکن نہیں۔'' میں نے پورے اخلاص سے کہا۔

''بس بس بٹیا۔۔۔۔۔ مجھے اتنے اونچے سنگھاسن پر نہ چڑھاؤ جہاں سے اترنا ممکن نہ ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑیں ۔میں ان کی ہنسی سنتی رہی۔کتنی سچی ہنسی تھی۔عجیب لوگ، عجیب خاندان، بیٹی کم گو، ماں مخلص اور سچی، اور باپ مٹھی بھر بھر خوشیاں بانٹنے والا۔۔۔۔۔

باتوں باتوں میں ہم پھر جوگندر پال جی تک جا پہنچے۔اس ذکر کے ساتھ ہی ان کی گفتگو کو وقفے وقفے سے چپ لگ جاتی۔۔۔۔ایسا محسوس ہو رہا تھا

جیسے وہ اپنے رونے پر قابو پا رہی ہوں۔ کہنے لگیں'' پال نے لکھنا پڑھنا بالکل ترک کر دیا ہے۔۔۔ترک کیا کر دیا ہے وہ نہ تو پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ قلموں کی سیاہی کبھی کی خشک ہو کر رہ گئی ہے۔اب تو میں نے ان کی میز سے بھی سارے قلم اٹھا لئے ہیں۔ان کو جو کچھ پڑھ کر سناتی ہوں، تھوڑی ہی دیر کے بعد بھول جاتے ہیں۔''

کرشنا جی جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ میں پہلے بھی سن چکی تھی۔اتنے بڑے آدمی پر جو کچھ گزر رہا ہے وہ ڈھکا چھپا رہنے والا ہے بھی نہیں۔کرشنا جی نے یہ بھی کہا کہ پال سے ملنے کے لئے آنے والے اوران کو فون کال کرنے والوں کی اکثیریت ان سے کچھ نہ کچھ لکھوانا چاہتے ہیں۔لیکن اب لکھنا ان کے لئے ممکن ہی نہیں رہا ہے۔وہ طبعاً کسی کو ''نا'' کہنے والے آدمی نہیں ہیں۔ان حالات میں بھی وہ کسی کو منع نہیں کر سکتے ہیں میں نے محسوس کیا کہ اس باہمت خاتون کو مزید امتحان یا کرب میں ڈالنا ناشائستہ ہوگا سو میں نے اجازت چاہی۔

''رکیئے رکیئے! وہ اٹھ گئے ہیں میں آپ کی بات کراتی ہوں۔کرشنا جی نے یہ کہہ کر کہ کینیڈا سے شہناز خانم عابدی، فون جوگندر پال جی کو دیا۔ میں نے ان کی آواز سنی، محبت بھرا لہجہ''آداب''۔

میں نے بھی آداب کہا اور پوچھا'' آپ کیسے ہیں۔؟

کہنے لگے'' ٹھیک ہوں لیکن پڑھنا لکھنا نہیں ہوتا۔'' پھر مجھ سے پوچھنے لگے ''آپ کہانیاں لکھ رہی ہیں۔''

''جی کوشش کر رہی ہوں۔''

کہنے لگے'' آپ کی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔مجھے پسند آئی تھیں۔لکھنا بند نہ کریں۔۔۔لکھتی رہیں۔اپنے اندر کی تڑپ کو ختم نہ ہونے دیں۔ آپ بہت آگے تک جائیں گی۔'' پھر کہنے لگے'' آپ انڈیا آیئے، مجھ سے ملئے۔میرا تو پتہ نہیں کب جانا ہو جائے۔''اور کہنے لگے'' کہ آپ ویزے میں میرا نام بھی شامل کر دیجئے کہ مجھے ان سے ملنے جانا ہے۔''

''مجھے بھی آپ سے ملنے کی بے حد خواہش ہے۔میں انڈیا آنے کی کوشش کروں گی۔انشاءاللہ آپ سے ملاقات ہوگی۔کئی دنوں سے آپ سے بات کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔۔۔۔اس مرتبہ آپ سے بہت دنوں کے بعد بات ہوئی ہے''۔

کہنے لگے مجھے بہت اچھا لگا ''آپ سے بات ہوئی۔آپ فون کرتی رہا کریں۔''

''جی اچھا! میں آپ کو جلد ہی دوبارہ فون کروں گی۔اب آپ آرام کریں۔''

''کہنے لگے خدا حافظ'' میں نے کہا کیا کرشنا جی سے بات ہو سکتی ہے؟ وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھیں انہیں فون دے دیا۔

میں نے کہا۔''میں بے حد خوش ہوں جوگندر پال جی کی آواز سنی، ان سے گفتگو ہو گئی۔'' پھر میں نے ان سے کہا آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔'' جوگندر پال جی کی جن کتابوں کو اردو سے دیوناگری میں آپ لکھتی ہیں۔دیوناگری لکھائی ہوتی ہے یا ہندی میں ترجمہ۔''

کہنے لگیں'' میں نے پال جی کی کئی کتابوں کا رسم الخط بدلا ہے صرف لکھائی دیوناگری ہوتی ہے۔الفاظ بالکل ویسے ہی رہتے ہیں جیسے اردو میں لکھے ہوتے ہیں۔بلکہ پال جی تو مجھ سے کہتے ہیں''اس میں کوئی ہندی لفظ نہیں لکھنا۔''اور اگر کوئی ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس میں ہندی لفظ شامل کرنا لازمی ہو جائے تو وہ پورا جملہ تبدیل کر دیتے ہیں کہ اس میں کوئی ہندی لفظ نہیں لکھنا پڑے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتایا میں اپنی اورعبداللہ جاوید کی افسانوں کی کتاب کو دیوناگری میں چھپوا رہی ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔آپ سے مجھے بہت رہنمائی ملی۔

کرشنا جی کہنے لگی میں نے پال جی کی کہانیاں پڑھنے کے لئے اردو سیکھی ہے۔اور پال جی کی بڑی خواہش ہے کہ ان کے پوتے پوتیاں اردو پڑھنا لکھنا سیکھیں۔اور جب اپنے پوتے پوتیوں کو اردو پڑھتے دیکھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔

میں نے کرشنا جی کا شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔

''کہنے لگیں فون کرتے رہیئے گا۔۔۔۔''

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے، نہ رہے

''مایا کی محبت''

دنیا کے چھوتھے اور فرانس کے امیر ترین شخص 63 سالہ برنارڈ آرنلٹ اضافی دولت پر 75% ٹیکس ہونے کے باعث بلجیم کی شہریت لینے کا خواہش مند ہے۔بلجیم کے ایک وزیر نے اس خبر پر غور کرنے کی تصدیق کی ہے جبکہ برنارڈ آرنلٹ کا کہنا ہے کہ وہ بلجیم کی شہریت ملنے کے باوجود فرانس کی شہریت بھی اپنے پاس رکھیں گے۔

☆

''ورثہ''

''طوقِ غلامی''

سید ضمیر جعفری (●)

تاریخِ وفات

ایک بڑے تاجر کی قبر
مصرعۂ تاریخِ رحلت یوں ہوا
باعثِ اندوہ۔۔۔
انکم ٹیکس کے چالان تھے!
فائدے کے بھی بڑے نقصان تھے

بینڈ ماسٹر کی قبر

چپ چپاتی دنیا کو
موسیقی کی لہروں سے
نغمۂ نغمہ۔۔۔بھر گیا
سُر سنگھم سَر کر گیا
کتنا خوش ماحول شخص
آخری شب اک رئیس کی شادی میں
بینڈ بجاتا مر گیا

اپنے لیے

میں کہ تھا انگریزی کے طوقِ غلامی کا اسیر
زندگی میں بار ہا صادر ہوئی مرگِ ضمیر
تاجِ انگلستان کا گروی رہا اپنا بدن
میری کپتانی کی وردی تھی مرا پہلا کفن
جرمنی کی جنگ کے تمغے جو یہ سینے پہ ہیں
مستقل ذات کے دھبے دل کے آئینے پہ ہیں

شوہر نمبر ۳

کوئی دیکھے تو کفن میں اس کی چھب
بند آنکھوں سے چھلکتی ہے طلب
رخ پہ اطمینان۔۔۔یہ گُل رنگ ہاتھ
جیسے سویا ہو کسی زن غیر منکوحہ کے ساتھ

آٹھویں بیوی کی قبر پر

مرنا تھا مر گئی
کُوچ اچانک کر گئی
آٹھویں بیوی میری
سات کو جو مار کر زندہ رہی
عادت و اطوار تک
چوڑیوں سے لے کر چندن ہار تک
سات زوجاؤں کی وہ تنہا نمائندہ رہی
تا دمِ آخر مثالِ ماہ تابندہ رہی
مر گئی!
بُجھ گئے میری سسکتی آرزوؤں کے دیئے
آخری عورت تھی اس دنیا میں وہ میرے لیے

اصل کی نقل

اصل سنگِ مزار کی تھی جو سِل
ہو چکی گھل کے بارشوں میں وہ گل
کسی گرجے میں ہو تو ہو چسپاں
لوحِ محفوظ پر یہ نام و نشاں؟
اب کوئی دوسرا ہے دفن یہاں

☆

''او دیس کو کھانے والے''

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

(کراچی)

ہم نے نوجوانی میں اختر شیرانی کو پڑھا، تو یہ ہمارا شوق تھا اور اب اس ڈھلتی عمر میں اختر شیرانی کو پڑھتے ہیں، تو یہ ہماری ضرورت ہے۔ اختر شیرانی کے یہاں اولاً ہمیں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی صاف گوئی ہے۔ اختر سے پہلے (اور اس کے بعد بھی) شاعر اپنی محبوبہ کو کیسے کیسے ثقیل القاب سے یاد کرتے تھے دیکھیے۔ غیرتِ ناہید، یارِ طرح دار، نرگسِ شہلا، حسنِ دوعالم، دشمنِ جاں، ماہِ کامل، سراپا ناز وغیرہ۔ ان تراکیب سے اصل نام تو کیا، فریقِ ثانی کی صنف کا تعین بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ شاعر بے چارے ڈرتے تھے کہ کہیں اس کے بھائی آستینیں چڑھاتے ہوئے باہر نہ نکل آئیں۔ ایسے بدذوق ماحول میں اختر شیرانی نے اپنی محبوباؤں کے چہروں پر سے تشبیہات و استعارات کے پردے ہٹادیے اور انہیں ان کے ناموں سے مخاطب کیا۔ سلمیٰ، عذرا اور ریحانہ کو منظر عام پر لا کر اختر نے روایتی شاعروں کا استحقاق مجروح کیا، ان کے روایتی محبوب کا یا خود ان عفیفاؤں کا، قاری کو اس سے کوئی سروکار نہیں وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ ''خانہ برانداز چمن'' کے مقابلے میں سلمیٰ کو بلانا کتنا آسان ہے۔ اختر کی اسی حقیقت پسندی اور جذباتیت کی بنا پر اسے اردو کا کیٹس (KEATS) کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قدرتی مناظر کے حوالے سے نظیر، اردو کے ''ورڈز ورتھ'' کہلائے۔

اختر کی شاعری میں فلسفہ یا فکر کی تلاش بے سُود ہے۔ وہ ایک عملی اور کسی حد تک بے صبرے انسان تھے۔ وصل کے لیے زیادہ انتظار اور راتیں کالی کرنے کے بھی روادار نہ تھے اور اسی لیے دو تین متبادل ''حاضر اسٹاک'' میں رکھتے تھے۔ وہ دماغ سے نہیں، دل سے شاعری کرتے تھے اور دل کی آواز رقم کرتے تھے جو سننے اور پڑھنے والے کے دل سے ٹکراتی تھی۔ مثلاً ان کی نظموں کے یہ مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہوئے:

بہار و خواب کی تنویر مرمریں عذرا
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

سنا ہے سلمیٰ وادی میں آئی تھی، لیکن شاید اپنی دادی کے ساتھ!

چنانچہ انہیں مایوسی کے عالم میں کہنا پڑا:

دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر
شرما کے مسکرا کر، آنچل سے منہ چھپا کر
جاؤ نہ پیچھے پیچھے، دو باتیں کر لو جا کر
کھیتوں میں چھپ چھپا کر
سلمیٰ سے دل لگا کر

ایسا مکمل فلمی سین کسی اور شاعر کے یہاں بھلا کہاں ملے گا۔ اختر کی نظمیں ''آج کی رات''، ''اے عشق کہیں لے چل''، ''او دیس سے آنے والے بتا''، ''تاروں بھری رات''، ''وادی گنگا میں ایک رات'' اپنے پڑھنے والوں کو تصورات کی ایک ایسی حسین دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں سے وہ باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ باہر کی دنیا میں ہے بھی کیا؟ لوڈشیڈنگ، گرانی، آٹے کے لیے قطاریں، انسانی خون کی ارزانی، شکر کی پریشانی (بیرونی بھی اور اندرونی بھی)۔ پس، وہ اختر کے ساتھ خوابوں کی دنیاؤں اور ماہتابوں کے جزیروں میں اسی طرح مست رہتے ہیں جیسے ہمارے بیشتر حکمراں اور سیاسی رہنما وطن کا غم کھانے کی خاطر، وطن عزیز سے دور چلے جاتے ہیں۔

اختر کے کلام میں فکر و فلسفہ تو نہیں لیکن اس کی پیش بینی کی داد بہر حال دینی پڑے گی۔ مثلاً آج ہم آئے دن سنتے، پڑھتے اور دیکھتے ہیں کہ کوئی نوجوان جوڑا اپنے بزرگوں کی خواہشوں، ہوس زر اور جاہلانہ رسموں سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی پسند کی شادی کرتا ہے تو ہمارا غیرت مند معاشرہ اسے ''کاروکاری'' قرار دے کر کاروبارِ حیات ہی سے آزاد کر دیتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں والدین کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔ اختر نے برسوں پہلے اس موضوع پر ایک نظم ''نارضامندی کی شادی'' لکھی تھی جس کا ایک ایک لفظ آج کے حالات پر ''فِٹ'' آتا ہے نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

بغیر مرضی کی شادی بھی کیا قیامت ہے
یہ عمر بھر کے لیے اک مہیب لعنت ہے

آگے چل کر وہ اس شادی کی ''کیمسٹری'' یوں بیان کرتے ہیں۔

یہ کچھ ضروری نہیں جانبین راضی ہوں
یہ شرط ہے کہ فقط والدین راضی ہوں

نظم کا اختتام ان احتجاجی الفاظ میں ہوتا ہے۔

جواں روحوں کی خاموش قتل گاہ ہے یہ
خدا کے نام پہ سب سے بڑا گناہ ہے یہ

اختر پینے پلانے والے آدمی تھے۔ وہ معرفت کی نہیں، بوتل کی شراب پیتے تھے اور غموں کو ڈبونے کی غرض سے پیتے تھے۔ (اس وجہ سے پینے والوں کو شاید علم نہیں کہ غم تیرنا بھی جانتے ہیں۔) ایک جگہ اختر ساقی کی خوشامد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

غمِ زمانہ نہیں، اک عذاب ہے ساقی
شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

اسی غزل میں ساقی کو CONVINCE کرنے کی خاطر سے یہ

دلیل لائے۔

تُو واعظوں کی نہ سن میکشوں کی خدمت کر
گنہ ثواب کی خاطر، ثواب ہے ساقی

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اختر کی محبوبائیں فرضی تھیں۔ چلیے مان لیتے ہیں فرضی تھیں... کم از کم مونث تو تھیں۔ ایسا تو نہیں تھا کہ مرد، مرد کے فراق میں ٹسوے بہا رہا ہے۔ ان کی کسی ایسی ہی جینیوین یا فرضی محبوبہ کی شادی ہوئی تو انہوں نے اس ''سانحہ'' کا نوحہ لکھ کر جانبین کی مرضی کے حوالے سے خود اپنے نظریے کی تردید کر دی۔ یہ شادی نارضامندی کی نہیں تھی اس لیے ان کا یہ واویلا بلا جواز لگتا ہے کہ۔

سوگوار اپنی جواں موت کا ہونے دے مجھے
مسکرا تُو مگر اس حال پہ رونے دے مجھے

اختر شیرانی کی ایک نظم ''جہاں ریحانہ رہتی تھی'' مزاح نگاروں میں بہت مقبول ہوئی۔ سب سے پہلے اس کی پیروڈی سندباد جہازی (مولانا چراغ حسن حسرت) نے کی تھی جو ان کے فکاہیہ ہفت روزہ ''شیرازہ'' میں ۱۶ دسمبر ۱۹۳۶ء کو شائع ہوئی۔ نظم کا پہلا بند نذرِ قارئین ہے:

وہ اس کوچے کا لمبردار تھا آزاد رہتا تھا
بہت مسرور رہتا تھا بہت دلشاد رہتا تھا
بسانِ قیسِ عامر صورتِ فرہاد رہتا تھا
جو اس کو یاد رکھتا تھا وہ اس کو یاد رہتا تھا
اور اس دالان میں اس کا چچا رحمان رہتا تھا
یہی کوچہ ہے وہ ہمدم جہاں رمضان رہتا تھا

۲۰۰۰ء میں ہمارے ایک ممتاز مزاح گو سرفراز شاہد نے رمضان کو سلطانہ کے روپ میں کالج اسٹوڈنٹ بناتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا ایک بند بھی دیکھ لیجیے:

یہ پیروڈی بھی خوب چلی اور اب تک چل رہی ہے۔ اس کے تین سال بعد مزاح کے ایک اور محترم شاعر شوکت جمال نے اسے مجنوں کی صورت میں پیش کرتے ہوئے یہ معنی آفرینی کی ع یہی صحرا ہے وہ ہمدم جہاں دیوانہ رہتا تھا۔ یہ نظم بھی بہت پُر لطف ہے۔ بطور نمونہ ایک بند پیش خدمت ہے:

پھٹے کپڑوں میں پھرتا تھا مگر شاہانہ رہتا تھا
شرابِ عشق میں ڈوبا ہوا، رندانہ رہتا تھا

لبوں پر جس کے لیلیٰ کا سدا افسانہ رہتا تھا
سگِ لیلیٰ سے بھی جس شخص کا یارانہ رہتا تھا
وہی مجنوں لقب، وہ عاشقِ مستانہ رہتا تھا
صحرا ہے وہ ہمدم جہاں دیوانہ رہتا تھا

یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن ہمیں حیرت ہے کہ کسی مزاح گو کو آج تک ''او دیس سے آنے والے بتا'' کی پیروڈی نہیں سوجھی حالانکہ یہ اس طرح ہو سکتی ہے:

او ''دیس کو کھانے'' والے بتا
کس ''جال'' میں ہیں یارانِ وطن

آگے کا کام ہم مزاح کے شاعروں پر چھوڑتے ہیں لیکن چلتے چلتے ایک لطیفہ سن لیجیے۔ ایک جنرل صاحب کسی فوجی مَیس کے دورے پر آئے۔ معائنے کے بعد انہوں نے کیڈٹوں سے اپنے مختصر خطاب میں پوچھا'' آپ لوگوں کا کوئی مسئلہ؟'' ایک کیڈٹ نے کھڑے ہو کر کہا'' سر، ہمیں مَیس میں جو سُوپ دیا جاتا ہے اس میں ریت بہت ہوتی ہے۔'' جنرل صاحب اُس پر گرجے'' تم لوگ یہاں ملک کی خدمت کرنے آئے ہو یا سُوپ میں ریت کی شکایت کرنے؟'' نوجوان نے جواب دیا'' سر، ہم ملک کی خدمت کرنے کے لیے آئے ہیں، اسے کھانے کے لیے نہیں!''

- بقیہ -

اب تھانہ چل پڑے گا

''وہ کیا؟''

بوڑھے نے پوچھا۔

''اچھری پر کفن آدھا ڈالا جائے اور آدمی لعش ننگی رہنے دی جائے''

''یہ ٹھیک ہے''

بس کفن کے روپوں میں سے آدھے حولدار کو دیئے گئے۔

حولدار نے اوپر ٹیلی فون کیا۔

''صاحب بونی ہو گئی ہے۔ لگتا ہے تھانہ چل پڑے گا''

اُس کے بعد سے لے کر آج تک یہاں کی جوان لڑکیوں کے جسم ننگے ہیں گو انہوں نے کپڑے پورے پہنے ہوئے ہیں۔ یہاں کا ہر نوجوان جُرم کرتا ہے۔ پولیس چوکی کے بعد یہاں تھانہ بنا اور اب پولیس ہیڈ کوارٹر ہے چونکہ لڑکیوں کے بدن ننگے نظر آتے ہیں اور پولیس ہیڈ کوارٹر بھی ہے اس لئے تمام سیاسی و قانونی میٹنگیں یہاں ہوتی ہیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بوڑھا جو دن رات آسمان میں تکتا ہے، جس کا جسم اُس کا ساتھ چھوڑ رہا ہے اور جو دن رات اچھری کے جھونپڑے کے گرد گھومتا ہے اور موت کی دعا مانگتا ہے دراصل وہی نوجوان ہے جس کے گھوڑے نے اچھری کو گرایا تھا!۔

☆

ایک صدی کا قصہ
گورودت

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

جب بھی گورودت کا ذکر ہوتا ہے ایک معصوم سی چھبی آنکھوں کے سامنے اُبھر آتی ہے۔ اُداس، مغموم اور دل شکستہ سی ایک تصویر من کو برمانے لگتی ہے۔ خاک میں کیا صورتیں تھیں کہ پنہاں ہوگئیں۔ بہت سارے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ گورودت بنگالی نژاد تھا۔ بلاشبہ وہ بنگالی فراٹے سے بولتا تھا مگر تھا وہ کنڑ باشی۔ اُسکا اصلی نام وسنت کمار شوشنکر پڈکونے تھا۔ یہ نام ماں باپ کے نام کو جوڑ کر رکھا گیا تھا۔ ساؤتھ میں یہی روایت رہی ہے کہ بچے کا نام ماں باپ کے نام کو جوڑ کر رکھا جاتا ہے۔ گورودت پہلوٹھی کا بیٹا تھا۔ اُسکا باپ سرسوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ لوگ کنڑ باشی ہیں۔ گورودت کا جنم 9 جولائی 1925 کو بنگلور میں ہوا جو تب ریاست مدراس کا حصہ تھا۔ اب یہ کرناٹک کا دارالخلافہ ہے۔ اُسکے ماں باپ کرناٹک کے ایک گاؤں پنمبھ پور میں رہتے تھے۔ اُسکا باپ شوشنکر راؤ پڈکونے تعلیم وتدریس کے پیشے سے منسلک تھا۔ بعد میں اُس نے ایک بنک میں نوکری کرلی۔ اُسکی ماں وسنتھی پڈکونے ایک گھریلو عورت تھی۔ وہ خاصی پڑھی لکھی عورت تھی۔ وہ کہانیاں وغیرہ بھی لکھتی تھی۔ اُسنے کئی بنگالی ناولوں کا کنڑ زبان میں ترجمہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد اُس نے بھی تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ اُسکی عمر اُس وقت صرف سولہ برس کی تھی جب اُس نے گورودت کو جنم دیا۔ گورودت کے علاوہ اُس نے اور پانچ بچوں کو جنم دیا جن کے نام ششی دھر، آتما رام، دیوی داس، وجے اور للیتا ہے۔

گورودت کا بچپن تنگی ترشی کے عالم میں گزرا۔ اُسکے تعلقات باپ کے ساتھ کبھی خوشگوار نہ رہے۔ سب سے زیادہ اُسکے رشتے کے سوتیلا ماما کے ساتھ کشیدہ رہے۔ اُسنے اپنے بچپن کا بیشتر حصہ اپنی ماں کے چچیرے بھائی بال کشن کے ساتھ گزارا جسے سب لوگ بنک ماما کے نام سے جانتے تھے۔ بنک ماما مشہور ڈائرکٹر شیام بینگل کا چاچا ہے۔ وہ فلموں کے پوسٹر بنایا کرتا تھا۔ بنک ماما کی صحبت میں رہ کر وہ بھی آڑھی ٹیڑھی لکیریں کھینچا کرتا تھا۔ اُسکی بہن کا کہنا ہے کہ چودہ سال کی عمر میں جب اُسکی دادای دیا جلا کر سانجھ کی پوجا پر بیٹھ جاتی تھی تو وہ دیوار پر پڑنے والی دئے کی روشنی کے آگے اپنی اُنگلیوں سے طرح طرح کی چھبیاں بنالیتا تھا۔

ایک دن گورودت کو ایک حادثہ پیش آیا۔ اُسکی ماں نے ایک جیوتشی سے رجوع کیا تو اُسنے بتایا کہ وسنت کمار شوشنکر پڈکونے نام اُسکے لئے منحوس ہے۔ اُسی کے کہنے پر اُسکا نام گورودت شوشنکر پڈکونے رکھا گیا۔ جیوتش ودیا کے حساب سے یہ نام بڑا مبارک تھا۔ اسی بیچ گورودت کے والد کو برماشل کمپنی میں کلرک کی نوکری ملی تو اُس نے بنک کی نوکری کو خیر باد کہہ کے بوانی پور کلکتہ کا رخ کیا جہاں پر اُس کا دفتر تھا۔ گورودت نے اپنے اسکول کی تعلیم یہیں پر پوری کی۔ یہیں پر گورودت نے بنگالی زبان پر مہارت حاصل کی۔ 1940 میں جب اُس نے ممبئی کا رخ کیا تو اُس نے اپنے نام سے شوشنکر راو ہٹا کر صرف گورودت رکھا۔ دت سے لوگوں کو یہی بھرم ہونے لگا کہ گورودت بنگالی ہے۔

بنگال میں رہ کر گورودت نے ڈانس سیکھا۔ اُسمیں خداداد صلاحیتیں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔ کسی اُستاد کی رہنمائی کے بنا اُس نے طرح طرح کے ناچ سیکھے۔ ایک دن اُس نے بنک ماما کو ''ناگ ڈانس'' کرتے ہوئے چند تصویریں لینے پر آمادہ کرلیا۔ چند مہینے بعد اُسنے سرسوتی برہمنوں کے ایک اجتماع میں یہی ناگ ڈانس کیا جسے کافی پسند کیا گیا اور اُسے اس ناچ کے لئے پانچ روپے کا انعام بھی ملا۔

گورودت ایک ذہین طالب علم تھا اسکے باوجود وہ کالج نہ جا سکا۔ وجہ گھر کی مالی تنگی تھی۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے اُس نے روی شنکر کے بڑے بھائی اودے شنکر کے ''آرٹس ٹروپ'' میں حصہ لینا شروع کردیا۔ اودے شنکر المورا میں ''انڈیا کلچر سنٹر'' میں نوجوانوں کو ڈانس، ڈرامہ اور سنگیت کے سر تال سکھاتا تھا۔ 1941 میں سولہ سال کی عمر میں گورودت نے اس سنٹر میں باضابطہ داخلہ لیا۔ اُسے پچھتر روپیہ سال کا اسکالرشپ ملتا تھا جو اُن دنوں ایک کثیر رقم مانی جاتی تھی۔ گورودت 1944 تک اس سنٹر میں گیان حاصل کرتا رہا۔ ان ہی دنوں دوسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی جس کے سبب یہ سنٹر بند ہو گیا۔ گورودت نے مدھیہ پردیش میں ہی ٹیلفون آپریٹر کی نوکری حاصل کرلی مگر وہ زیادہ دن تک اس نوکری پر ٹک نہیں پایا۔ اُس کے والد کا تبادلہ بمبئی ہوگیا تھا۔ وہ بھی ایم۔ پی کو خیر باد کہہ کے بمبئی چلا آیا۔

بمبئی پہونچ کر بنک ماما نے اُسکے لئے ''پربھات فلم کمپنی'' میں نوکری ڈھونڈ کے رکھی تھی۔ اُسے تین سال کے معاہدے پر ملازم رکھا گیا۔ یہ فلم کمپنی پونے میں تھی۔ اس کمپنی نے فلم انڈسٹری کو وی۔ شانتا رام جیسا باصلاحیت ڈائرکٹر دیا تھا جس نے ''پربھات کمپنی'' کو الوداع کہہ کے ''کلا مندر'' کے نام سے اپنی فلم کمپنی کھولی تھی۔ پربھات کمپنی میں ہی گورودت کو دو دوست ملے جن سے آخری دم تک اُسنے اپنی دوستی نبھائی۔ یہ تھے دیو آنند اور رحمان۔ 1944 میں ہی اُس نے ''چاند'' نامی فلم میں شری کرشنا کا ایک چھوٹا سا رول ادا کیا۔ 1945 میں اُس نے وشرام بیڈیکر کی فلم ''لکھارانی'' میں ایک چھوٹا سا کردار نبھانے کے ساتھ ساتھ معاون ہدایت کار کا کام بھی کیا۔

1946 میں وہ مشہور ڈائرکٹر پی۔ ایل۔ سنتوشی کے ساتھ جڑ گیا۔ اُس نے اُسکی فلم ''ہم ایک ہیں'' میں معاون ہدایت کار کے ساتھ ساتھ ڈانس

ڈائرکٹر کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ڈائرکٹر پی۔ایل۔سنتوشی آج کے معروف ڈائرکٹر راج کمار سنتوشی کا والد ہے۔

1947 میں ''پربھات کمپنی'' کے ساتھ اُسکا معاہدہ ختم ہو گیا البتہ اُس کی ماں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے گورودت کو ''پربھات فلم کمپنی'' کے سی۔او بابوراؤ پائی کے ساتھ معاون کے طور پر لگوا دیا مگر کوئی فلم شروع نہ ہونے کی وجہ سے وہ دس مہینے تک اپنے ماٹونگا کے گھر میں پڑا رہا۔اُن ہی دنوں وہ لکھنے کی طرف مائل ہوا۔ اُس نے کئی کہانیاں انگریزی میں لکھیں جو The Illustrated weekly of India میں باضابطہ چھپتی رہیں۔یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے جب اُس نے ''کشمکش'' نام سے ایک کہانی لکھی جس کا بعد میں نام بدل کر ''پیاسا'' رکھا گیا۔

گیتا رائے سے ملنے سے قبل گورودت کی زندگی میں دو لڑکیاں آچکی تھیں۔پہلی کا نام وجیا تھا جو پونے کی تھی جسے وہ بھگا کر لے گیا تھا۔دوسری لڑکی سویما تھی جو حیدرآباد کی تھی اور جو اُسکے ماما کی بھانجی تھی۔یہ رشتہ ماں باپ کی مرضی سے ہونے والا تھا کہ گورودت نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔اسی بیچ ''پربھات فلم کمپنی نے بطور ڈانس ڈائرکٹر اُسکی خدمات حاصل کیں مگر اُنہوں نے اُس سے ایکٹر اور معاون ہدایت کار کا بھی کام لے لیا۔اسی دوران اُسکی ملاقات دیوآنند اور رحمان سے ہوئی جو سٹار بن چکے تھے۔دیوآنند سے دوستی کی ابتدا ایک دلچسپ واقعے سے ہوئی تھی۔ہوا یوں کہ دونوں پربھات فلم کمپنی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔اس کمپنی کا دھوبی ایک ہی تھا جو سب کے کپڑے دھوتا تھا۔ایک دن گورودت کی قمیض کسی اور کی قمیض سے بدل گئی تھی۔گورودت کے پاس ایک ہی قمیض تھی سو اُسے دھوبی کی طرف سے بدلے میں دی گئی قمیض پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔وہ جب ''ہم ایک ہیں'' کی شوٹنگ پر پہونچا تو دیوآنند بھی سیٹ پر موجود تھا۔دیوآنند نے اپنی قمیض جھٹ سے پہچان لی۔اُس نے گورودت کو الگ لے جا کر پوچھا کہ اُسے یہ قمیض کہاں سے ملی ہے کیونکہ یہ قمیض اُسکی ہے۔گورودت نے اُسے سارا ماجرا سنایا۔اس واقعے کے بعد دونوں گہرے دوست بن گئے۔دونوں ہم عمر تھے اور دونوں کے مزاج کافی حد تک آپس میں ملتے جلتے تھے۔دیوآنند نے گورودت سے وعدہ کیا کہ جب بھی وہ اپنی فلم کمپنی کھولے گا تو سب سے پہلے وہ اُسے چانس دے گا۔گورودت نے بھی دیوآنند سے وعدہ کیا کہ جب بھی وہ کوئی فلم بنائے گا اُس کا ہیرو وہی ہوگا۔

1947 میں ہی ''پربھات کمپنی'' ڈوب گئی۔گورودت بہ سلسلہ روزگار بمبئی چلا آیا۔بمبئی میں اُس نے مشہور ڈائرکٹر امیہ چکرورتی کے ساتھ معاون کے طور پر فلم ''گرلز سکول'' کی اور اُسکے بعد ''بمبئی ٹاکیز'' کی فلم ''سنگرام'' میں گیان مکھرجی کے ساتھ کام کیا۔دیوآنند کی فلم کمپنی ''نوکیتن فلمز'' کا طلوع ہوا تھا۔دیوآنند اپنا وعدہ نہیں بھولا تھا۔اُس نے اپنی پہلی فلم ''بازی'' کی ہدایت کی باگ ڈور گورودت کو تھما دی۔فلم خاصی کامیاب رہی۔

اسکے برعکس گورودت نے اپنا وعدہ وفا نہ کیا۔جب اُس نے اپنی فلم کمپنی ''گورودت فلمز'' کی داغ بیل ڈال دی تو پہلی فلم ''آر پار'' تھی جس کا وہ خود ہی ہیرو بنا۔اُس کی دوسری فلم ''سی۔آئی۔ڈی'' تھی جسکی ہدایت کاری کا ذمہ اُسنے اپنے اسسٹنٹ راج کھوسلہ کو سونپ دیا۔گو کہ اس کا ہیرو دیوآنند ہی تھا مگر گورودت نے اپنی ہدایت میں بننے والی ایک بھی فلم میں دیوآنند کو نہیں لیا جس کا دیوآنند کو آج تک ملال ہے۔گورودت اور دیوآنند نے مل کر دو کامیاب فلمیں بیک وقت بنائیں۔ایک تھی ''بازی'' دوسری ''جال''۔یہ سلسلہ شاید یوں ہی چلتا رہتا مگر دیوآنند کے بڑے بھائی چیتن آنند نے بیچ میں روڑے اٹکائے جس کی وجہ سے دیوآنند کو ایک وقت میں ایک ہی فلم پر اکتفا کرنا پڑا۔

''بازی'' کی فلم بندی کے دوران ہی وہ گیتا رائے سے ملا۔ ''بازی'' میں اُسنے فلم انڈسٹری کو کئی نئے چہرے دئے جن میں جانی واکر (کامیڈین) وی۔کے مورتھی (کیمرہ مین) ابرار علوی (رائٹر) قابل ذکر ہیں۔گورودت ہی وحیدہ رحمان کو حیدرآباد سے بمبئی لے آئے اور اُسے اپنے بینر تلے بننے والی فلم ''سی۔آئی۔ڈی'' میں بریک دیا۔چھریرے بدن والی سانولے رنگ کی یہ حسینہ فلمی پردے پر غضب ڈھا رہی تھی۔

قسمت گورودت پر پوری طرح سے مہربان تھی۔اُسنے 1954 میں ''آر پار'' 1955 میں ''مسٹر اینڈ مسز 55'' بنائیں جو بیحد کامیاب رہیں۔1957 میں گورودت نے ''پیاسا'' بنائی جو ایک شہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔اس فلم کے لئے گورودت دلیپ کمار کو ہیرو کے طور پر لینا چاہتے تھے مگر اُنہوں نے بوجہ مصروفیت گورودت کی پیشکش قبول نہیں کی۔اُنہوں نے ہی گورودت کو یہ رائے دی کہ وہ یہ رول خود کریں۔چناچہ وہ پروڈکشن کی ذمہ داریوں میں اُلجھے ہوئے تھے اس لئے خود یہ رول کرنا مشکل ہو رہا تھا بہرحال دلیپ صاحب کی شہہ پر گورودت نے وجے کا رول خود ہی ادا کیا۔یہ رول اُنکی زندگی کا ایک یادگار رول ہے۔فلم نے ہر طرف کامیابی کے ڈنکے بجائے۔اس فلم کی ایک تکلیف دہ بات یہ رہی کہ ساحر لدھیانوی اور سچن دیو برمن کی جوڑی ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔ہوا یوں کہ ''پیاسا'' کی کامیابی کے بعد ساحر لدھیانوی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ اُنکے لکھے ہوئے گیتوں کا کمال تھا جو ''پیاسا'' کے گیت اتنے مقبول ہوئے۔ایس۔ڈی۔برمن کو ساحر صاحب کی یہ بات بڑی ناگوار گزری۔اُسنے ساحر صاحب سے کہا کہ گیت کے ساتھ یہ سنگیت کا کمال تھا جو ''پیاسا'' کے گیت اتنے مقبول ہوئے۔اُنہوں نے ساحر صاحب سے یہ تک کہہ دیا کہ اگر اُنہیں اپنے قلم پر اتنا ہی ناز ہے تو وہ اپنا ایک گانا سنگیت کے بنا ہٹ کر کے دکھائے۔''پیاسا'' کے بعد سچن دیو برمن کے گانے پہلے کیفی اعظمی اور پھر مجروح سلطانپوری لکھتے رہے۔

''پیاسا'' کی کامیابی کے بعد گورودت نے فلم ''کاغذ کے پھول'' شروع کی۔یہ سینما اسکوپ میں بنائی جانے والی پہلی فلم تھی۔اس فلم کو

بنانے میں گورودت نے سب کچھ داو پر لگا دیا۔روپیہ پیسہ،رات دن کی کڑی محنت۔افسوس کہ فلم بری طرح ناکام رہی۔اس فلم کی ناکامی نے گورودت کو بری طرح توڑ کے رکھ دیا۔وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ اُسکے بعد اُس نے کسی بھی فلم کی ڈائرکشن نہیں کی۔

گورودت کی شادی 1953 میں مشہور گلوکارہ گیتا رائے سے ہوئی تھی جو بعد میں گیتا دت کے نام سے جانی جاتی تھی۔گیتا سے اُسکے تین بچے ہوئے۔دو بیٹے ترون دت اور ارون دت اور بیٹی نینا۔وحیدہ رحمان کو جب وہ ہندی فلموں میں لایا تو وہ فلموں سے نکل کر سیدھے اُسکے دل میں اُتر گئی۔وحیدہ کے آنے سے اُسکی ازدواجی زندگی تلخ ہو کر رہ گئی۔حالات اس حد تک کشیدہ ہو گئے کہ میاں بیوی الگ الگ رہنے لگے۔گیتا دت نے زندگی کی تلخی کو مے کی تلخی سے مٹانے کی کوشش کی مگر دار واُسکے درد کا مداوا نہ بن سکی۔وہ زندگی سے دور موت کے قریب پہنچنے لگی۔اسی بیچ گورودت نے فلم ''چودھویں کا چاند'' وحیدہ رحمان کو لے کر شروع کی۔اسکی ہدایت کی ذمہ داری ایم صادق کو سونپی گئی۔در پردہ گورو دت کی ہدایت میں ہی یہ فلم بن رہی تھی مگر نام ایم صادق کا ہی دیا گیا۔فلم نے باکس آفس کے سارے ریکارڈ توڑ دئے ابرار علوی سے اُن کا بڑا لمبا ساتھ رہا۔گورودت کی بیشتر فلمیں ابرار علوی نے ہی لکھیں۔جب وہ ''صاحب بی بی اور غلام'' کو بنانے کا من بنا رہے تھے تو گورودت نے ابرار علوی کو اس فلم کو ڈائرکٹ کرنے کے لئے کہا۔یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی۔اس فلم کو کئی اعزازات سے نوازا گیا۔مینا کماری کی ادا کاری کی بے پناہ تعریف کی گئی۔''بہاریں پھر بھی آئیں گی'' اُسکی آخری فلم تھی۔

گورودت کی زندگی میں کافی اُتار چڑھاو آئے۔''کاغذ کے پھول'' نے اُسے سڑک پر لا کر کھڑا کر دیا پھر بھی اُسنے ہمت نہیں ہاری۔وہ بس پیار کے ہاتھوں مار کھا گیا۔وحیدہ رحمان کو وہ جنون کی حد تک چاہتا تھا پر وہ اُسے اپنا نہیں سکتا تھا۔وحیدہ کی چاہ نے اُسے بلا کا مے نوش بنا دیا۔شراب ہی نہیں وہ سگریٹ بھی کثرت سے پیتا تھا۔ بعد میں اُس نے نیند کی گولیاں بھی لینی شروع کیں۔ابرار علوی گورودت کے اتنے قریب ہونے کے باوجود گورودت کے دل کی کیفیت کو کبھی جان نہیں پائے۔

دراصل گورودت اپنے دکھ کسی کے ساتھ بانٹتا نہیں تھا۔وہ اندر ہی اندر گھلتا رہا مگر اُس نے کسی کو اپنے درد میں شریک نہیں کیا۔اُسنے دو مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اُسے بر وقت اسپتال پہونچا کر بچا لیا گیا۔10 اکتوبر 1964 کو اُسے کوئی بچا نہیں پایا۔وہ اپنے لاکھوں کروڑوں پرستاروں کو اشکبار اور سوگوار کر کے اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔کہا جاتا ہے کہ اُس نے شراب کے ساتھ نیند کی گولیاں ملا کر پی لی تھیں۔کثیر مقدار میں نیند کی گولیاں لینے سے اُسکی جان چلی گئی۔کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ یہ خودکشی تھی۔وہ زندگی سے اسقدر مایوس ہو چکا تھا کہ اُسنے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لی۔گیتا بھی زیادہ دنوں تک جی نہیں سکی۔کثرت مے نوشی سے اُسکا جگر خراب ہوا تھا۔ایک شوخ اور چنچل آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔وہ بھی 1972 میں اکتالیس سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئی۔

''کاغذ کے پھول'' کی اُسکے مرنے کے بعد خوب پزیرائی ہوئی۔ فلمی نقادوں کے تجزیے کے مطابق یہ فلم وقت سے پہلے بنائی گئی تھی۔ایسی سنجیدہ اور حقیقت پسند فلم آج کے دور کی فلم تھی۔یہی وجہ ہے کہ آج جب بھی اس فلم کی نمائش ہوتی ہے تو سینما ہال تماشیوں سے بھر جاتا ہے۔اس فلم کی گنتی شہکار فلموں میں کی جاتی ہے۔یہ فلم پونا فلم انسٹی ٹیوٹ میں نوسیکھئے ڈائرکٹروں کو دکھائی جاتی ہے۔اس کی لائٹنگ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔وی۔کے۔مورتھی نے لائٹ اینڈ شیڈ کے امتزاج سے جو ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے اُس کی تعریف لفظوں میں ممکن نہیں۔گورودت کی فلموں میں فوٹوگرافی کی سحر کاری کے علاوہ گانے سیدھے بولوں سے شروع ہو جاتے تھے۔اُسکی فلموں کے گانے ہمیشہ صدا بہار رہیں گے۔گورودت جواں مرگ ہوگیا۔آج بھی جب گورودت یاد آ جاتا ہے تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ایسے ہونہار ڈائرکٹر بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔گورودت کی فلموں کی تفصیل یوں ہے۔

1۔آر پار	1955
2۔سی۔آئی۔ڈی	1956
3۔پیاسا	1957
4۔کاغذ کے پھول	1959
5۔چودھویں کا چاند	1960
6۔صاحب بی بی اور غلام	1962
7۔بہاریں پھر بھی آئیں گی	1964

بطور ڈائرکٹر

1۔بازی	1951
2۔جال	1952
3۔بازار	1953
4۔آر پار	1954
5۔مسٹر اینڈ مسز ۵۵	1955
6۔سیلاب	1956
7۔پیاسا	1957
8۔کاغذ کے پھول	1959

گورودت نے ادا کاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔اُسکی کامیاب فلموں میں ''آر پار''،''مسٹر اینڈ مسز ۵۵''،''پیاسا''،''کاغذ کے پھول''،''چودھویں کا چاند''،''صاحب بی بی اور غلام'' اور ''بھروسہ'' قابل ذکر ہیں۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

مُحبِّ گرامی گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

یہ امر فی الواقعی میرے لیے باعثِ فخر وانبساط ہے کہ آپ نے نہایت خلوص وخوشدلی کے ساتھ اپنے وقیع وموقر جریدے میں مجھ ناچیز کے لیے قرطاسِ اعزاز بہ اہتمام شائع فرمایا، اپنے بلیغ و بامعنی سوالوں کے وسیلے سے بالخصوص پاکستان کے ادبی حلقوں کو میرے فن وسوانحی کوائف سے بحسن وخوبی متعارف کرایا۔ محترمہ عطیہ سکندرعلی اور صاعقہ مقبول صاحبہ نے اعلیٰ درجے کی شعر فہمی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوئے ''کُلیاتِ راہیؔ'' سے نمائندہ غزلوں کا انتخاب پیش کیا اور جناب فاری شانے راقم کی شاعری کے بارے میں اکابرین ادب کے تبصروں، مضامین اور آراء کے معنی خیز اقتباسات پیش کیے۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
امید ہے آپ شگفتہ خاطر ہوں گے

غلام مرتضٰی راہیؔ (فتح پور، بھارت)

عزیز گرامی قدر گلزار جاوید،

اللہ آپ اور چہارسو کی عمر دراز کرے۔ آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا جواب عصر حاضر کی ادبی صحافت میں نہیں ملتا۔ جس معیار کو آپ نے رختِ سفر کی صورت میں اپنے شانوں پر اٹھایا تھا، وہ بفضلِ تعالیٰ ابھی تک قائم ہے۔ دو پڑوسی ملکوں کے درمیان دوستی کے لیے آپ کی سعی قابل ستائش ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو کا سیکولر کردار نبھانے میں آپ نے جو کوششیں کی ہیں، انہیں تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ سلامت رہیں۔

ستیہ پال آنند (یو۔ایس۔اے)

چہارسو بہار ہی بہار پیارے گلزار ہمیشہ (جاوید) رہیں۔ السلام علیکم۔

یہ ہوئی نا مزے کی بات آپ اپنے معمولات سے سرِ موانحراف نہیں کرتے۔ اب کے آپ نے راہیؔ صاحب کو قرطاسِ اعزاز کے ضمن میں جو ''صنعِ احترام'' کیا ہے ان کے دیکھے سے اقتباسات میں رونق آ گئی۔ آپ کے اس عمل میں اخلاص مندی اور عقل مندی کا جوہر ہوتا ہے۔ ڈرامے میں آپ کئی پتے کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ آپ کے قلم کو قدرت نے خوب شعر کاری عطا کی ہے۔ صرف شاعری ابھی نہیں دیکھی۔ وہ بھی ہو تو نکالیے۔ خطوط کا حصہ معلوماتی ہوتا ہے اس سے بہت کچھ پایا اور ڈھونڈا جا سکتا ہے کمال امرہوی مرحوم سے متعلق بقولے بہت جانکاری ہوئی تھی دیپک کنول کی تحریر سے کتنے ہی اور گوشے روشن ہوئے۔ فلم ''محل'' کمال امرہوی کی ہدایت کاری کی مرہونِ منت ہے۔ ''محل'' پائے کی تخلیق تھی اشوک کمار نے اداکاری کے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ باید دید۔ مدھو بالا کی اداکارانہ صلاحیتیں لائق صد توصیف اور موسیقی جی کو موہ لینے والی۔ غرض ہر شے موہ روپی۔ دیپک کنول نے اپنے کو لیے دیئے رکھ کر بات کی ہے یہی قرینہ ہے اس باب میں بات کا۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

عزیزم گلزار جاوید دعائیں۔

تازہ چہارسو میں راہی صاحب کا کلام اور پیام سب پسند آیا افسوس یہ ہے کہ اب تک ہم انکے کلام کے مطالعے سے محروم رہے۔ انکے کلام میں کئی خاص باتیں نظر آئیں، ایک تو زبان میں وسعت ہے اور کئی الفاظ مجھے نئے لگے جو نئے ہونے کے باوجود نفسِ مضمون کے مطابق موزوں ہیں۔ فکر میں گہرائی اور وسعت ہے۔ انکے کلام سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے شاعر تو بہت ہیں مگر انفرادیت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ آپکو جزا دے ایسے ماہرینِ فن سے روشناس کرانے کے لیے۔

تقریباً پورا رسالہ پڑھ لیا ہے، شاعری کا حصہ بھی اچھا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں عظمٰی صدیقی کی نظم اچھی ہے اور عبداللہ جاوید کی نظم تو خیر ہمیشہ اچھی ہوتی ہے ویسی ہی ہے نفسِ مضمون کی مناسبت سے اظہار کے لیے الفاظ کا انتخاب اور معانی کی گہرائی۔ باقی نظمیں بھی اچھی ہیں۔

افسانے کے حصے میں عذرا اصغر کا خاکہ اچھا ہے۔ یسین احمد کا افسانہ سب سے اچھا ہے۔ موضوع کے علاوہ افسانے کی ابتداء، ارتقا اور انتہا کامیاب ہے جیسے افسانے کو ہونا چاہیے۔ نجیب عمر کے افسانے میں بھی تھوڑا نیا پن ہے۔ پکڈنڈیوں سے گزرتا ہوا احسان مجید کا افسانہ مجھے ایک بہت ہی تلخ حقیقت کے زہر میں ڈبو گیا، بہت بڑی حقیقت ایک بکتے ہوئے ملک کی حقیقت، میں نے کراہ کر سوچا ہمارا کیا ہوگا؟ اور آنسو بہہ نکلے۔ اور شاہد جمیل کے افسانے نے واقعی اس آرزو کو دو چند کردیا کہ اب واقعی کچھ ہو جانا چاہیے۔ قیامتِ صغریٰ ہی صحیح۔ اب تو محسوس ہوتا ہے دعا کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا

دعائیں جانہ پاسکیں منافقت کے بوجھ سے
گماں یہ ہے کہ عرش پہ ہمارا انتظار ہے

تاج پوشی کے لیے جنت میں انتظار کر رہے ہیں یہ شعر میں نے بنگلہ دیش بننے کے بعد لکھا تھا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ خیال آفاقی کی نظم بہت اچھی ہے۔ حسب معمول ہوا کے دوش پہ بھی اچھا لگا۔

حمیدہ معین رضوی (لندن)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام ومسنون۔

''چہارسوٗ' میرے ہاتھ میں ہے اور غلام مرتضٰی راہی نمبر کا انتظار ختم ہوا۔ سر ورق بہت عمدہ ہے اور خوبصورت ہے، کیوں نہ ہو، میری جھلک نظر آتی ہے۔ یہ تو تھا مذاق مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک ورق کئی کئی بار پڑھ چکا ہوں اور آپ کو راہؔی نمبر نکالنے پر نہ صرف مبارکباد پیش کرتا ہوں بلکہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی راولپنڈی آنا ہوتو کم از کم ایک شام آپ کے ساتھ گزاروں گا اور گلے لگاؤں گا۔ چہارسو کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ صرف مشہور لوگوں پر نمبر نہیں نکالتا، صرف مشہور لوگوں پر کتابیں نہیں چھپواتا بلکہ وہ لوگ جو''پی۔ آر'' سے زیادہ ادیب وشاعر ہیں اُن کو بھی ڈھونڈ کر، ان پر بھی گوشہ نکالتا ہے۔ میں گلزار صاحب، آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا اسی طرح سے جنت کمارہے ہیں یا کوئی اور بھی دھندا ہے۔

سب مضامین راہؔی صاحب پر بہت عمدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ راہؔی صاحب کی تعریف میں جو بھی لکھا گیا ہے وہ سچ ہے اور مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ میں وہ سب کچھ لکھ نہیں پایا جو لکھنا چاہیے تھا۔ وہ اُردو زبان اُسکے تلفظ، لفظ کے مآخذ اور پھر ماخذ کے پیچھے جو گہرے معانی ہیں نہ صرف اُنہیں سمجھتے ہیں بلکہ شعر میں الفاظ کا چُناؤ منفرد کرتا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ''چہارسوٗ' اسی طرح دن دوگنی رات چوگنی ترقی پر گامزن رہے۔ آخر میں چہارسو کے دوسرے اراکین کا شکریہ بھی لازمی ہے۔ قاری شا،شعیب حیدر زیدی، عظمٰی رشید اور تنویر الحق کا نام خاص طور پر لینا ضروری ہے۔ اپنے کمپوزر کو بھی میرا اسلام کہئے اور عرض کریں کہ میری فارسی کی کتابت پر تھوڑا رحم فرمائیں۔

صفوت علی صفوت (امریکہ)

ادب کی بہار، میرے گلزار ہمیشہ خوش رہو۔

یوں تو میں ہر رنگ کے پھول اور اُس کی خوشبو سے لطف اُٹھانے کا قائل ہوں مگر''چہارسوٗ' اردو دنیا کا ایسا خوشنما پھول ہے جس کی رنگت، مہک اور تاثیر سب سے الگ، سب سے جدا اور سب سے مختلف ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ خدانخواستہ آپ یا چہارسُو سے تعلق نہ ہوتا تو میری زندگی کس قدر بے کیف ہوتی۔

آمد برسرِ مطلب غلام مرتضٰی راہؔی نمبر بہت لطف دے رہا ہے۔ آپ کا براہِ راست ہمیشہ کی مانند چٹکیاں بھی لے رہا ہے اور چٹکلے بھی سنا رہا ہے۔ راہی صاحب کی شاعری اور سوالات کے جوابات ایک مہذب اور بردبار انسان کا خاکہ پیش کر رہے ہیں۔ نظیر فتح پوری صاحب نے محبت کا سبق بہت محبت اور اپنائیت سے لکھا ہے۔ خیال آفاقی صاحب کا''سوری امریکہ'' نہ صرف اُن کے بلکہ تیسری دنیا کے ان گنت لوگوں کے دل کی آواز ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ جناب جہانگیر اشرف نے''وقت کا جبر'' اور محترمہ زاہدہ عابد حنا نے ''بکھرے لمحے'' میں دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ پروفیسر قیصر نجفی کرشماتی قلم کے حامل ایسے تخلیق کار ہیں کہ ہر طرح کی تحریر میں اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ عزیزہ رینو بہل کی کتاب''بدلی میں چھپا چاند'' پر اُن کا تبصرہ اختصار و اعجاز کا عمدہ شاہکار ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم''ہوا کے دوش پر'' ہر قسط میں قاری کو گرفت میں رکھنے کا خوب سامان کرتے ہیں۔ اس بار ڈاکٹر صاحب نے نجمہ کا قصہ کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کو اپنے دور کی نجمہ شدت سے یاد آنے لگے گی۔ دیپک کنول صاحب نے کمال امرہوی کے ساتھ اپنے وقت کی لاجواب ادا کارہ مینا کماری سے خوب ملاقات کرائی ہے۔ اور جناب آپ نے چھ+ ایک لکھ کر ڈرامے کا وقار تو بڑھایا ہی ہے زبان و بیان کے جوہر بھی خوب دکھائے ہیں۔ اس قدر چست اور بے ساختہ جملے آج کے دور میں کون تحریر کر سکتا ہے سوائے آپ کے!

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

محبی گلزار صاحب، سلام مسنون!

آپ کی عنایت سے چہارسُو کا تازہ شمارہ ملا مگر مجھے احساس ہوا کہ پرچہ غالباً بہت تاخیر سے نکلا۔ کیا مجلّہ ہر مہینے باقاعدہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ کئی مشمولات دیکھ لیے۔ ماشاءاللہ خوب ہیں۔ غلام مرتضٰی راہؔی پر عمدہ گوشہ آپ نے ترتیب دیا، راہی صاحب کی عمدہ اور معنی آفریں شاعری یقیناً اس کی مستحق تھی۔ صاعقہ مقبول نے ان کی شاعری کا اچھا انتخاب کیا ہے مگر بھائی یہ''چنیدہ'' کیا چیز ہے۔ فارسی میں''چنیدن'' نام کا کوئی مصدر میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کی جگہ ''چیدہ'' یا''منتخب'' کا لفظ مناسب رہتا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

پرچہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پڑھتے ہیں اور آپ کی ہمت کی داد دیتے ہیں۔ اللہ تعالٰی آپ کو اور چہارسو کو ہمیشہ صحت مند رکھے۔ اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ اس دفعہ افسانوں کا حصہ خاصا جاندار ہے۔ پڑھ کر لطف آ گیا۔ ''گوشہ غلام مرتضٰی راہؔی'' میں ان کی شخصیت اور فن پر مضامین قابل داد ہیں۔ سارا پرچہ آپ کی محنت اور ذہانت کا علمبردار ہے۔

شمشاد احمد (کراچی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام غلام مرتضی راہی وصول ہوا۔ گزشتہ چالیس سال سے امریکا میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے ایک حد تک برصغیر کے اردو منظر نامہ سے قدرے بے خبر رہا ہوں اس لئے راہی صاحب کے نام سے اور انکے کلام سے مختصراً واقفیت تو تھی مگر اس قدر تفصیل سے انکی شاعری اور انکے اسلوب سے آپ نے مجھے واقف کیا اس کے لئے میں چہارسو کا مشکور ہوں۔ حسب دستور آپکا''براہ راست'' واقعی براہِ راست ہے اور بامعنی سوالات

سے پُر ہے جسکے جوابات صاحب قرطاس اعزاز نے بہت اچھی طرح دیئے ہیں۔ راہی صاحب کے کلام سے غزلیں جو عطیہ سکندرعلی نے منتخب کی ہیں بہت پسند آئیں اس سے قاری کو انکے کلام سے عام آگاہی ہو جاتی ہے۔ ان پر لکھے گئے یوں تو سب ہی مضمون اچھے ہیں مگر ڈاکٹر منظور احمد کا ’’شہر ایسے بھی بس گئے ہیں‘‘ نے زیادہ متاثر کیا۔

یہاں میں آپ کا تحریر کردہ ڈرامہ ’’چھ+ایک‘‘ کا خاص طور سے تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ اس ڈرامے میں آپ نے جو زبان استعمال کی ہے اس نے ایک عجیب مزہ دیا۔ اب تو یہ زبان ہی بڑی حد تک کمیاب (متروک نہیں ہے) ہو گئی ہے۔ میرے اپنے بزرگ مغربی یوپی جسے کبھی روہیل کھنڈ کہا جاتا تھا، یہ زبان اور یہ محاورے استعمال کرتے تھے۔ ’’گوشت کے بچّے‘‘ کتنے لوگ اسے سمجھیں گے۔ اسکے علاوہ سارے کرداروں نے جو زبان بولی ہے اور مکالموں کا جو بے ساختہ انداز ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے تو اشرف صبوحی، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور ظفر نیازی کی یاد آ گئی۔ میں نے گزشتہ کئی سالوں میں ایسی چٹخارے دار کہانی کم ہی پڑھی ہے۔ انجام ضرور چونکا دینے والا تھا اگرچہ قاری سوچتا تو ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے مگر میرے اپنے بہت دور کے رشتہ داروں میں کئی دہائی پہلے بالکل یہی واقعہ ہو چکا ہے۔

دیپک کنول کا ایک صدی کا قصہ مجھ سمیت بیشتر قارئین کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ کمال امروہوی ایک ذہین ہدایت کار تھے اور مشہور خانوادے سے تعلق رکھتے تھے فلمی دنیا کو انہوں نے جو کچھ دیا ہے اسکا تذکرہ بہت خوب ہے۔

افسانوں کے حصے میں سب بڑے نام ہیں۔ عذرا اصغر، کشمیری لال ذاکر اور نیلم احمد بشیر قابل غور ہیں۔ مگر مجھے یٰسین احمد کا ’’چھاپ‘‘ اچھا لگا۔ احباب جس محبت اور توجہ سے ’’ہوا کے دوش پر‘‘ میری حوصلہ افزائی فرما رہے ہیں اُس کے لیے چہارسُو کے توسط سے شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ میرے خوابوں کی سرزمیں میر پور خاص کے قلم کاروں کی آپ جس طرح ہمت افزائی اور انکا کلام شائع کر رہے ہیں اس پر بھی مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ خدا ’’چہارسُو‘‘ کی شمع ہمیشہ روشن رکھے اس سے ہم جیسوں کو علم و ادب کی روشنی حاصل ہو رہی ہے اور اردو ادب کا شجر پھل پھول رہا ہے۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

گلزار صاحب، محبتیں۔

عیدی بروقت مل گئی تو عید کی خوشی دوبالا ہو گئی۔ شیر خرمے اور چہارسُو کا دو آتشہ خوب رہا۔ راہی صاحب کی شاعری کو کسی تعریف کی محتاج نہیں، لیکن ایک ہی جگہ فن اور شخصیت کے حوالے پڑھ کر سیری ہو جاتی ہے۔ عذرا اصغر کا افسانہ ’’خانقاہ‘‘ زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ وصال خان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنا مقصود تھا مگر اس میں وہ conflict نہ پیدا ہو سکا جس سے افسانے میں جان پڑ جاتی۔ یسین احمد کا افسانہ ’’چھاپ‘‘ ایک روایتی سا افسانہ لگا، اس کا اختتام قاری کو چونکانے میں ناکام رہتا ہے۔ نیلم بشیر ایک بے باک اور منجھی ہوئی افسانہ نگار ہیں۔ موضوع تو پرانا ہے لیکن برتاؤ میں تازگی ہے۔ ان کا افسانہ ’’در بارِ فن‘‘ بہت پسند آیا۔ نجم الحسن صاحب کا افسانہ آسیب بھی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی نسل کی تنہائی کا مسئلہ بہت چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ افسانے کی بنت خوبصورت ہے اور تحیر اختتام تک قائم رہتا ہے۔ نجیب عمر صاحب کا افسانہ سردرات کا گرم سفر بھی خوب ہے۔ بیان پر گرفت اچھی ہے۔ روایتی انا سے پہلوتہی نے افسانے میں جان ڈال دی ہے۔ رس رابطے میں ان کے خط کے حوالے سے میں نے انہیں ای میل بھیجی تھی، ہنوز جواب کا منتظر ہوں۔ نوید سروش صاحب سے شرمندگی ہے مگر ان کا پتہ مجھ سے کھو چکا ہے، وہ عنایت فرما دیں تو میں اپنی کتابیں انہیں بھیج سکوں۔ اس دفعہ نثر میں جاوید گلزار کا ڈرامہ بازی لے گیا۔ ڈرامے چھ+ایک میں جگہ جگہ آئینے رکھ دیئے ہیں۔ کیسے جابر اپنی ذات کے حوالے سے عمروں کی تفاوت کی اہمیت کو نظر انداز کرتا ہے اور پھر اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ڈرامے کی ایک خوبی کرداروں کی زبان پر توجہ ہے۔ جس معاشی اور معاشرتی پس منظر میں یہ ڈرامہ تحریر کیا گیا ہے، اس کے اعتبار سے کرداروں کی زبان بہت مطابقت رکھتی ہے۔ یہ ایک کہنہ مشق لکھنے والے کی نشانی ہے۔ ڈرامے کی طوالت بھی مناسب تھی۔ مبارک باد قبول کیجئے۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

محترم بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

تازہ شمارہ یقیناً پھر ایک بار آپ کی نگاہِ جوہر شناسی کی بدولت غلام مرتضٰی راہؔی کے قرطاس اعزاز سے مزین ہے اور بہت خوب ہے مجھے ان کے بارے میں بہت کم معلوم تھا لیکن ’’چہارسُو‘‘ نے ’’براہِ راست‘‘ کے ذریعے ان کے حوالے سے ان کی بہت ساری صلاحیتیں اپنے قارئین پر اجاگر کی ہیں۔ افسانے اس مرتبہ بہت سارے ہیں اور ان میں کچھ پسند بھی آئے۔ مثلاً ’’فیصلے کا کرب‘‘ (کشمیری لال ذاکر) ’’خانقاہ‘‘ (عذرا اصغر) اور ’’سردرات کا گرم سفر‘‘ (نجیب عمر)، نجیب عمر نے اپنا یہ افسانہ لکھنے کے بعد مجھے ٹیلیفون پر پڑھ کر سنایا تھا اور عنوان تجویز کرنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر سونپی تھی جو میں نے پوری کی۔ نجم الحسن رضوی کا ’’آسیب‘‘ یقیناً آغاز سے انجام تک اپنے عنوان کی طرح بھرپور سسپنس کا حامل تھا ویسے بھی وہ افسانے کی دنیا کے نامی گرامی ادیب ہیں۔ یٰسین احمد اس بار اپنی ’’چھاپ‘‘ میں کچھ متاثر نہ کر سکے اس قسم کے افسانے مختلف روپ میں تقریباً ۵۰ سال سے پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ فارمولا ٹائپ یہ افسانہ اُن کی عام روش سے اگرچہ ہٹ کر ہے مگر۔۔۔ ہاں! سید نصرت بخاری نے اپنے افسانے ’’موتی‘‘ میں اپنے فن میں ایک قدم آگے بڑھتے نظر آئے یہ اچھی علامت ہے لیکن اب بھی وہ پچھلی صف میں نظر آئے، تعجب ہے!

آپ کا ڈرامہ ’’چھ+ایک‘‘ خوب ہی نہیں بہت خوب ہے۔ اسپئیر پارٹس کی دوکان کرنے والے کی سوسائٹی اور اندر کے ماحول کو آپ نے سلیقے سے

اجاگر کیا ہے لیکن طوالت ڈرامے کی ڈرامہ پن کو متاثر کر رہی ہے۔ دیپک کنول نے کمال امروہوی اور مینا کماری کے عشق کو آخر تک پیش کر کے تاریخ فلم کا ایک ورق الٹا ہے۔ ویسے برسبیل تذکرہ میں ۱۹۷۳ء میں جب حیدرآباد (بھارت) میں تھا تو اس فلم کا 2nd Run بھی باکس آفس پر فل جا رہا تھا۔ کیا فلم تھی اور آخری رقص جس میں کانچ کی کرچیوں پر ناچتے ناچتے مینا کماری زخمی پیروں سے بھی تسلسل جاری رکھتی ہے۔ اب تک آنکھوں میں بسا ہوا ہے ایسا ہی رقص ''شعلہ'' میں بھی ہیما مالنی پر پیش کیا گیا تھا جو کامیاب رہا۔

غالب عرفان (کراچی)

برادرِ گراں قدر گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

میں چہارسو کی شروعات سے ہی اس کو ادباء شعراء کے متعلق سے ایک ایسا تاریخ ساز جریدہ سمجھتا ہوں جو اُس نیچر کا ہے کہ ان کے ناموں اور کاموں دونوں کو وسیع جگہ بلکہ وسیع تر جگہ دینے پر گویا مامور سا ہے۔ ایک خاص ادبی شخصیت سے ہر بار قرطاسِ اعزاز کے عنوان سے اتنا مواد جمع کر دیا جاتا ہے کہ جس سے وہ مہر و ماہ سا بہت روشن یا بہت سے افکار و خیالات کا مالک بوجوہ قرار پاتا ہے۔ لیکن ایک عیب یہ بھی اس جریدے کے ساتھ گویا اس معنی میں برابر چلتا آ رہا ہے کہ جو بھی خوب ہوتا یا ٹھہرتا ہے وہ بڑے مراکز کے ناموں اور کاموں سے ہی اپنا استناد کراتا ہے۔ چھوٹے مراکز کے بڑے ناموں اور کاموں سے نہیں۔ غلام مرتضیٰ راہی نے یقیناً اپنے آپ کو جدید ادب سے منوایا ہے۔ حفیظ جالندھری کے بقول:

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

رسالہ اپنے متنوع مندرجات کی رُو سے اتنا ذائقہ آمیز و ذائقہ خیز بن گیا ہے کہ بس گلزار جاوید زندہ باد ہی کہنا پڑتا ہے۔ اس جریدے میں غالب عرفان بھی ہے امین راحت چغتائی بھی ہے نورین طلعت عروبہ بھی اور حسن عسکری کاظمی بھی۔ غالب عرفان با کمال شاعر ہے اور میرا انتہائی دِلی دوست بھی۔ فیروز عالم کا اپنا ایک تماشا ہے اقبال کے نام کم گویا تصورِ اقبال بھی اور پھر نوید سروش بھی۔ خط بھی کیا لکھتا ہے کہ دل پکڑے رہیں اور شاعر و مدیر بھی کیا ہے کہ رسالہ پہچان کے بڑوں میں شامل ہے۔ چہارسو کے توسط سے تمام اہل قلم بالخصوص دیپک کنول اور محمود الحسن جیسے اساتذہ کو سلام و احترام۔

رب نواز مائل (کوئٹہ)

برادرم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

اس بار قرطاس اعزاز جناب غلام مرتضیٰ راہی کے نام ہے ان کا شمار استاد شعراء میں ہوتا ہے اور وہ خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔ غالب عرفان، امین راحت چغتائی، نورین طلعت عروبہ اور حسن عسکری کاظمی کی نعتیں اپنا ہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر، عذرا اصغر، یسٰین احمد اور نیلم احمد بشیر کے افسانے پسند آئے۔ کوثر صدیقی کے افسانچے ماہنامہ شاعر ممبئی کے جون کے شمارے میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا دوسرا حصہ بھی خوب ہے۔ نجیب عمر، شاہد جمیل، احسان بن مجید اور سید نصرت بخاری کے افسانے خوبصورت ہیں۔ فیروز عالم کی ہوا کے دوش پر حسبِ معمول خوب ہے اس بار دیپک کنول نے کمال امروہوی کی یادیں تازہ کی ہیں گلزار جاوید کا ڈرامہ ''چھ + ایک'' پڑھ کر مزہ آیا۔ مکالموں میں کیا بیساختہ پن ہے۔ شاعروں کی بھی کہکشاں آپ نے جمع کر رکھی ہے۔ کس کس کی تعریف کروں رسالے میں تمام مواد معیاری اور پڑھنے کے قابل ہے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید السلام علیکم۔

غلام مرتضیٰ راہی صاحب کا گوشہ مرتب کر کے آپ نے ایک اور ادبی معرکہ سر کیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں بعض سوالات کے جوابات سے ہندوستان میں اردو (موجودہ عہد) شاعری کا پیش منظر اور امکانات سامنے آئے ہیں۔ راہی صاحب نے جواب خوش گوار انداز میں اعتماد سے دیے ہیں۔ راہی صاحب کی شاعری کے مطالعے سے خوش گوار حیرت ہوئی۔

بات بڑھتی گئی آگے، مری نادانی سے
کتنا ارزاں ہُوا میں اپنی فراوانی سے

جو رکھا تھا زمین پر مرا پہلا قدم تھا
پڑا ہے چاند پر مرا اگلا قدم ہے

نیلم احمد بشیر کا ''چھاپ'' سچی کہانی معلوم ہوتی ہے کچھ اشارے حقیقت تسلیم کرنے کی طرف لے جاتے ہیں۔ نجیب عمر کا افسانہ ''سردرات کا گرم سفر'' آغاز سے اختتام تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے عذرا اصغر کا افسانہ ''خانقاہ'' میں ایک اہم مسئلے پر فن کی پختگی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ کوثر صدیقی کے ''افسانچے'' متاثر نہیں کر سکے۔ دیپک کنول کا مضمون کمال امروہوی (ایک صدی کا قصہ) ایک معلوماتی دلچسپ تحریر ہے۔ مینا کماری سے محبت کی کہانی بھی پُرکشش ہے۔

''چھ + ایک'' گلزار جاوید کا ڈراما تکنیکی اعتبار سے بڑا چست ڈراما ہے برجستہ جملے اور کرداروں کی پیش کش (انٹری) کو مہارت سے پیش کیا ہے۔ ڈرامے کی یہ خوبی ہی تھی کہ میں ڈراما پڑھتے ہوئے اُسے اپنے ذہن پر فلم کی طرح چلتے دیکھتا رہا۔ مزا آ گیا۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کی قسط نمبر ۱۳۔ شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج میرپور خاص میں گیارہویں جماعت میں داخلے، کالج کے ابتدائی دنوں، اساتذہ اور طالب علم ساتھیوں کو محبت سے یاد کیا ہے۔ نجمہ شیخ سے مقابلہ اور نقاب پوش طالبہ کی کہانی بھی دلچسپ ہے یہ قسط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ قسط میں نے کچھ اساتذہ کو کالج

کے اسٹاف روم میں بلند خواندگی کے ساتھ سنائی وہ بھی بہت لطف اندوز ہوئے۔
پروین کمار اشک، غالب عرفان، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ، انوار فیروز، نسیم سحر، سید سعید نقوی، فیصل عظیم، کرامت بخاری، ماہر اجمیری، ندیم ہاشمی، عارف شفیق، تصور اقبال اور شائستہ سحر کی غزلیں اپنی لفظیات اور اسلوب کے حوالے سے منفرد ہیں۔ کچھ غزلوں میں کلاسیکی رنگ جدید انداز میں نظر آتا ہے۔ آصف ثاقب کی غزل کچھ مختلف نظر آئی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ شاعر اپنے ماضی کے حسین رنگوں سے حال کو آباد کر رہا ہے۔ عبداللہ جاوید (غبارے پھوٹ جاتے ہیں) جاوید زیدی (ڈی این اے) نور زمان ناوک (نارسائی کا نوحہ) شہاب صفدر (گیاری) زاہدہ عابد حنا (بکھرے لمحے) یہ نظمیں ہمارے ارد گرد کے حالات اور عصری تقاضوں کی تصویریں ہیں جس سے احساس شعر کا معاشرے کے مسائل کے متعلق سوچنے کے روّیوں کا علم ہوتا ہے۔ ''رس رابطے'' میں شامل خطوط احباب سے ملاقات کا حسین ذریعہ ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

مدیر محترم، سلام و رحمت۔
ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ موصول ہوا جو جناب غلام مرتضیٰ راہیؔ کے قرطاس اعزاز سے مزین و مدون ہے۔ ادارۂ چہار سو نے اس شمارے کو منظر عام پر لا کے گویا اک اور سنگ میل طے کر لیا ہے جبکہ اس سے قبل گلزارؔ صاحب (متعلقہ فیڈ بیک کسی باعث شامل نہیں ہو پائی) اور محترمہ کشور ناہید (متعلقہ شمارہ غیر متوقع طور پہ بہت تاخیر سے ملا تھا) کے قرطاسِ اعزاز بھی اپنی تمام تر ترتیبی و تدوینی اوصاف و خصائص کے ساتھ قارئین و ناقدین اور ادبی و تہذیبی حلقوں سے اعترافِ فن کے حوالے سے بہت سی داد و تحسین بھی سمیٹ چکے ہیں کہ بصورتِ قرطاسِ اعزاز کارہائے نمایاں کے سبھی معترف ہیں کیونکہ اس کے توسط سے ایسی ادبی و تہذیبی شمعیں روشن ہو رہی ہیں جن کا اُجالا آنے والے وقتوں میں بھی علم و ادب کے رسیا و دلدادہ ذہنوں کو منور کرتا رہے گا اور تحصیل علم کے لیے جستجو و لگن کے متنوع جہتیں کشادہ ہوتی رہیں گی۔ خوبصورت سچ تو یہ ہے کہ ''چہار سو'' نے دائمی شہرت و ابدی مقبولیت کے سارے سامان ساتھ ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔۔۔!
''چھ + ایک'' نہایت اہم معاشرتی و سماجی موضوع پہ محیط ڈرامہ ہے جسے آپ نے مشاقانہ کردار نگاری، عمدہ جزئیات نگاری، برجستہ مکالموں اور نسائی آگہی سے بہت خوب پھیلایا ہے اور حیرت آمیز انداز سے سمیٹا ہے۔۔ سہواً تو کچھ بھی ممکن ہے، میری تخلیق پر نام کا درج نہ ہونا بھی اسی کا حصہ ہے آپ جیسے مناسب خیال فرمائیں۔ مختصراً وضاحت کر دیجیے اور چوتھے، پانچویں قطعے کے تیسرے مصرعوں کو درج ذیل تصحیح کے ساتھ پڑھا جائے تو احسان ہوگا۔

مصرعہ ہر ایک شوخیِ گفتار سے سجا

اور

محفل مشاعرے کی ہو رونق وُہی تو تھے

شگفتہ نازلی (لاہور)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیم!
تازہ شمارے میں غلام مرتضیٰ راہی کے لیے نیاز فتح پوری کی نظم ''محبت کا سبق'' کی دو اصطلاحیں بہت ہی خوب ہیں۔ سوچ لمحے اور غزل مسکن۔
راہیؔ کے میرؔ و غالبؔ سے جڑے رہنے کی جو بات کی گئی اس کی وجہ غالباً یہ کہ ان کے بچپن میں گھر کا ماحول جہاں عشقِ مجازی سے زیادہ عشقِ حقیقی کی تلاش رہتی تھی اور یونیورسٹی میں چاند ستارے جیسے استاد میسر آئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ریسرچ اسکالرز میں جب راہیؔ نے بشیر بدرؔ کا نام دیا تو بات سمجھ آئی کہ بدرؔ کی شاعری کا منفرد لہجہ کہاں تیار ہوا۔ راہیؔ سے متعلق مضامین فکر انگیز، ان کی شخصیت کے پرت کھولتے ہوئے۔ ان کی وساطت سے اردو کے ایک بڑے شاعر کو جاننے کا موقع ملا۔ محترم غالب عرفان کی حمد کا یہ شعر خوب ہے۔

ہم اپنی مرضی کے آپ مالک سہی، عمل کی ہر ایک رہ پر
ارادے کی بے پناہ قوت بھی اسی کی قدرت پہ ہی ٹکی ہے

کشمیری لال ذاکر کا ذکر تو سنا تھا لیکن ان کی تخلیق دیکھنے کا پہلا موقع ہے۔ اور یہ ماننا پڑا کہ وہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔ دل اور دماغ کی جنگ پر تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن اس کے درمیان ''میں'' جسے ذاکر ویٹو کہتے ہیں۔ یہ اچھوتا خیال کہیں اور نہیں دیکھا۔ ''خانقاہ'' عذرا اصغر کا افسانہ حسب حال ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس راہ کے اکثر مسافر دنیادار ہوتے ہیں۔ یٰسین احمد کی ''چھاپ'' لگانے والے میں بھی دم ہونا چاہیے وگرنہ اکثر نصیحتیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے کہا گیا کہ قول و عمل کا تضاد، شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ جب کسی کی محنت چرالی جائے تو ''دربارِ فن'' جیسا افسانہ تخلیق پاتا ہے۔ نجم الحسن رضوی کا ''آسیب'' بچھڑے ہوئے اپنوں کی یادیں کسی کو آسیب تک بنا دیتی ہیں۔ آخری پیراگراف جہاں قاری یہ دیکھتا ہے کہ ارشد بھی اُس آسیب کی معیت میں آسیب ہوتا جا رہا ہے۔ افسانہ نگار کی مہارت کا بین ثبوت ہے۔
''روشنی کی طلب'' میں احسان بن مجید نے بتایا کہ اندھیرا بڑے کام کی چیز ہے اور روشنی کرنا کارِ سرکار میں مداخلت جبکہ اندھیرے کا مستقل علاج کرنے والا موجد تو واقعی سزا کا حق دار ہے۔ ایک بھرپور طنز۔ سید نصرت بخاری کا ''موتی'' کتّے کی وفاداری کا نیا پہلو۔ معاشرے کی کڑوی سچائیوں کا پُر اثر احوال۔ خیال آفاقی کی نظم ''سوری امریکہ'' ایک غیر معمولی نظم ہے خصوصاً ٹیپ کے بند کا آخری شعر

بتانِ عصرِ حاضر کی قدم بوسی مبارک ہو
رہینِ حجرِ اسود کو صنم بوسی مبارک ہو

تشنہؔ بریلوی نے اپنے زورِ بیان سے ہمیں کانپور بلکہ پرانے کانپور کی سیر کرا دی۔ سرشار صدیقی اسے یقیناً پسند کریں گے۔ جب آتش جوان تھا۔

دیپک کنول نے کمال امرہوی کا تفصیلی ذکر کیا۔شخصیت سے ہٹ کر وہ فنکار بہت عظیم تھا۔

نجیب عمر (کراچی)

گلزار بھائی، آداب۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی چہارسو بھرپور ہے اور ہمیشہ کی مانند اس بار بھی براہِ راست سے ابتدا کی۔گذشتہ دو شماروں میں گلزار صاحب اور کشور ناہید صاحبہ سے آپ کا مکالمہ کافی مصالحہ دار تھا اس لیے اس بار اُتنا مزہ نہ آسکا۔چہارسو میں کشمیری لال ذاکر جی کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔اُن کا افسانہ مختصر ہونے کے باوجود پُر تاثیر ہے۔عذرا اصغر ہمیشہ سے میری پسندیدہ افسانہ نگار ہیں اس بار بھی اُن کا افسانہ خوب ہے۔یسٰین احمد کا چھاپ، نیلم احمد بشیر کا در بار فن، نجیب عمر کا سردرات کا گرم سفر پڑھ کر آج کے افسانہ نگار کا اپنے حالات سے گزار رہنا بہت اچھا لگا۔چاروں افسانے دلچسپ اور معنیٰ خیز ہیں۔ایک نشانی اور پڑھ کر دکھ ہوا کہ اس کہانی میں معاشرے کا وہ گھناؤنا رخ دکھایا گیا ہے جسے کوئی بھی مہذب انسان پسند نہیں کرے گا۔

کافی دن بعد چہارسو میں آپ کی کوئی تحریر چھ + ایک پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔دلچسپ، برمحل اور برجستہ مکالموں کے باعث یہ ڈرامہ یادگار بن گیا ہے جسے میں آپ کے تحریر کردہ ڈراموں میں اوّل نمبر دینا چاہوں گی۔''ہوا کے دوش پر'' خوب جا رہا ہے۔فیروز عالم صاحب قاری کو مضبوطی سے تھامے ہوئے گزرے زمانے کو دلچسپی سے بیان کر رہے ہیں۔دیپک صاحب نے جناب کمال امروہوی اور مینا کماری کے حالاتِ زندگی سے خوب متعارف کرایا ہے۔ اگلی بار دیکھئے کس ہستی سے ملاتے ہیں۔

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔اس بار آپ نے غلام مرتضیٰ راہیؔ کا گوشہ شائع کیا ہے اور سرورق ان کی تصویر ہے۔بلاشبہ غلام مرتضیٰ راہی عہدِ حاضر کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔میں ان کا کلام رسالوں میں پڑھتا رہتا ہوں۔ان کے کلام میں تہہ داری پائی جاتی ہے۔حصّہ نظم وغزل معیاری ہے۔خیال آفاقی کی نظم ''سوری امریکہ'' نے بہت زیادہ متاثر کیا۔غالب عرفان کی حمد اور امین راحت چغتائی کی نعت بہت پسند آئی۔کوثر صدیقی کے افسانچے عمدہ ہیں۔

صابر عظیم آبادی (کراچی)

محترمی۔آداب

چہارسو کا وہ شمارہ جو کشور ناہید سے متعلق ہے بذریعہ ای میل ملا۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ کشور ناہید سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں اور وہ بھی مجھے جانتی ہیں۔وہ ہمارے عہد کی ممتاز ومنفرد شاعرہ ہیں۔ایک بے باک اور حقیقت پسند کسی نے ان کو زمین کی بیٹی کہا۔کسی نے نئے زمانے کی برہمن کسی نے برف کی مانند۔۔۔یہ سب صحیح ہوسکتا ہے لیکن میں توشمیم حنفی کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ کشور کی ہر سانس میں تازگی ہے۔نئی زندگی ہے۔پاکستان جیسے اسلامی معاشرہ میں کشور ناہید جیسی حق پرست اور بے باک شاعرہ کا ظہور پذیر ہونا قدرت کی ایسی دین ہے جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے لیکن یہ بھی ہے کہ زندگی اور تازگی کا احساس بھی وہیں ہوسکتا ہے جہاں حبس ہو گھٹن ہو۔چاروں طرف جب سب خیریت ہوتی ہے تو شعر وادب بے خیریت ہوجاتے ہیں۔ایک بار سردار جعفری نے مجھ سے کہا تھا اور یہ بڑی حد تک سچ بھی ہے کہ عمدہ ادب اکثر متضاد اور ناہموار حالات میں پیدا ہوتا ہے۔پتھر میں گلاب کھلتے ہیں اور کانٹوں میں خوشبو پیدا کرتے ہیں کہ آخر وہ بھی تو بقول جوش:

''پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا''

کشور کی شاعری میں تانیثیت سے قطع نظر بے باکی سے بھی ہٹ کر جو سماجی وابستگی اور فکری بلوغیت ہے وہ خواتین میں کیا مردوں میں بھی کم سے کم نظر آتی ہے ایک بے نام سی آفاقیت جھانکتی رہتی ہے اس لیے کہ کشور کی عالم انسانیت پر نظر رہتی ہے اسی کے درمیان سے تانیثیت جھانکتی ہے تو وہ متاثر کرتی ہے ورنہ اکثر کے ہاں غیر منطقی سی لگتی ہے۔کشور ناہید ہمارے عہد کے لیے ایک عطیہ ہیں، ایک تحفہ ہیں۔کاش ایسے دو ایک تحفے ہمیں ہندوستان میں ملے ہوتے۔یوں تو ادب میں عورت ہی عورت ہے لیکن کشور ناہید کہاں؟ ہمیں آج ایک نہیں، دو نہیں کئی درجن کشور ناہید کی ضرورت ہے۔میں ان کی خوبی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں اور ان کی خدمات کو سلام۔

علی احمد فاطمی (الہ آباد، بھارت)

برخوردار گلزار جاوید۔جیتے رہو، خوش رہو۔

تم سے فون پر بات ہوچکی ہے تم سوچ نہیں سکتے کہ ستمبر، اکتوبر کے شمارے میں اپنا خط نہ دیکھ کر کتنی حیرت ہوئی۔میری کشور سے بچپن کی شناسائی ہے یا نوجوانی کی سمجھ لو۔میں صرف اُس کی دوست ہی نہیں مداح بھی ہوں اور پورا پاکستان اس بات سے واقف ہے، سو میں سوچتی ہوں کہ لوگ کتنے حیران ہوئے ہونگے اس شمارے میں میرا خط نہ پا کر۔بہرحال اب چھوڑو۔رسید میرے پاس ہے آج پوسٹ آفس جا کر سب معلوم کروں گی۔اس خط میں کیا لکھا تھا اب تو بھول بھی گیا مگر اتنا ضرور کہا تھا کہ کشور کی صاف گوئی کی میں ہمیشہ سے معترف ہوں اس کے بعد آنے والی شاعرات کو ''بات'' کرنے کا حوصلہ اُس نے دیا۔یوں بھی اُس نے خواتین کے لیے بہت کام کیا ہے۔اس کی صاف گوئی اس کی شاعری اور اُسکی شخصیت دونوں میں جھلکتی ہے۔اس نے یہ پُر خار راستہ اپنا کر کتنی تکالیف اُٹھائیں میں خوب جانتی ہوں۔فیض کے دو مصرعے اس کی زندگی کی جدوجہد کے حوالے سے کوٹ کرتی ہوں۔

''اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری''

تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سر بازار

شبنم شکیل (اسلام آباد)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

کشور ناہید تقریباً نصف صدی سے اردو ادب کی بے لوث خدمت کر رہی ہیں ان پر چہارسو کا ''قرطاسِ اعزاز'' مخصوص کر کے آپ نے وہ قرض ادا کیا جو ان کا ہم پر چلا آ رہا تھا وہ طویل عرصہ سے ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا'' کئے بغیر اردو ادب کی خدمت کر رہی ہیں لیکن ان کو ابھی تک وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ حقدار ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے خواتین پر ہونے والی زیادتیوں اور اُن کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہی ہیں اس لیے وہ لیے زمین کا گز بنے تمام دنیا میں گھومتی رہتی ہیں اُن کی یہ کوششیں لائق صد ستائش ہیں ایسے ہی لوگوں کے لیے اقبال نے کہا تھا:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

سرور انبالوی (راولپنڈی)

گلزار جاوید جی! سلام و تحیات

جولائی، اگست کا ''چہارسوٗ'' ملا۔ دیگر ادبی جرائد سے ہٹ کر اس میں انفرادیت ''قرطاسِ اعزاز'' ہے۔ کشور ناہید جی سے ملاقات ہوئے ''صدیاں'' بیت گئیں۔ انہوں نے انٹرویو میں کہا ہے کہ ''اب میری عمر بہتر سال ہے'' ۲۷ سال کی کشور ناہید سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں اس کشور ناہید کو جانتا ہوں جو تصویر آپ نے ٹائٹل پر شائع کی ہے۔ اچھا کیا آپ نے ۲۷ سال والی کشور ناہید کی تصویر شائع نہیں کی۔ سب سے پہلے میں ''براہِ راست'' پڑھتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے ''ناہید صاحبہ نے عام تصورات کے برعکس اس خاص اشاعت اور زیرِ نظر مکالمے کے لیے جس قدر تعاون، حوصلہ افزائی اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ لائق ستائش ہے'' یہ آپ نے درست لکھا۔ آپ کے بعض سوالات واقعی اشتعال دلانے والے تھے۔ محترمہ کشور ناہید سے ان کی رہائش گاہوں (کرشن نگر، اقبال ٹاؤن) اور دفاتر پاکستان نیشنل سینٹر، ''ماہ نو'' میں ملاقاتیں رہیں۔

یوسف کامران صاحب میرے دوست تھے۔ ان سے زیادہ ملاقاتیں پاک ٹی ہاؤس میں شام کے وقت ہوئی تھیں۔ ناہید صاحبہ کی کتابوں کی فہرست پڑھ کر حیران ہوا کہ اتنا لکھ چکی ہیں اور میرے جیسے ان کے ادنیٰ مداح کے پاس ان کی ایک بھی کتاب نہیں۔ اخبارات و جرائد میں ان کی تحریریں اور شاعری پڑھ کر گزارا کر لیتا ہوں۔ ''جنگ'' میں ان کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔

یوسف کامران (مرحوم) اردو میں لکھتے تھے مگر مجھے اعزاز حاصل ہے کہ میں نے اپنے پنجابی رسالہ ''سانجھاں'' میں ان کے پنجابی مضامین شائع کیے۔ مئی ۱۹۷۶ء کے ''سانجھاں'' میں یوسف کامران صاحب کا مضمون ''اسیں کہ تائیں نعرے لاندے رہواں گے'' اور جنوری ۱۹۷۷ء میں ان کا مضمون ''پنجابی بولو، پنجابی لکھو، پنجابی پڑھو دا نعرہ'' و دیگر مضامین شائع کیے۔ یوسف کامران صاحب کا انتقال مارچ ۱۹۸۴ء میں ہوا۔ جنگ کی طرف سے میری اور عباس تابش کی کوریج کی ڈیوٹی لگی۔

۲۱/ مارچ ۱۹۸۴ء کو روزنامہ جنگ لاہور میں ''یوسف کامران کا سفرِ آخرت کی جھلکیاں'' شائع ہوئیں۔ جس کو عباس تابش اور میں نے تحریر کیا۔ اس کے علاوہ ''تعزیت نامے'' شائع ہوئے۔ اس میں کشور ناہید صاحبہ کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

میں نے لکھا تھا کہ ''چند برس قبل انہی دنوں میں جاوید شاہین اور زاہد ڈار، یوسف کامران کی کار میں بیٹھ کر شاہ (مادھولال) حسینؒ کے عرس پر گئے۔ وہاں یوسف کامران نے دھمال ڈالی، یہ مارچ ہی کا مہینہ ہے عرس بھی قریب ہے مگر دھمال ڈالنے والا اس دنیا میں نہیں رہا۔ ۲۷ برس کی عمر میں بھی کشور ناہید جی تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ دنیا کی سیاحت بھی کرتی ہیں۔ سماجی اور رفاہی کام بھی۔ میں ۶۵ برس کی عمر میں بھائی پھیرو تک جانے کے لیے دس بار سوچتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کشور ناہید جی ۲۷ سال کی نہیں بلکہ ۷۲ سال کی ہیں غلطی سے الٹ لکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے تاکہ وہ اسی طرح جواں ہمتی سے تخلیقی عمل، رفاہی کام اور دنیا کی سیاحت کرتی رہیں۔ آمین

تنویر ظہور (لاہور)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب و سلام۔

زیرِ نظر شمارے میں عالمی شہرت یافتہ قلمکارہ محترمہ کشور ناہید پر آپ نے شاندار گوشہ شائع کیا ہے۔ ہر چند کے دنیائے ادب میں کشور ناہید کسی تعارف کی محتاج نہیں تاہم اس گوشہ کے طفیل موصوفہ سے متعلق بہت سی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ ان سے براہ راست آپ کا مکالمہ بھی بے حد دلچسپ ہے۔ آپ نے محترمہ سے Devil's Advocate کے انداز میں سوالات کیے ہیں اور انہوں نے آپ کے ہر سوال کا بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں جواب دیا ہے۔ اس انٹرویو کی روشنی میں ان کی فکری بصیرت نیز عورتوں کی زندگی سے وابستہ مسئلہ مسائل سے متعلق ان کے خیالات و نظریات کی تفہیم بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ شمارے کے دیگر مشمولات چہارسو کے شایان شان ہیں۔ سید سعید نقوی، رینو بہل اور مہتاب عالم کے افسانے پسند خاطر ہیں۔ فیروز عالم کی تحریر ''ہوا کے دوش پر'' بھی خوب ہے۔ منظومات کا حصہ ہمیشہ کی طرح دلکش ہے۔ مشکور حسین یاد، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر سیفی سرونجی، رب نواز مائل، جاوید اقبال، خیال آفاقی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور قیصر نجفی وغیرہ کی شعری تخلیقات بالخصوص ذہن پر نقش چھوڑ گئیں۔

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

...... فکرِفیض ......

ڈاکٹر نثار ترابی نے کمال محبت سے فیض احمد فیضؔ کے حضور خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے اُن کے فکروفن پر منتخب مضامین کے زیرِ نظر مجموعہ کی تدوین کی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں کہ ہمعصری دور کے اہم تنقید نگاروں کے مضامین یکجا کر دیے جائیں تا کہ نئی نسل اپنے دور کے اہم شاعر کے فن کے ہر رُخ پر قابلِ قدر خیالات سے مستفید ہو سکے۔

گذشتہ برس فیض صدی کے موقع پر معتدبہ کُتب منظرِ عام پر آئیں لیکن ہر کتاب بالخصوص اگر وہ تدوین کے زُمرہ میں آئے اپنے انتخاب کنندہ کے نقد و نظر کی عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر نثار ترابی اپنے حسنِ انتخاب اور اپنی نکتہ رسی کی داد و تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک باکمال شخصیت پر چیدہ چیدہ مضامین منتخب کر کے فیض شناسی کے اہم تر کام کو بڑی حد تک واضح سمت فراہم کی ہے، تا کہ فکرِ فیضؔ احمد فیض کو بنیادی اہمیت مل سکے۔ ...... ڈاکٹر محمد علی صدیقی

نفیس کاغذ دو سو بہتر صفحات مجلد کا یہ بیش قیمت تحفہ پانچ سو پچاس روپے کے عوض ملٹی میڈیا، 42، لوئر مال، لاہور پر دستیاب ہے۔

...... کویت ترقی کی جانب ......

اگر آپ برادر عرب ملک (کویت) کی سیاحت پر جانے کے آرزومند ہیں تو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ سفر سے پیشتر نامور دانشور ادیب جناب کرشن نندہ کی تازہ تخلیق ''کویت ترقی کی جانب'' کا مطالعہ ضرور کیجیے۔ نندہ صاحب فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں چالیس سال سے زائد کویت میں مقیم رہے۔ اس عرصے میں آپ نے کویتی باشندوں کی سوچ، نفسیات، رہن سہن اور وسعت نگاہ کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور صفحات میں مقید کر لیا۔ ''کویت ترقی کی جانب'' ایک کتاب بھی ہے، ایک رہنما اور گائیڈ بھی ہے اور بہترین ہم سفر بھی۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا چار زبانوں عربی، اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونا اور کویت کی بابت الف سے ی تک معلومات مہیا کرنا ایک طرح کا کارِ خیر ہے جسے نندہ صاحب نے دیانتداری اور وفاشعاری کے ساتھ کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کتاب کے ایک ایک لفظ سے کویت اور اہلِ کویت سے نندہ صاحب کی محبت کی خوشبو آ رہی ہے۔

...... محمد انعام الحق

فور کلر، آرٹ پیپر پر چھپی یہ کتاب تین سو روپے کے عوض اے 2۔302 نرمل چھایا ٹاورس، وی آئی پی روڈ، ذِرک پور (پنجاب)

...... سہ ماہی فنون ......

اردو زبان و ادب کا دائرہ جس تیزی سے وسعت اختیار کر رہا ہے۔ نئے اور تازہ دم اہلِ قلم کی معقول تعداد بھی اُسی رفتار سے سامنے آ رہی ہے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ادبی جرائد اہلِ قلم کے مقابلے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی اور اُن کے لائق فرزند جناب نیّر حیات قاسمی لائق صد مبارک باد ہیں کہ اُنھوں نے اپنے نامور بزرگ جناب احمد ندیم قاسمی کا ''فنون'' کی شکل میں لگایا پودا بشکلِ شجر زندہ و تابندہ رکھا ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کے رشحاتِ قلم اور رنگین تصاویر کے علاوہ حمد، نعت، مضامین، نظم، غزل، افسانے، تراجم، ناول، انشائیہ، طنز و مزاح سے مزین ''فنون'' کا تازہ شمارہ 612 صفحات پر محیط ہے۔ سرِ ورق، طباعت اور پیشکش کے حوالے سے ''فنون'' کا یہ شمارہ ادب کی نہایت اہم اور خاص سوغات ہے جو آپ اور آپ کے احباب کے لیے مطالعے اور حوالے کا مدتوں رہبر و رہنما بن سکتا ہے۔ ...... فاری شا

قیمت: چار صد روپے۔ دستیابی: 251، بلاک F-2، واپڈا ٹاؤن، لاہور۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
کہی اَن کہی
نیلوفر علیم عباسی
تنہائیوں کے درمیاں
شاخِ زریاب
ڈاکٹر تحسین فراقی